قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

اکتوبر 2025 قیمت ₹25

ماہنامہ

اُردو دنیا

نئی دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

سہ روزہ قومی سمینار، پٹنہ کی تصویری جھلکیاں

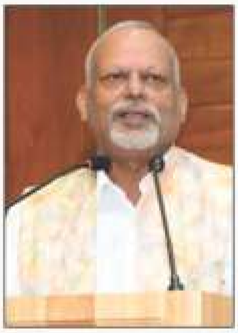

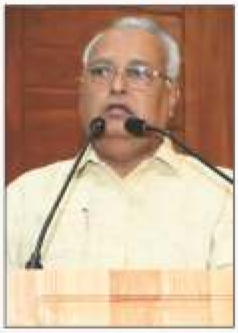

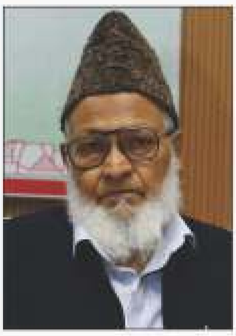

ماہنامہ اردو دنیا

نئی دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:27، شمارہ:10، اکتوبر 2025

مدیر : ڈاکٹر شمس اقبال

مشیر : حقانی القاسمی

معاونین : شاداب شمیم، فیضان الحق، یونس انصاری

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت تعلیم، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:

سالاسار امیجنگ سسٹمس

A-97، سیکٹر 58، نوئیڈا۔ 201301 (یوپی)

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام

ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/25 روپے سالانہ -/240 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025

فون:49539000 شعبۂ ادارت:49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم نئی دہلی۔ 110066

فون: 26109746، فیکس:26108159

ای میل: sales@ncpul.in

شاخ:110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1 پتھرگٹی، حیدرآباد۔ 500002

فون:040-24415194

مشمولات

اداریہ

- ہماری بات 4

خطوط

- ربط و التفات — قارئین کے خطوط 5

رپورٹ

- اردو زبان کا مستقبل: وکست بھارت 2047@ کے تناظر میں — محمد مرجان علی 7

زبان و تعلیم

- گاندھی جی کا تعلیمی وژن: بنیادی تعلیم سے ڈیجیٹل عہد تک — ندیم احمد 15
- نئی تعلیمی پالیسی اور علاقائی زبان — غزالہ شیریں 18

مصنوعی ذہانت اور نسل نو

- مصنوعی ذہانت کے دور میں بچوں کی پرورش — نوشاد حسین 21

اردو اور جدید ٹیکنالوجی

- مصنوعی ذہانت کی افادیت اور اردو زبان و ادب کا فروغ — محمد شمیم اختر 27
- اردو زبان کا ڈیجیٹل چہرہ — محمد آصف رضا 29

ادب زاویے اور جہات

- دور حاضر میں پریم چند مطالعہ کی نئی جہتیں — صغیر افراہیم 32
- شعری بیانیے میں لفظوں کا انتخاب اور دستور غالب — عبدالرحمٰن 35

- جموں و کشمیر میں اردو ڈراما — اشرف لون 39

جہات دارا شکوہ

- فارسی شاعری میں دارا شکوہ کا ادبی و فکری مقام — نوید جعفری دہلوی 43

- دارا شکوہ کی فارسی شاعری — محمد شہباز 47

شخصیات

- سیماب اکبرآبادی کی شعری کائنات — مقیم احمد 49
- یاس یگانہ چنگیزی جدید اردو غزل کے معمار — محمد شہاب الدین 54
- سماجی روایت کا نوحہ گر علی عباس حسینی — گلاب سنگھ 57
- مجروح کا شعری آفاق — محمد دانش 61
- مظفر حنفی کی غزلیہ شاعری — محمد وسیم رضا 63

- ابواللیث جاوید کے افسانوں کے امتیازات — آصف سلیم 65
- تسلیم نیازی: اردو کا قلندر مزاج شاعر — احمد نثار 68

جہان دانش

- رامپور رضا لائبریری کے چند اہم مخطوطات — عبدالقادر 70

یاد رفتگاں

- بیگم انیس قدوائی — محمد سلیم قدوائی 74
- ابن کنول کی غیر افسانوی نثری خدمات — عامر عباس 77

کتابوں کی دنیا

- تعارف و تبصرہ — ادارہ 82

خبرنامہ

- اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 92

ہماری بات

ملکوں کی تعمیر و ترقی میں جو عناصر سرگرم کردار ادا کرتے ہیں ان میں کام کرنے والے ہاتھوں کے ساتھ غور و فکر کرنے والے اذہان اور زبان و ادب کی حصے داری سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ جو ملک بڑا سوچنے والے ذہنوں سے متمول ہوتا ہے اس کی ترقی و خوشحالی کے امکانات بھی زیادہ ہوتے ہیں اور جس ملک کی مجموعی فکری و ذہنی قوت مضمحل اور پژمردہ ہوتی ہے اس کی ترقی کے امکانات بھی اسی قدر کم یا گم ہوتے جاتے ہیں۔ یہ ہماری خوش بختی ہے کہ ہندوستان عالمی منظرنامے پر جن خصوصیات اور قومی صلاحیتوں کی وجہ سے ممتاز سمجھا جاتا ہے، ان میں ہمارے ملک کی مجموعی فکری و ذہنی صلاحیتوں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ قدیم ادوار میں بھی ہندوستانی دانش ساری دنیا کے لیے موجب کشش رہی ہے اور آج بھی ہندوستانی ذہن دنیا بھر میں اپنی انفرادیت کا لوہا منوا رہے ہیں۔ ہمارے ملک نے 2047 تک ترقی کی جس آخری منزل تک پہنچنے کا خواب دیکھا ہے، اس میں بھی یقیناً ہمارے یہ نابغہ اذہان نمایاں کردار ادا کریں گے۔

یہی حال زبان و ادب کا بھی ہے، کہ جس ملک کے زبان و ادب میں تنوع اور تب و تاب ہوتی ہے، وہ عالمی منظرنامے پر اپنا امتیاز قائم کرنے میں کامیاب ہوتی ہے اور اس ملک کی ہمہ جہت ترقی میں بھی اس کی خاص اہمیت ہوتی ہے۔ اس حوالے سے بھی ہندوستان خوش قسمت ہے کہ اس کی ہزارہا سالہ تاریخ لسانی، ادبی و ثقافتی رنگارنگی اور ثروت مندی سے عبارت ہے۔ آج بھی ہندوستان دنیا کا واحد ایسا ملک ہے جہاں عدیم النظیر لسانی تنوع پایا جاتا ہے۔ اس ملک میں 22 تو شیڈولڈ زبانیں ہیں یعنی وہ زبانیں جو سرکاری طور پر تسلیم شدہ ہیں اور جن کے بولنے، پڑھنے، لکھنے اور سمجھنے والے ملک کے کسی نہ کسی حصے میں ضرور پائے جاتے ہیں۔ مگر اعداد و شمار یہ بتاتے ہیں کہ اس ملک میں 120 سے زائد ایسی زبانیں بھی ہیں جن کے بولنے والے دس ہزار یا اس سے زائد ہیں، جبکہ کم و بیش بیس ہزار اس ملک میں مادری زبانیں ہیں۔ ایسا غیر معمولی اور حیرت انگیز لسانی تنوع روئے زمین میں کہیں نہیں پایا جاتا۔ 'وکست بھارت' کے مہتم بالشان وژن کو حقیقت کا روپ دینے میں ان تمام زبانوں، ان کے ثقافتی امتیازات، ان میں پائے جانے والے گراں قدر افکار و تخیلات اور تخلیقات؛ سب کا نہایت مؤثر رول ہوگا۔

اس سیاق میں اردو زبان و ادب اور اردو دانشور، تخلیق کار اور شاعر و ادیب کی قومی اہمیت اور اسی اعتبار سے ان کی ذمے داری فزوں تر ہو جاتی ہے، کیونکہ اس زبان کے ادبا و دانشوران نے ہر دور میں قومی ضروریات و مطالبات کو اپنی فکر و تحریر کا حصہ بنانے اور اہم موقعوں پر تقاضائے قوم و ملک کی تکمیل میں غیر معمولی سرگرمی اور جوش و خروش کا مظاہرہ کیا ہے۔ ترقی یافتہ ہندوستان کا منصوبہ بھی ایک ایسا منصوبہ ہے جس کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں ہندوستان بھر کی دوسری زبانوں اور ان کے دانشوروں کے ساتھ اردو زبان اور اردو دانشوران کا کردار خاص اہمیت کا حامل ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان شروع سے نہ صرف اردو زبان کو ملک کے گوشے گوشے میں پہنچانے اور اس کی ترویج کے ہر ممکن ذرائع اختیار کرتی رہی ہے، بلکہ اس زبان کو قومی منصوبوں اور امنگوں سے ہم آہنگ کرنے میں بھی کونسل کا کردار اہم رہا ہے۔ اسی ضمن میں کونسل ترقی یافتہ ہندوستان کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے اردو کے متوقع کردار پر بھرپور، صحت مند اور ہمہ گیر ڈسکورس کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہے، جس کا آغاز ہم نے فروری 2025 میں عالمی اردو کانفرنس سے کیا تھا، اس کے بعد بھی اس حوالے سے ہماری سرگرمیاں جاری رہیں اور 22 تا 24 اگست 2025 کو پٹنہ میں ہم نے سہ روزہ قومی سمینار کا اہتمام کیا، جس کا مرکزی عنوان تھا 'اردو زبان کا مستقبل وکست بھارت 2047@ کے تناظر میں'۔ یہ سمینار اس اعتبار سے غیر معمولی اہمیت کا حامل تھا کہ اس کا افتتاح بہار کے گورنر عزت مآب عارف محمد خان نے کیا اور انھوں نے اپنے خطاب میں اردو زبان کی فطری شیرینی و جمال انگیزی پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کے مستقبل کے تئیں نہایت مثبت خیالات کا اظہار کیا۔ افتتاحی اجلاس کے علاوہ دو دنوں تک چلنے والے چھ تکنیکی سیشنز میں درجنوں موضوعات پر بہار اور بیرونِ بہار سے اس سمینار میں شریک دانشوران نے اپنے مقالات اور تقریروں میں جو باتیں کیں، ان میں ترقی یافتہ ہندوستان میں اردو کے مستقبل کے تئیں فکرمندی بھی تھی اور بہت سے ایسے نکات بھی سامنے آئے جن کی روشنی میں ہماری زبان بھی وکست بھارت کی تعمیر میں اپنا بھرپور کردار ادا کرسکتی ہے۔

شمس اقبال

ربط و التفات

ماهنامه 'اردو دنیا' میں 'ربط والتفات' کے تحت قارئین کے خطوط شائع کرنے کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ محض ستائشی اور تحسینی کلمات لکھے جائیں بلکہ رسالے کے مشمولات کے حوالے سے نئے مباحث پر گفتگو کو آگے بڑھانا ہوتا ہے۔ ماضی میں مکتوبات بہت سے مضامین سے بھی زیادہ بیش قیمت ہوتے تھے کہ ان میں مشمولہ مضامین کے تعلق سے نئے نکات و مباحث کی نشاندھی کی جاتی تھی۔

قارئین سے گزارش ہے کہ ماہنامہ 'اردودنیا' کے مشمولات کے حوالے سے بحث انگیز خطوط ارسال کریں اور ان نئے موضوعات، عنوانات، شخصیات اور علاقوں کی نشاندھی کریں جنھیں نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ آپ کے خطوط ہمارے لیے بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، ان سے ہمیں رسالے کو خوب سے خوب تر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ (ادارہ)

☜ ماہنامہ 'اردودنیا' ستمبر 2025 کا شمارہ نظر سے گزرا جو خوبصورت سرورق سے مزین ہے۔ باہری اور اندرونی صفحات پر چسپاں رنگین اور جاذب نظر تصاویر اور ان کی ترتیب نہ صرف رسالے کے حسن کو دوبالا کردیتی ہے بلکہ تصویری زبان کے ذریعے ہم قومی کونسل کی دیگر سرگرمیوں سے بھی واقف ہوجاتے ہیں۔ علمی، ادبی اور تنقیدی لحاظ سے اپنی شناخت قائم کرنے والے اس بین الاقوامی اور موقر رسالے میں ادب زاویے اور جہات، تاریخ، لسانیات اور صحافت جیسے اہم گوشے قاری کو اپنی طرف کھینچتے ہیں تو تبصروں کے ذریعے نئی شائع شدہ کتابوں سے روبرو ہوتے ہیں۔ شمارے کا اداریہ اور رپورٹ کی شکل میں ابتدائی چند صفحات چنار بک فیسٹیول پر مشتمل ہیں۔ اداریہ اور رپورٹ پڑھ کر معلوم ہوا کہ چنار بک فیسٹیول قومی اردو کونسل اور نیشنل بک ٹرسٹ کے اشتراک سے منعقد ہوا جس میں مختلف موضوعات پر سیمینار، مذاکرے، مشاعرے اور کتابوں کی رونمائی ہوئی۔ تین روزہ پروگرام میں تربیتی ورکشاپ بھی عمل میں آیا۔ 2025 کا چنار بک فیسٹیول کامیاب اور یادگار رہا جس میں ملک کے مختلف حصوں سے ادبا، شعرا، محققین، ناقدین، مترجمین اور اسکالرز جمع ہوئے۔ شمارے میں ہر سیشن کے بارے میں تفصیلی رپورٹ مع تصاویر

موجود ہے جس سے اس یادگار فیسٹیول کی تمام جھلکیاں آنکھوں کے سامنے آگئیں۔

عارفہ بشریٰ نے اپنے مضمون 'وکست بھارت وژن اور مشن' میں بنیادی اور اہم نکات پیش کیے ہیں مثلاً غریبی کا خاتمہ، کسانوں کی فلاح و بہبود، خواتین کی خودمختاری، تعلیمی نظام اور صحت عامہ کو کس طرح بہتر بنایا جاسکتا ہے؟ یہ سب اس مضمون سے پتہ چل سکتا ہے۔ معین الدین نے 'زبان کی اقسام' نامی مضمون میں بولی اور زبان کے فرق کو واضح کرتے ہوئے مختلف زبان کی اقسام جیسے اشاروں کی زبان، علامتوں کی زبان، آوازوں کی زبان اور مادری زبان پر روشنی ڈالتے ہوئے مادری زبان میں تعلیم دیے جانے پر خاص توجہ دی ہے۔ اسی گوشے میں 'زبان اور خواندگی کی تدریس سے متعلق قومی درسیات کا خاکہ برائے بنیادی سطح 2022 کے اہم نکات' جیسے عنوان کے تحت آفاق ندیم خان نے عصر حاضر میں زبان اور خواندگی کی تدریس کی ترغیب دی ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے کئی اہم باتوں کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے۔ وہ کہتے ہیں: ''اردو میڈیم اسکولوں اور زبان کے اساتذہ کے لیے یہ موقع ہے کہ وہ بچوں کی زبان کے ابتدائی تجربات کو قدر کی نگاہ سے دیکھیں اور سمعی، بصری اور تخلیقی سرگرمیوں کو تدریسی لائحہ عمل کا جزو لازم بنائیں۔'' محمد ذاکر حسین کا مضمون 'غالب اور فریاد کی لے' معلوماتی ہے۔ ساجدہ ذکی فہمی نے اپنے مضمون میں مشترکہ تہذیبی وثقافتی رسم ورواج سے روبرو کرایا ہے کہ کس طرح لکھنؤ میں مختلف میلے ٹھیلے اور تیج تہوار ہوا کرتے تھے۔ اودھ میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی فضا قائم تھی، سب مل جل کر رہتے تھے اور تمام مذاہب کے لوگ ایک دوسرے کی قدر کیا کرتے تھے۔ اسی طرح صبا نسیم کا مضمون 'محمد انصار اللہ کی ادبی خدمات' اور محمد زبیر کا 'پروفیسر ظہیر انصاری کا ادبی سفر' بھی معلوماتی اور فکر انگیز ہیں۔ رسالے کے تقریباً سبھی مضامین کسی نہ کسی سطح پر ہمیں نہ صرف متاثر کرتے ہیں بلکہ ہماری فکر ونظر میں بھی اضافہ کرتے ہیں۔

☜ **خیر النسا**، سورج پور، گریٹر نوائیڈا، اترپردیش

ماہنامہ 'اردو دنیا' ستمبر 2025 کا شمارہ وقت پر موصول ہوا۔ برسوں سے یہ رسالہ نہ صرف ادبی ذوق رکھنے والوں کے لیے ایک علمی سرمایہ رہا ہے بلکہ نئی نسل کے قاری کو اردو زبان و ادب کی جمالیات اور معاصر فکر سے جوڑنے میں بھی اس کا کردار ناقابلِ فراموش ہے۔ اس رسالے کی انفرادیت اس کے مضامین کا تنوع اور معیار ہے۔ یہاں قاری کو ایک ہی شمارے میں تحقیق، تنقید، تاریخ، تہذیب اور صحافت کی جھلک ملتی ہے۔

ستمبر کے شمارے کا مطالعہ کرتے ہوئے سب سے پہلے میری نظر چنار بک فیسٹیول پر شائع ہونے والی رپورٹ پر پڑی۔ یہ رپورٹ بلاشبہ شمارے کی جان ثابت ہوئی۔ فیسٹیول کی رونق، کتابوں کی اہمیت، ادیبوں اور قارئین کی شرکت اور اس ادبی میلے کی روح کو اس طرح کاغذ پر اتارا گیا ہے کہ قاری خود کو اس فضا میں محسوس کرتا ہے۔ کشمیری ادب و ثقافت کے تناظر میں یہ فیسٹیول غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے اور اس رپورٹ میں اس کی معنویت کو خوب اجاگر کیا گیا ہے۔ زبان و بیان کی روانی اور مشاہدے کی باریک بینی نے اس تحریر کو زندہ و جاوید بنا دیا ہے۔ ایک لمحے کو ایسا لگتا تھا کہ ہم بھی ان محفلوں میں موجود ہیں، کتابوں کے درمیان بیٹھے ہیں اور اہلِ قلم کی گفتگو سن رہے ہیں۔ اس طرح کی رپورٹیں نہ صرف ادبی ذوق کو مہمیز دیتی ہیں بلکہ قاری کو نئی تحریک بھی عطا کرتی ہیں۔

اب آتے ہیں دیگر مضامین کی طرف۔ امراؤ جان ادا اور مشترکہ تہذیبی عناصر پر شائع ساجد ذکی فہمی کا مضمون دلچسپ ہے۔ 'امراؤ جان ادا' صرف ایک ناول نہیں بلکہ ہماری تہذیبی تاریخ کا عکاس بھی ہے۔ مضمون نگار نے اس پر اچھی گفتگو کی ہے لیکن حوالہ جات اور علمی گہرائی کی کمی محسوس ہوئی۔ اگر تحقیقی اسلوب اور تنقیدی دلائل سے اس پر بحث کی جاتی تو یہ مضمون اردو ادب میں ایک اہم اضافہ بن سکتا تھا۔ صبا نسیم کا مضمون محمد انصار اللہ کی ادبی خدمات عقیدت و محبت سے لبریز تھا۔ اگر ان کی تنقیدی بصیرت اور تحقیقی پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی جاتی تو مضمون کا وقار بڑھ جاتا اور قاری کو ان کی شخصیت و خدمات کا زیادہ پتا چلتا۔ عبدالرزاق کا مضمون تصویری صحافت: حقیقت کی خاموش زبان پسند آیا۔ آج کے دور میں تصویری صحافت کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ مضمون نگار نے اس پہلو کو عمدگی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ سلیم انصاری کا مضمون راشد طراز کی شعری کائنات ایک سنجیدہ اور بامعنی تحریر ہے۔ اس میں شاعر کی فکری جہات، اسلوب اور جمالیات کو عمدگی سے اجاگر کیا گیا ہے۔ یہ مضمون راشد طراز کی شاعری کا تعارف بھی ہے اور ان کے تخلیقی شعور کا تجزیہ بھی۔ تاہم کچھ مزید تقابلی حوالہ جات اور دیگر شعرا کے ساتھ موازنہ شامل کیا جاتا تو مضمون زیادہ وقیع بن سکتا تھا۔ محمد ذاکر حسین کا مضمون غالب اور فریاد کی لے پڑھ کر ایک نیا ذوق پیدا ہوا۔ غالب کی شاعری کے اس پہلو پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ مضمون نگار نے نہایت نفاست سے غالب کی فریادی لے کو واضح کیا اور اس کے فکری پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ حامد علی خان کا مضمون 'آہ انیس رفیع' پڑھتے ہوئے دل کو گہری اداسی نے گھیر لیا۔ انیس رفیع صاحب کی شخصیت اور ان کی یادوں کو نہایت محبت اور سچائی سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ مضمون تاثراتی ضرور ہے مگر اس کی زبان اور سادگی نے دل کو چھو لیا۔ ظہیر انور کی تعزیتی تحریر بھی بہت متاثر کن اور وقیع ہے۔ آخر میں اسعد فیصل فاروقی کا مضمون ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ: سفر برسوں کا نہایت معلوماتی ہے۔ یہ مضمون پڑھ کر قاری کو اندازہ ہوتا ہے کہ اردو کتابوں کی اشاعت میں یہ ادارہ کس قدر اہم کردار ادا کر رہا ہے۔

مجموعی طور پر ستمبر کا شمارہ نہایت متنوع اور دلچسپ رہا۔ تاہم چند مضامین میں علمی گہرائی اور تنقیدی معیار کو مزید بلند کرنے کی ضرورت ہے۔ امید ہے کہ آئندہ بھی ماہنامہ 'اردو دنیا' اپنے اعلیٰ معیار اور وقار کو برقرار رکھے گا اور قارئین کو اسی طرح معیاری تحریریں فراہم کرتا رہے گا۔

یمن شاھدی: ڈاسنہ، غازی آباد، یوپی

ماہنامہ 'اردو دنیا' جولائی کا شمارہ موصول ہوا، سرورق پر کتابوں کو جس عمدہ طریقے سے سجایا گیا ہے، انھیں دیکھ کر قلبی سکون محسوس ہوتا ہے۔ 'ربط و التفات' کا کالم شمارے کی قدر و قیمت متعین کرتا ہے۔ اس شمارے میں خلیل الرحمٰن سیفی پریمی نے 'طبع انسانی اور آغاز تعلیم' میں یہ بتایا ہے کہ تعلیم و علم کی تشنگی ہر ایک شخص میں ہونی چاہیے۔ تعلیم اپنے وسیع معنوں میں ایک طریق عمل ہے جو پیدائش سے شروع ہوتا ہے اور موت پر ختم ہوتا ہے۔ سید محمد کہف الوریٰ کا مضمون 'ہندوستانی علمی ورثہ اور جدید تعلیمی نظام' اور احمد حسین کا 'دورِ جدید کے آئینہ میں اساتذہ کا کردار' اچھے مضامین ہیں اور اپنے موضوع کا بھرپور احاطہ کرتے ہیں۔ پروفیسر ارشاد نیازی نے 'تقابلی ادب کے اساسی تصورات' پر عمدہ مضمون تحریر کیا ہے۔ اس نوع کے مضامین کے مطالعے سے آفاقی، عالمی، ادبی اور فنی رشتے استوار ہوتے ہیں اور ہندوستانی فنکاروں و فن پاروں کی عالمی قدر کا تعین ہوتا ہے۔ ہومر، ورجل، غالب، انیس، والمیکی، ویاس کالیداس، فردوسی، شیکسپیئر، کبیر وغیرہ کو عالمی سطح پر لوگ جانتے ہیں، ٹیگور کی 'گیتانجلی' جو بنگالی زبان میں ہے، کے انگریزی ترجمے پر نوبل پرائز دیا گیا۔ تقابلی مطالعہ سے ملکی ادب کو فائدہ ہوتا ہے۔ اس نئے موضوع کو ادب میں لازماً استعمال کرنا چاہیے اور جامعات میں ایک پرچہ بھی ایم اے میں رکھنا چاہیے۔ ریاض توحیدی نے 'منشی پریم چند کی افسانہ نگاری: فکر و فن کا تخلیقی آئینہ' میں ان کے چند افسانوں کا بہت عمدہ طریقے سے تجزیہ پیش کیا ہے۔ جہانِ دانش کے تحت 'رام پور رضا لائبریری صدیوں پر محیط علمی ورثہ' نشاط جمیل کا عمدہ مضمون ہے، جس سے اس لائبریری اور اس کی خدمات کے بارے میں کئی حقائق سے آگہی ہوتی ہے۔ شاداب عالم کا 'اڑیسہ میں اردو کا ماضی حال اور مستقبل' اپنے موضوع کا بھرپور احاطہ کرتا ہے۔ عبدالرب صاحب کا مضمون 'تاریخ کی اصناف بندی' بہت جامع اور عمدہ مضمون ہے اس کا مطالعہ ذہن و دل کے دریچوں کو نہ صرف واشگاف کرتا ہے بلکہ حظ و انبساط میں اضافہ بھی کرتا ہے۔ 'شخصیات' کے زمرے میں ابوطالب انصاری کا 'حکیم اجمل خان: نگینہ ہند'، محمد اسداللہ کا 'ایک نوائے حرفِ خموش: ظفر کلیم' اور مجیب احمد خان کا 'نظیر اکبرآبادی کی شاعری' جیسے مضامین میں مذکورہ شخصیات کی ادبی، علمی اور سماجی خدمات کا بھرپور احاطہ کیا گیا ہے۔ سلسلۂ صحافت کے تحت نوید احمد خاں کا مضمون 'سنبھل کے اردو اخبارات اور اردو ادب' بھی اچھا مضمون ہے۔ ان کے علاوہ 'بین الاقوامی معاشیات کا مطالعہ'، 'تعلیم میں سائنس'، اردو غزل پر تصوف کے اثرات' بہت اچھے مضامین ہیں، ان کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔ ف س اعجاز صاحب کا انٹرویو بھی پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ 'کتابوں کی دنیا' ایک اچھا کالم ہے۔ اس کے ذریعے نئی نئی کتابوں اور ان کے اندر کے مواد سے واقفیت ہو جاتی ہے۔ 'خبرنامہ' پورے ہندوستان کی ادبی سرگرمیوں کا عمدہ حوالہ ہے۔

ڈاکٹر محمد ناظم علی: سابق پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج، موڑتاڑ و اکیڈمک سینٹ ممبر، تلنگانہ یونیورسٹی، حیدرآباد، تلنگانہ، موبائل:9603018825

محمد مرجان علی

اردو زبان کا مستقبل وِکست بھارت@2047 کے تناظر میں

عظیم آباد میں قومی اردو کونسل کا سہ روزہ قومی سمینار

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے 22 سے 24 اگست 2025 کے دوران باپو ٹاور، گردنی باغ، پٹنہ میں بعنوان ’اردو زبان کا مستقبل وکست بھارت 2047@ کے تناظر میں‘ ایک قومی سمینار کا انعقاد کیا، جو نہ صرف اپنے موضوع کے اعتبار سے دلچسپ اور منفرد تھا، بلکہ اس اعتبار سے بھی یہ سمینار خاصا اہمیت کا حامل رہا کہ اس میں بہار اور بیرونِ بہار کے سینئر ادبا و اہلِ دانش سمیت نوجوان اسکالرز بھی مدعو تھے ، جنھوں نے موضوع کے تمام پہلوؤں پر مقالات پیش کیے اور نہایت صحت مند گفتگوئیں کیں۔ یہ سمینار شرکا اور سامعین کی تعداد کے لحاظ سے بھی خاصا کامیاب رہا، کہ تینوں دن پٹنہ اور مضافات کے اربابِ علم و ادب کثیر تعداد میں اس سمینار میں شریک ہوتے رہے اور صبح دس بجے سے رات نو بجے تک یہ تعداد یوں ہی برقرار رہی۔ اس سمینار کے تینوں دن تکنیکی سیشنز کے بعد محفلِ افسانہ خوانی، مشاعرہ اور آخری دن غزل سرائی کی محفل کا اہتمام بھی کونسل کے ذریعے ایک خوش آیند تجربہ تھا، جس سے اہلِ ذوق خوب لطف اندوز ہوئے۔

قومی اردو کونسل نے ایک طویل مدت کے بعد صوبۂ بہار کے مرکز عظیم آباد میں اپنا سہ روزہ قومی سیمینار بہ عنوان ’اردو زبان کا مستقبل: وکست بھارت 2047@ کے تناظر میں‘ 22 تا 24 اگست 2025 کو منعقد کیا۔ یاد آتا ہے کہ اس سے پہلے 2017 میں بہار اردو اکادمی کے ساتھ مل کر اردو فکشن صدی سمینار کا انعقاد اس زمانے میں ہوا تھا جب پروفیسر ارتضیٰ کریم قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر تھے۔ اردو کی ادبی اور علمی سرگرمیوں کے اعتبار سے اہلِ بہار کا یہ حق تھا کہ ایسے بڑے پروگرام یہاں قومی اردو کونسل کی جانب سے منعقد کیے جائیں۔ قومی اردو کونسل کے موجودہ ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال کا تعلق بھی اسی صوبے سے ہے، اس لیے شاید یہ آسانی سے ممکن ہو سکا۔ سمینار میں خاص طور سے یہ کوشش کی گئی تھی کہ بہار کے تمام اضلاع میں موجود اہم لکھنے والوں کو جمع کیا جائے۔ اس کے علاوہ بہار سے باہر رہنے والے بہار کے اسکالرس کو بھی ایک خاص تعداد میں اس سمینار میں مدعو کیا گیا۔

قومی اردو کونسل کے کارپردازوں کو چھوڑ کر بہار سے باہر کے افراد میں افتتاحی اجلاس کے مہمانِ خصوصی عزت مآب جناب عارف محمد خاں، مہمانِ ذی وقار معروف افسانہ نگار سید محمد اشرف، مہمانِ اعزازی پروفیسر فیضان مصطفیٰ، وائس چانسلر، چانکیہ نیشنل لا یونیورسٹی اور پہلے اجلاس کی مجلسِ صدارت کے رکن جناب فیروز بخت احمد کا شمار کیا جا سکتا ہے۔ سمینار میں قومی اور بین الاقوامی اہمیت کے درجنوں مصنفین موجود تھے جس کی وجہ سے سمینار کا ہر اجلاس بارونق رہا۔

حکومتِ ہند کے سب سے بڑے اردو ادارے کی جانب سے یہ پروگرام منعقد ہوا تھا اور یہ اچھا کیا گیا کہ اس کا افتتاح عزت مآب گورنر بہار، جناب عارف محمد خاں کے ہاتھوں ہوا۔ یہ بات اس لیے بھی نہایت موزوں تھی کہ جب ہمارے پاس اردو مادری زبان کا علَم بردار گورنر موجود ہو تو اسے ایسے پروگرام کے مرکز میں رکھنا بہت معقول تھا۔ عارف محمد خاں گلستانِ سرسید کے فرزندِ ارجمند رہے ہیں، اس لیے انھوں نے بہت نفیس زبان میں ایک علمی تناظر کے ساتھ اپنی گفتگو کی۔ گورنر صاحب نے اپنی تقریر میں اردو کی تاریخ، اردو کے موجودہ حالات اور مستقبل کے چیلنجز کو سامنے رکھتے ہوئے بہت سارے موضوعات کے اندھیروں کو دور کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے اردو کے مستقبل کے تئیں یکسر ناامیدی اور مایوسی کو جھٹکتے ہوئے یہ بتایا کہ یہ زبان کسی ایک طبقے یا کسی ایک حکومت کی مہربانی سے زندہ نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو کی اگرچہ ایک ٹھوس اور مستحکم تاریخ رہی ہے مگر اس کا سب سے روشن پہلو یہ ہے کہ نئی نسل اس زبان کو اپنے دلوں میں اتار رہی ہے اور انھوں نے اسے اپنی سانسوں اور دھڑکنوں میں پیوست کر رکھا ہے۔ یہ زبان دوسروں کے لیے حد درجہ باعثِ کشش ہے، اس لیے اسے آسانی سے مٹایا نہیں جا سکتا۔ انھوں نے یہ بات بھی کہی کہ اردو زبان کثیر ثقافتی ماحول کی ترجمان ہے اور بدلتے ہوئے وقت کو انگیز کرنے کی اس میں بے پناہ صلاحیت ہے، اس لیے اس زبان کا مستقبل کبھی تاریک نہیں ہوگا۔ اردو کی عالمی حیثیت کو بھی انھوں نے واضح کرتے ہوئے کہا کہ اس زبان کے علمی سرمایے میں وہ کشش ہے کہ پوری دنیا اس زبان کی طرف دیکھتی رہتی ہے۔

افتتاحی اجلاس میں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے پورے سمینار کے علمی و ادبی تناظر کو واضح کیا۔ انھوں نے سمینار کی غرض و غایت بتاتے ہوئے یہ کہا کہ ہمیں ایک مستقبل پسندانہ نقطۂ نظر کو اپنانا ہوگا۔ ترقی یافتہ ہندستان کی بابت اپنی توقعات پیش کرتے ہوئے

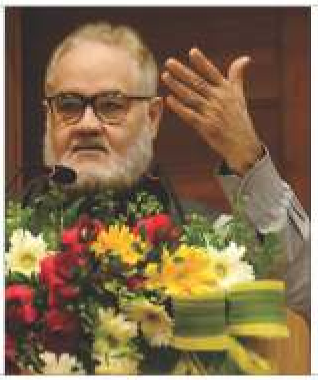

انھوں نے بتایا کہ اردو ہی نہیں تمام ہندستانی زبانوں کوملک کی ترقی میں اپنا رول ادا کرنا ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ حکومتِ ہند نے وِکست بھارت 2047 کا جو خواب دیکھا ہے، اس میں لسانی اداروں اور ادبا وشعرا کا بھی اہم رول ہوگا۔ ملک بہت ساری چھوٹی چھوٹی چیزوں سے اپنی تعمیر وتشکیل کے خاکے کو مکمل کرتا ہے۔ انھوں نے ہندستان کے فکری منظرنامے پر اردو زبان کی کلیدی اور سرگرم شراکت کی توقعات کے ساتھ اپنی بات مکمل کی اور یہ کہا کہ علوم وفنون اور شعر وادب کے آنے والے منظرنامے کے تئیں اگر ہم سنجیدہ ہوگئے تو ملک اور اپنی زبان دونوں کی ترقی لازمی طور پر ہوگی۔

ڈاکٹر شمس اقبال کی مختصر تقریر اس اعتبار سے بے حد کارآمد رہی کہ انھوں نے ہندستان کی دیگر اہم زبانوں کے شانہ بہ شانہ اردو کے متعلقات پر غور کیا اور اس طرح انھوں نے ایک شراکت پسندانہ نقطۂ نظر سے اپنی زبان کی تاریخ اور اس کے مستقبل کو دیکھنے کی کوشش کی۔ انھوں نے اردو کی روایت اور تاریخ کی تعریف کرتے ہوئے نئے اطوار کی طرف ایک ترغیب مندانہ قدم اٹھانے کی وکالت بھی کی۔

جشنِ بہار ٹرسٹ کی بانی محترمہ کامنا پرساد نے مہمانِ اعزازی کی حیثیت سے نہایت نفیس زبان میں تقریر کرتے ہوئے پر اعتماد لہجے میں کہا کہ اردو ترقی یافتہ مستقبل کی طرف تیز قدموں سے آگے بڑھ چکی ہے۔ انھوں نے اس زبان کے مزاج کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ یہ نئے ذہن کی نمائندہ ہے اور ہمیشہ اس زبان کے دانشوروں نے مستقبل بینی سے کام لیا ہے۔ انھوں نے اردو شاعری کے پیغام اور ہر طبقے میں اس کی مقبولیت کو بہ طور مثال پیش کرتے ہوئے کہا کہ نئے ذہنوں کے سہارے یہ زبان مستقبل کا سفر طے کر رہی ہے۔ تہذیبی و ثقافتی ہم آہنگی کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے اردو زبان کو ہندستان کی نمائندہ زبان قرار دیا اور اس بات کا یقین دلایا کہ یہ زبان تاریخ کے اعتبار کے ساتھ مستقبل کی توقعات پر بھی کھری اترے گی۔

دوسرے مہمانِ اعزازی پروفیسر فیضان مصطفیٰ نے اپنی آئینی معلومات کی روشنی میں چند قابلِ غور باتیں پیش کیں۔ زبانوں کے تحفظ اور بقا کے مسائل کو آئین میں موجود حقوق کے آئینے میں واضح کرتے ہوئے انھوں نے چند خطرات کی طرف بھی اشارے کیے۔ کلاسیکی زبانوں کو نئے عہد میں جو مشکلات سامنے آ رہی ہیں، ان سے آگاہ کرتے ہوئے انھوں نے آئینِ ہند کے آرٹیکل 29 کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ اہلِ اردو کو اپنی زبان کے تحفظ اور ترقی کے لیے جو حقوق

حاصل ہیں، اس دائرے میں ابھی بہت کچھ کرنا ممکن ہے۔ انھوں نے کھلے لفظوں میں یہ بات کہی کہ ہندستان کو اگر ترقی یافتہ بننا ہے اور نئی دنیا میں اپنے لیے مزید امکانات پر غور کرنا ہے تو دیگر زبانوں کے ساتھ اردو کو بھی بہ ہر طور اس کاروانِ ترقی کے حصے دار کے طور پر رہنا ہوگا۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ ترقی یافتہ ہندستان کے دائرے میں ایک بھی زبان کو مرنے نہیں دیا جائے گا۔ جو زبانیں کسمپرسی کے عالم میں ہیں، انھیں بھی ترقی یافتہ ملک میں زندگیِ نو عطا کی جائے گی۔

سمینار کے افتتاحی اجلاس کے مہمانِ ذی وقار ممتاز افسانہ نگار اور ناول نگار، انڈین ریوینو سروس کے سابق افسر جناب سید محمد اشرف نے اپنی تقریر میں یہ امید ظاہر کی کہ آنے والے پچیس برسوں میں ہماری زبان زیادہ بامعنی کردار ادا کرے گی۔ انھوں نے کہا کہ قومی ترقی سے معاشی اور سماجی بہتری آتی ہے اور خوش حالی پیدا ہوتی ہے، اس لیے آنے والے وقت میں اردو آبادی زیادہ مستحکم طریقے سے اپنے مسائل کو حل کرنے کے لیے آگے آئے گی۔ انھوں نے تعلیمی امور میں زیادہ سنجیدہ ہو کر اہلِ اردو کو سرگرم ہونے کا مشورہ دیا۔ اس اجلاس کی کامیاب نظامت مشہور اینکر ڈاکٹر شگفتہ یاسمین نے کی۔

سمینار کے دوسرے روز مورخہ 23 اگست 2025 کو پروفیسر غضنفر اور جناب فیروز بخت احمد کی صدارت میں سمینار کا پہلا اجلاس منعقد ہوا جس کا عنوان تھا 'بچوں کے خوابوں کا ہندستان: قومی تعلیمی پالیسی 2020 کے تناظر میں'۔ سمینار میں ڈاکٹر ظفر کمالی، ڈاکٹر عطا عابدی اور جناب شکیل کاکوی نے اپنے تنقیدی و تحقیقی مقالات پیش کیے۔ ساہتیہ اکادمی انعام یافتہ ادیب ڈاکٹر ظفر کمالی نے 'ادبِ اطفال میں تعلیمی موضوعات و مسائل' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا جس میں انھوں نے ان امکانی موضوعات کی طرف اشارے کیے جن کی شمولیت سے اردو زبان میں ادبِ اطفال کا سرمایہ وقیع ہو سکتا ہے۔ انھوں نے اپنی گفتگو کو مستقبل پسندانہ زاویے سے لیس رکھا۔ ڈاکٹر عطا عابدی نے 'ادبِ اطفال میں حب الوطنی' عنوان سے اپنے مقالے میں بہار کے حوالے سے ادبِ اطفال کی تاریخ کا جائزہ لیا اور بہت سارے گم شدہ امور پر روشنی ڈالی۔ جناب شکیل کاکوی نے 'مادری زبان میں بچوں کی تعلیم کی اہمیت' عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا اور اپنے تعلیمی و تدریسی تجربات کی روشنی میں قومی تعلیمی پالیسی کا جائزہ لیتے ہوئے بچوں سے متعلق تحریروں کی سمت متعین کرنے کی کوشش کی۔ اس سمینار میں ڈاکٹر احتشام الحق اور ڈاکٹر منصور خوشتر نے شرکائے بحث کے طور پر اپنے خیالات کا اظہار کیا اور مقالہ خواں حضرات کے نقطۂ نظر کا جائزہ لیا۔ مجلسِ صدارت کی طرف سے ممتاز ناول نگار پروفیسر غضنفر نے تمام مقالہ جات کا فرداً فرداً جائزہ لیا۔ دوسرے صدر جناب فیروز بخت احمد نے بھی اپنے تدریسی تجربات کی روشنی میں قومی تعلیمی پالیسی 2020 کا تذکرہ کرتے ہوئے تمام مقالوں کی ستائش کی۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر شاداب شمیم نے کی۔

سمینار کے دوسرے اجلاس کا عنوان 'اردو زبان اور جدید انفارمیشن ٹیکنالوجی' تھا۔ مجلسِ صدارت میں ڈاکٹر قاسم خورشید، پروفیسر جہانگیر وارثی اور جناب ارشد فیروز شامل تھے۔ ڈاکٹر عبد الحی نے 'مصنوعی

ذہانت اور معاصر ہندستانی میڈیا' کے عنوان سے اپنے مقالے میں جدید اطلاعات سے اردو عوام کو باخبر کیا۔ ڈاکٹر مظہر حسنین نے 'مصنوعی ذہانت اور ترجمہ: مسائل وامکانات' عنوان سے اپنے مقالے میں متعدد مثالوں کے ذریعے جدید ٹیکنالوجی کے استعمال اور اس کے خطرات کا تفصیل سے جائزہ لیا۔ دونوں مقالوں پر جناب اشرف بستوی، جناب قمر اعظم صدیقی اور جناب عارف اقبال نے اپنے مختصر تاثرات پیش کیے اور مقالہ نگاروں نے جن باتوں کے سلسلے میں خبردار کیا تھا، ان امور پر اپنی واضح رائے پیش کی۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر نعمان قیصر نے کی۔ مجلسِ صدارت کی طرف سے ڈاکٹر قاسم خورشید نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے یہ واضح کیا کہ جدید ٹیکنالوجی سے ہم آہنگ ہوئے بغیر ہماری زبان کی ترقی کے راستے مسدود ہو جائیں گے۔ مجلسِ صدارت کے رکن پروفیسر جہانگیر وارثی نے واضح کیا کہ جدید انفارمیشن ٹیکنالوجی کے جو سماجی اثرات ہیں، ان پر سنجیدگی سے غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے۔ مجلس کے تیسرے صدر جناب ارشد فیروز نے اردو معاشرے کے مسائل کا جائزہ لیتے ہوئے بتایا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنے تمام کتب خانوں کو ڈیجیٹلائز کر لیں تاکہ جو شخص بھی جہاں سے استفادہ کرنا چاہتا ہے، وہیں سے وہ ہمارے سرمائے سے فائدہ اٹھا سکے۔

23 اگست کو سہ پہر میں پروفیسر امتیاز احمد اور پروفیسر اخلاق آہن کی صدارت میں اس سمینار کا تیسرا اجلاس منعقد ہوا جس کا عنوان 'ہندستانی نالج سسٹم اور قومی وراثت: اردو تراجم کے آئینے میں' تھا۔ اس اجلاس میں تین مقالے پیش کیے گئے۔ ڈاکٹر درخشاں زریں (عالیہ یونیورسٹی، کولکاتا) نے 'فورٹ ولیم کالج اور اردو تراجم' عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا۔ شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی کے صدر ڈاکٹر سورج دیو سنگھ کے مقالے کا عنوان تھا 'اردو میں ہندی اور دیگر علاقائی زبانوں کے ترجمے'۔ خدا بخش لائبریری سے متعلق ممتاز محقق ڈاکٹر محمد ذاکر حسین نے 'اردو میں ہندستان کے مقدس صحائف کے تراجم' عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا۔ تینوں مقالوں پر ڈاکٹر محمد منہاج الدین اور ڈاکٹر شاہد وصی نے اپنے تاثرات پیش کیے۔ دونوں صدور نے موضوع کی اہمیت اور سنجیدگی کو واضح کرتے ہوئے اردو زبان میں ان معاملات کو مزید گہرائی کے ساتھ شامل کرنے کی وکالت کی۔ ڈاکٹر محمد جسیم الدین نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

سمینار کے چوتھے اجلاس کا عنوان 'ملک کی تعمیر و ترقی میں اردو صحافت کا کردار' تھا۔ 24 اگست کے اس پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر مشتاق احمد، جناب فخر الدین عارفی اور جناب محمد افضل نے کی۔ مقالہ نگار کی حیثیت سے دو افراد اور شرکائے بحث کے طور پر تین اشخاص اس جلسے میں شامل ہوئے۔ روز نامہ 'انقلاب' کے بیورو چیف جناب اسفر فریدی نے اپنے مقالے بہ عنوان 'قومی ہم آہنگی اور اردو صحافت' اور ڈاکٹر زین شمسی نے 'اردو صحافت اور ہندستان کے معاصر سماجی اور ثقافتی مسائل' عنوان سے اپنے مقالے پیش کیے۔ یہ مقالے صحافت کی تاریخ اور ملک کی تعمیر وتشکیل کے مسائل و معاملات کو نظر میں رکھ کر لکھے گئے تھے۔ دونوں مقالوں پر جناب معین گریڈیہوی، ڈاکٹر صابر

رضا رہبر اور ڈاکٹر شاہد اختر انصاری نے اپنے تاثرات پیش کیے اور اردو صحافت کے کردار کی وضاحت کی۔ ڈاکٹر خالد رضا خاں نے اس جلسے کی نظامت کی۔ تینوں صدور حضرات نے باری باری اس اجلاس میں پیش کیے گئے مقالات کے امتیازی پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔

سمینار کے تیسرے دن پانچویں اور چھٹے اجلاس کا مشترکہ طور پر انعقاد عمل میں آیا جس کی مجلسِ صدارت میں پروفیسر صفدر امام قادری، پروفیسر جاوید حیات، جناب مشتاق احمد نوری اور ڈاکٹر علی امام شامل تھے۔ حصہ اول یعنی 'اردو فکشن میں سماجی اور ثقافتی جہات' کے حوالے سے دہلی یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو پروفیسر ابوبکر عباد نے 'اردو فکشن میں دیہی ہندستان کی تصویر کشی' عنوان سے اپنا مقالہ پڑھا جس میں انھوں نے پریم چند، سہیل عظیم آبادی، سدرشن، اعظم کریوی، اختر اورینوی، کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی اور خواجہ احمد عباس کے افسانوں کے حوالے سے اپنے مضمون کو مستحکم کیا تھا۔ پروفیسر شہاب ظفر اعظمی نے 'ترقی یافتہ بھارت کے تصورات اور معاصر اردو افسانہ' عنوان سے اپنا تجزیاتی مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے فکشن میں تہذیب و ثقافت کے عناصر کی شمولیت اور دیگر موضوعات کے دائرۂ کار کو واضح کیا اور ان چیلنجز کا ذکر کیا جو آنے والے وقت میں اردو فکشن کی تنقید و تحقیق کے حوالے سے زیر بحث ہوں گے۔ ڈاکٹر زرنگار یاسمین نے 'اردو فکشن کے کردار اور معاصر ہندستانی سماج' عنوان پر اپنا مقالہ پیش کیا اور اکیسویں صدی کے فکشن پر گفتگو کرتے ہوئے اس بات کی وضاحت کی کہ اس دوران عورتوں کی خود مختاری اور کرداروں کی صورت میں واضح تبدیلی آئی ہے۔ اس اجلاس میں جے پرکاش یونیورسٹی، چھپرا کے استاد ڈاکٹر علاء الدین خاں اور متھلا یونیورسٹی سے تشریف فرما ڈاکٹر فاروق اعظم نے شرکائے بحث کی حیثیت سے پیش کردہ مقالوں پر اپنی آرا پیش کیں۔

مشترکہ اجلاس کے دوسرے حصے میں چار مقالہ نگاروں نے اپنے مقالے پیش کیے۔ ڈاکٹر نسیم احمد نسیم نے 'بہار کی معاصر اردو شاعری میں سماجی مسائل کی عکاسی'، یونیورسٹی آف حیدرآباد کے استاد پروفیسر محمد زاہد الحق نے 'اردو شاعری اور معاصر سیاسی و سماجی افکار'، پاٹلی پترا یونیورسٹی کے رجسٹرار پروفیسر ابوبکر رضوی نے 'اردو شاعری میں قومیت کا تصور' اور شعبۂ اردو بہار یونیورسٹی، مظفر پور کے استاد پروفیسر حامد علی خاں نے 'اردو شاعری میں مشترکہ ہندستانی افکار و اقدار کی عکاسی' پر اپنے مقالات پیش کیے۔ شرکائے بحث کی حیثیت سے ڈاکٹر بدر محمدی اور ڈاکٹر بالمیکی رام نے اپنے تاثرات پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر شاداب شمیم نے کی۔ مجلسِ صدارت سے پروفیسر صفدر امام قادری، پروفیسر جاوید حیات، جناب مشتاق احمد نوری اور ڈاکٹر علی امام نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔

سمینار کا اختتامی اجلاس جناب شفیع مشہدی کی صدارت میں منعقد ہوا جس کے مہمانِ خصوصی پروفیسر اعجاز علی ارشد، مہمانانِ اعزازی پروفیسر ارتضیٰ کریم اور جناب امتیاز احمد کریمی تھے۔ نظامت ڈاکٹر فیضان الحق نے کی۔ اختتامی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے صدرِ مجلس جناب شفیع مشہدی نے اردو پڑھنے والوں کی تعداد اور مستقبل کے تصنیفی سرمائے کی صورت گری پر اپنے خدشات ظاہر کیے اور اس بات پر اردو عوام کو متوجہ کرنے کی کوشش کی کہ آنے والے پچیس برسوں میں ملک کی ترقی تو یقینی ہے مگر اسی کے ساتھ ہماری زبان کا تحفظ اور ترویج و اشاعت کے مراحل ہماری سنجیدہ توجہ کے متقاضی ہیں۔ پروفیسر اعجاز علی ارشد نے اردو زبان

کے مزاج کو سماج اور عہد کے موافق قرار دیا اور اس بات کا یقین دلایا کہ مستقبل میں اردو نثر اور نظم دونوں میں وقت کے مطابق تبدیلیاں آئیں گی۔ قومی اردو کونسل کے سابق ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے سمینار کے مباحث کو ترقی یافتہ ملک اور زبان کے تناظر میں ایک بہتر نقطۂ آغاز قرار دیا۔ انھوں نے اردو کے سرمائے کو انٹرنیٹ پر یونی کوڈ میں زیادہ سے زیادہ مقدار میں پیش کرنے کی وکالت کی۔ بہار پبلک سروس کمیشن کے سابق چیرمین جناب امتیاز احمد کریمی نے سمینار کے مباحث پر اطمینان کا اظہار کیا اور قومی اردو کونسل سے اس بات کی توقع کی کہ عصری موضوعات بالخصوص سائنس، کمپیوٹر سائنس اور مقابلہ جاتی امتحانات سے متعلق بڑی تعداد میں حوالہ جاتی کتب کی اشاعت کا اہتمام کرے گی۔

اختتامی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے اس سمینار کے ابتدائی مقصد کو واضح کرتے ہوئے یہ بتایا کہ ہماری زبان کی صحافت، فکشن اور شاعری ترقی یافتہ ملک کے تصورات کے آئینے میں کن تبدیلیوں سے ہم کنار ہوں گے، ان معاملات پر غور وفکر کے لیے یہ سہ روزہ سمینار منعقد کیا گیا تھا۔ انھوں نے اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ اردو زبان کے مصنفین اور تحقیق کاروں نے کونسل کی گزارش پر اپنی زبان کی تاریخ، سرمایۂ ادب اور مستقبل پر غور کرتے ہوئے اپنے علمی نتائج سے باخبر کیا۔ انھوں نے عظیم آباد کے شائقین زبان وادب کی بڑی تعداد میں سمینار میں شرکت اور اسے کامیاب ادبی جشن میں تبدیل کرنے کے لیے ان کا شکریہ ادا کیا۔

قومی اردو کونسل نے اس بار سمینار کے انعقاد میں ایک تجربہ یہ کیا کہ دن بھر کی علمی اور تحقیقی گفتگو کے بعد شرکا کو تخلیقی ادب کی رنگا رنگیوں سے مالا مال کرنے کے لیے علاحدہ محفلیں برپا کیں۔ تین دنوں تک چلنے والے سمینار میں ایسے تین ذیلی پروگرام منعقد ہوئے جو بڑے اہم اور سامعین کے لیے فرحت بخش تھے۔ اس سلسلے کا آغاز پہلے دن ہی ہو گیا جب شامِ افسانہ منعقد کی گئی جس میں ذکیہ مشہدی، غضنفر اور سید محمد اشرف جیسے بے حد نمائندہ افسانہ نگاروں کو مدعو کیا گیا تھا۔ شامِ افسانہ کی صدارت پروفیسر اعجاز علی ارشد نے فرمائی۔ غضنفر نے اپنا مشہور افسانہ 'مسنگ مین' پیش کیا۔ سید محمد اشرف نے 'ساتھی' عنوان سے افسانہ سنایا اور ذکیہ مشہدی نے بھی اپنا بے حد مشہور افسانہ 'گڑیا' پیش کیا۔ یہ محفل صرف افسانہ خوانی پر موقوف نہ ہو جائے، اس کے لیے قومی اردو کونسل نے معروف نقاد پروفیسر صفدر امام قادری کو اس اجلاس کا موڈریٹر بنایا تھا۔ انھوں نے ہر افسانہ نگار کی مجموعی خدمات، اس کے امتیازی کارناموں اور اردو کی ادبی تاریخ میں اس کے مقام ومرتبے کا بہ صراحت تذکرہ کیا اور یہ بھی بتایا کہ ان تین افسانہ نگاروں کی موجودگی اردو ادب کے مورخین کے لیے کس قدر معنیٰ خیز ہے۔ غضنفر، سید محمد اشرف اور ذکیہ مشہدی کی افسانہ نویسی اردو زبان کے مقبول رویوں میں کس طرح سکۂ رائج الوقت ہو گئی ہے، اس کے بھی اسباب انھوں نے واضح کیے۔ پروفیسر اعجاز علی ارشد نے صدارتی خطبے میں تینوں افسانوں میں اپنے عہد کے کرب کی شمولیت کا تذکرہ کیا۔

سمینار کے دوسرے روز تمام تکنیکی اجلاسوں کے بعد محفلِ شعر و سخن منعقد کی گئی جس کی صدارت سابق پولس افسر اور شاعر جناب اشّے کمار بے باک نے کی اور ڈاکٹر قاسم خورشید نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ مشاعرے میں جن شعرا نے شرکت کی، ان میں ڈاکٹر ظفر کمالی، خورشید اکبر، عالم خورشید، شمیم قاسمی، شاہد اختر، سنجے کمار کندن، نسیم احمد نسیم، خالد عبادی، اثر فریدی، آرادھنا پرساد، احمد معراج، اوبناش امن، خان رضوان، خوشبو پروین اور شبانہ عشرت شامل تھے۔ اکثر شعرا نے اپنی غزلیں پیش کیں جب کہ ساہتیہ اکادمی انعام یافتہ شاعر ڈاکٹر ظفر کمالی نے اپنی جمالیاتی رباعیات پیش کر کے سامعین اور اسٹیج سے داد وصول کی۔ اختتامی اجلاس کے بعد 24 اگست کو شام میں مشہور غزل گایک امریش مشرا نے ساز اور آواز کی خوش بو بکھیرتے ہوئے سمینار کے آخری مراحل کو نرم اور خواب آور بنانے میں کامیابی پائی۔ انھوں نے اردو کے مشہور شعرا کی غزلیں اپنی آواز اور اپنے مخصوص آہنگ میں پیش کیں۔ پروگرام کے اختتام تک تمام سامعین بیٹھے رہے۔

قومی اردو کونسل نے اپنے اس سمینار کے لیے عظیم آباد کا انتخاب کرتے ہوئے ایک اور جدت یہ کی کہ نو تعمیر شدہ 'باپو ٹاور' کو منتخب کیا جس کا وسیع و عریض میدان، خوب صورت ہال، بہترین ڈائننگ ہال، جدید ساؤنڈ سسٹم اور صد فی صد صاف ستھرے ماحول نے اہالیانِ عظیم آباد کو موہ لیا۔ اردو آبادی اور کسی تعلیمی ادارے اور یونیورسٹی سے بھی بہت دور ہونے کے باوجود سمینار میں ہر وقت تمام نشستیں بھری رہیں، اس کے پیچھے اس کیمپس کا حسن اور اس کی کشش سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ سیکڑوں ایسے لوگ تھے جنھیں سمینار میں نہ مقالہ پڑھنا تھا اور نہ ہی کسی مشاعرے یا پروگرام کے کسی حصے میں باضابطہ طور پر شرکت کرنی تھی مگر تینوں دن پابندیٔ وقت کے ساتھ شریک ہوتے رہے۔ سمینار دس بجے دن سے شروع ہوتا رہا اور روزانہ نو بجے رات تک چلتا رہا۔ نہ شامِ افسانہ میں سننے والوں کی تعداد کم ہوئی اور نہ مشاعرے میں۔ آخری روز بزمِ موسیقی میں بھی سننے والوں کی تعداد اسی طرح برقرار رہی۔ سمینار کے مختصر وقفوں میں نئی نسل کے طالب علم، ریسرچ اسکالرس اور نو خیز مصنفین کے لیے یہ بات باعثِ کشش رہی کہ ہندستان بھر کے نمائندہ لکھنے والے اس سمینار میں جمع تھے اور موجودہ عہد کے مزاجِ نو کے اعتبار سے یہ نئی نسل اپنے پسندیدہ مصنفین کے ساتھ تبادلۂ خیالات، تصویر کشی اور آٹو گراف لیتے ہوئے خود کو شاداں و فرحاں محسوس کرتی رہی۔ قومی اردو کونسل نے جس اہتمام سے اس پروگرام کا تصور کیا تھا، اس کی کامیابی اس سے سوا تھی۔ اب اس کے مقالات جلد از جلد چھپ کر آ جائیں تو پوری اردو آبادی کے لیے وہ کارآمد دستاویز ثابت ہوں گے۔

■

Md Marjan Ali
Research Scholar, Department of Urdu
Jai Prakash University,
Chapra - 841301 (Bihar)
Email: mdmarjanali07@gmail.com

قلمکاروں سے چند معروضات

ماہنامہ'اردو دنیا'علمی اور ادبی مجلہ ہے جس میں ادبیات، سماجیات، اقتصادیات، تہذیب و ثقافت،تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس و ٹکنالوجی، طب و فلسفہ،فنون لطیفہ،نفسیات، زبان کی زمینی صورت حال، عالمی ادبیات اور دیگر موضوعات پر مضامین شائع کیے جاتے ہیں۔ یہ خالص علمی اور ادبی نوعیت کا رسالہ ہے۔اس میں مذہبی مباحث اور متنازعہ فیہ مسائل پر مضامین کی اشاعت کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ رسالہ صرف 100 صفحات پر مشتمل ہوتا ہے۔اس رسالے میں پوری اردو دنیا کے دانشوروں، ادیبوں اور قلمکاروں کی تحریریں اشاعت کے لیے موصول ہوتی ہیں۔ بہت سے مضامین اشاعت کے لیے منظور کرلیے جاتے ہیں لیکن بہت سی تحریریں اشاعت سے محروم رہ جاتی ہیں۔ بہ کثرت مضامین موصول ہونے کی وجہ سے ادارے کو بہت سی دقتوں کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔اس لیے قلمکاروں سے گذارش ہے کہ اپنی تحریریں بھیجتے وقت مندرجہ ذیل امور کا بطورِ خاص لحاظ رکھیں۔

- مضمون غیر مطبوعہ ہو۔کسی اخبار/ مجلے میں ارسال نہ کیا گیا ہو اور نہ ہی اپنی یا کسی مرتب کردہ کتاب میں شامل ہو۔
- مضمون ادارے کے مزاج،معیار اور پالیسی کے منافی نہ ہو۔
- مضمون ان پیج پروگرام میں ہو اور 2500 (پچیس سو) الفاظ سے کم اور 4000 الفاظ سے زیادہ نہ ہو۔
- مضمون میں اعداد و شمار رومن میں لکھیں اور مضمون کے آخر میں حوالے/حواشی (کتب اور مضامین) کا اندراج ضرور کریں۔
- اچھوتے،نئے اور اہم موضوعات پر بھیجے ہوئے مضامین ترجیحی طور پر شائع کیے جائیں گے اور عمومی نوعیت کے مضامین کی اشاعت موصول ہونے کی ترتیب کے لحاظ سے کی جائے گی۔
- ایسے موضوعات یا شخصیات پر مضامین کی اشاعت ممکن نہیں جن پر بہ کثرت کتابیں یا مقالے شائع ہوچکے ہوں۔ ایسے موضوعات/شخصیات پر مضامین بھیجتے وقت چند سطروں میں نئے نکات اور نئے زاویے کی نشاندہی لازمی ہوگی۔
- جن مضامین میں زبان و بیان کی خامیاں اور حقائق،حوالے املا جملہ کی غلطیاں ہوں گی انھیں کسی بھی صورت میں اشاعت کے لیے منظور نہیں کیا جائے گا۔
- مضمون میں اشعار اور اقتباس کی صحت کا التزام اور ضرورت سے زیادہ اشعار اور اقتباسات سے پرہیز لازمی ہے۔
- شخصیات پر مضمون بھیجتے وقت متعلقہ فنکار کی تصویریں،کتابوں کا عکس اور دیگر ضروری معلومات ضرور ارسال کریں۔
- شہر یا ادارے پر لکھتے ہوئے اس سے متعلق تصاویر اور دیگر اہم معلومات لازمی بھیجیں۔
- درج ذیل تصدیق نامہ موصول ہوئے بغیر مضمون کی اشاعت پر غور نہیں کیا جائے گا:

''میرا مضمون غیر مطبوعہ ہے۔کسی اخبار/ مجلہ/ اپنی یا مرتب کردہ کتاب میں شامل نہیں ہے۔ یہ کسی کتاب/ مضمون کا سرقہ یا چربہ نہیں ہے۔اگر کچھ نقص پایا گیا تو اس کے لیے میں خود ذمہ دار ہوں گا/ہوں گی۔''

- کسی دوسری زبان کا ترجمہ اصل متن کے ساتھ ارسال کریں اور مصنف کا اجازت نامہ بھی منسلک کریں۔
- مضمون میں پہلے یا آخری صفحے پر مضمون نگار کا نام،مکمل پتہ مع پن کوڈ (انگلش میں) اور موبائل نمبر ضروری ہے۔

مضمون کی حتمی منظوری ایڈیٹوریل ریویو کے بعد ہی دی جائے گی۔

قلمکار حضرات اخلاقی ضوابط Ethical guidelines کا پورا خیال رکھیں۔

—ادارہ

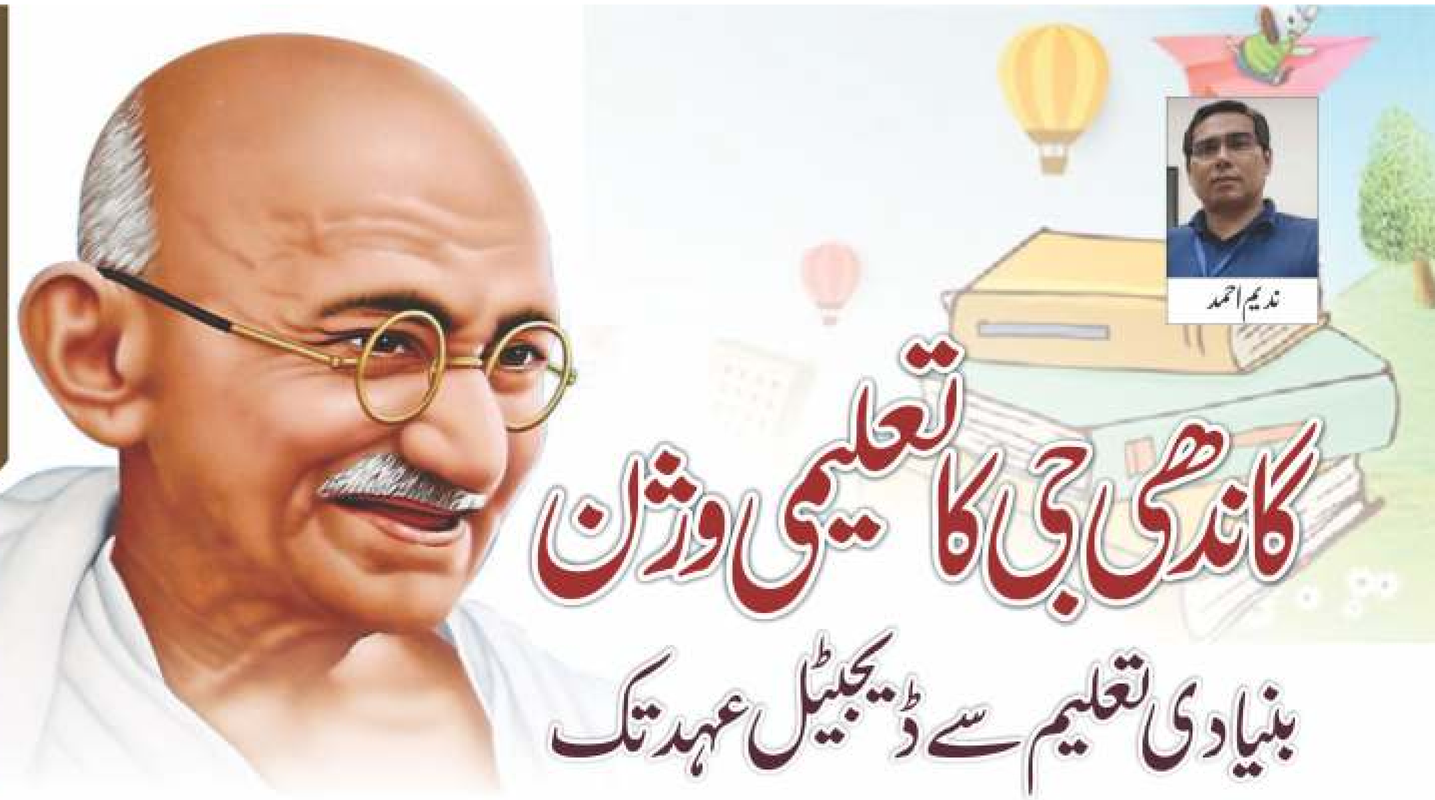

ندیم احمد

گاندھی جی کا تعلیمی وژن

بنیادی تعلیم سے ڈیجیٹل عہد تک

یہ مضمون موہن داس کرم چند گاندھی کے تعلیمی نظریات کا ایک دلچسپ اور تفصیلی جائزہ پیش کرتا ہے، جو ان کے 'نئی تعلیم' کے تصور سے شروع ہو کر آج کے ڈیجیٹل دور تک کے سفر کو بیان کرتا ہے۔ گاندھی جی نے تعلیم کو صرف کتابی علم کا ذریعہ نہیں، بلکہ ایک ایسی طاقت سمجھا جو انسان کو خود کفیل، اخلاقی، اور سماج سے مربوط کرتی ہے۔ 1937 کی وردھا کانفرنس میں پیش کیے گئے ان کے 'نئی تعلیم' کے اصول دست کاری، مقامی زبانوں، اور سماجی ہم آہنگی پر مبنی ہیں۔ یہ مضمون گاندھی جی کے نظریات کو اردو زبان کے تناظر میں بھی پرکھتا ہے، جسے انھوں نے ہندو۔مسلم اتحاد کا ایک میڈیم بنایا۔ یہ نئی تعلیم کو نیشنل ایجوکیشن پالیسی 2020 اور عالمی تعلیمی رجحانات سے جوڑتا ہے، اور ماحولیاتی چیلنجز، امن کی تعلیم، اور جامع تعلیم کے لیے اس کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔ 2 اکتوبر، گاندھی جینتی کے موقع پر، یہ مضمون ان کے تعلیمی پیغام کو اردو رسائل کے ذریعے عام کرنے کی ضرورت پر زور دیتا ہے، تاکہ ان کا یہ تصور نئی نسل تک پہنچے۔

جب بات گاندھی جی کی ہوتی ہے، تو ذہن میں ایک سادہ دھوتی میں لپٹا ہوا، چھڑی تھامے، سچائی اور عدم تشدد کا علمبردار ایک عظیم رہنما سامنے آتا ہے۔ لیکن گاندھی جی صرف سیاسی یا سماجی تحریکوں کے لیڈر ہی نہیں تھے، وہ ایک تعلیمی مفکر بھی تھے، جنھوں نے تعلیم کو ایک ایسی روشنی سمجھا جو انسان کے دل، دماغ، اور ہاتھ کو ایک ساتھ روشن کرتی ہے۔ ان کا 'نئی تعلیم' کا تصور، جو 1937 کی وردھا کانفرنس میں دنیا کے سامنے آیا، ایک ایسی تعلیم کی بات کرتا ہے جو نہ صرف کتابی علم دیتی ہو، بلکہ انسان کو خود کفیل، اخلاقی، اور سماج سے جڑا ہوا بناتی ہو۔

گاندھی جی کا ماننا تھا کہ تعلیم کو ہر اس شخص تک پہنچنا چاہیے جو اس کا حقدار ہے، چاہے وہ شہر کا رئیس ہو یا دیہات کا غریب۔ انہوں نے مقامی زبانوں، جیسے اردو اور ہندی، کو تعلیم کا ذریعہ بنانے پر زور دیا، تاکہ ہر بچہ اپنی ثقافت اور شناخت سے جڑا رہے۔ خاص طور پر اردو ان کے لیے ایک خاص اہمیت رکھتی تھی، کیونکہ وہ اسے ہندو۔مسلم اتحاد کا ایک مؤثر وسیلہ سمجھتے تھے۔ ان کا اخبار 'ہریجن سیوک' اس کی ایک زندہ مثال ہے، جس کے ذریعے انھوں نے اپنے خیالات کو سادہ اور دلچسپ اردو میں عوام تک پہنچایا۔

2 اکتوبر، یعنی گاندھی جینتی، جو اقوام متحدہ کی طرف سے عالمی یوم عدم تشدد کے طور پر بھی منایا جاتا ہے، ان کے تعلیمی نظریات پر بات کرنے کا ایک سنہری موقع ہے۔ آج کا دور ڈیجیٹل انقلاب کا دور ہے، جہاں تعلیم آن لائن پلیٹ فارموں تک جا پہنچی ہے۔ لیکن کیا یہ تعلیم ہمیں وہ اقدار سکھا رہی ہے جو گاندھی جی نے اپنی نئی تعلیم میں بیان کی تھیں؟ یہ مضمون گاندھی جی کے تعلیمی فلسفے کا ایک گہرا جائزہ لیتا ہے، اسے نیشنل ایجوکیشن پالیسی 2020 اور عالمی تعلیمی رجحانات سے جوڑتا ہے، اور اردو زبان کے ذریعے ان کے پیغام کو عام کرنے کی اہمیت کو واضح کرتا ہے۔ یہ ایک ایسی دعوت ہے کہ ہم گاندھی جی کے انقلابی خیالات کو آج کے دور میں زندہ کریں۔

گاندھی جی کا تعلیمی فلسفہ ان کے سماجی اور سیاسی نظریات کا آئینہ ہے۔ 1937 کی وردھا کانفرنس میں انھوں نے 'نئی تعلیم' یا 'بنیادی تعلیم' کا تصور پیش کیا، جو ہندوستان کے دیہاتوں کے لیے ایک انقلاب کی مانند تھا۔ ان کا ماننا تھا کہ تعلیم کو ہر اس شخص تک پہنچنا چاہیے جو اس کا حقدار ہے، چاہے وہ غریب ہو یا دیہاتی۔ نئی تعلیم صرف کتابی علم پر نہیں، بلکہ عملی تربیت، خود انحصاری، اور سماجی ہم آہنگی پر مبنی تھی۔ گاندھی جی نے کہا تھا: "تعلیم وہی ہے جو انسان کے ہاتھ، دل، اور دماغ کو ایک ساتھ ترقی دیتی ہے۔"

اس تصور کے تحت انھوں نے ہاتھ کے کام، جیسے کہ چرخا چلانا، بنائی، یا زراعت، کو نصاب کا لازمی حصہ بنایا۔ ان کا خیال تھا کہ ہاتھ سے کام کرنے سے طلبہ نہ صرف خود کفیل بنتے ہیں، بلکہ اپنی ثقافت اور مٹی سے بھی جڑے رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر، ایک بچہ جو چرخا چلاتا ہے، وہ نہ صرف ایک ہنر سیکھتا ہے، بلکہ اسے محنت کی قدر اور خود انحصاری کا سبق بھی ملتا ہے۔ یہ نظریہ ہندوستان کے دیہی معاشرے کے لیے نہایت موزوں تھا، جہاں وسائل کی کمی تھی، لیکن ہاتھ کے ہنر کی کوئی کمی نہیں تھی۔

بنیادی تعلیم کے تین بنیادی ستون تھے: خود انحصاری، سماجی ہم آہنگی، اور اخلاقی ترقی۔ گاندھی جی

نے تعلیم کو ایک ایسی طاقت سمجھا جو نہ صرف فرد کو بااختیار بناتی ہے، بلکہ پورے سماج کو جوڑتی ہے۔ انھوں نے زور دیا کہ تعلیم کو مقامی زبانوں، مثلاً اردو اور ہندی، میں ہونا چاہیے، تاکہ یہ طلبہ کے لیے سمجھنے میں آسان ہو اور ان کی ثقافتی شناخت کو مضبوط کرے۔

گاندھی جی کے لیے تعلیم صرف کتابی علم کا نام نہیں تھا، بلکہ ایک روحانی سفر تھا۔ انھوں نے سچائی (ستیہ) اور عدم تشدد (اہنسا) کو تعلیم کا مقصد بنایا۔ ان کا کہنا تھا کہ ایک سچا طالب علم وہی ہے جو اپنی تعلیم کو سماج کی بہتری کے لیے استعمال کرے۔ انھوں نے اخلاقی تعلیم پر زور دیا، جو طلبہ کو ہمدردی، ذمے داری، اور سماجی انصاف کا سبق سکھاتی ہے۔ ان کے الفاظ میں: ''ایک تعلیم یافتہ شخص وہی ہے جو اپنے علم کو دوسروں کی خدمت کے لیے استعمال کرے۔''

نئی تعلیم کا ایک اہم مقصد یہ بھی تھا کہ یہ طلبہ کو مادی دنیا کی دوڑ سے ہٹ کر سوچنے کی ترغیب دے۔ آج کے دور میں، جہاں تعلیم اکثر ملازمتوں اور مادی کامیابیوں سے ہی منسلک کی جاتی ہے، گاندھی جی کا یہ نظریہ ہمیں ایک گہرا سبق دیتا ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ تعلیم انسان کے اندر کی خودی کو جگائے، نہ کہ اسے ایک مشین بنادے۔

گاندھی جی نے اپنے نظریات کو عملی شکل دینے کے لیے کئی تجربات کیے۔ سابرمتی اور سیوا گرام آشرموں میں انھوں نے ایسی تعلیمی درسگاہیں قائم کیں جہاں طلبہ کو ہاتھ کے کام کے ساتھ ساتھ اخلاقی اقدار کی تعلیم دی جاتی تھی۔ یہاں طلبہ کتابیں پڑھنے کے ساتھ ساتھ زراعت، دست کاری اور دیگر ہنر سیکھتے تھے۔ یہ تجربات اس بات کا ثبوت ہیں کہ گاندھی جی کا تعلیمی فلسفہ محض نظریاتی نہیں، بلکہ عملی طور پر قابل عمل بھی تھا۔

آج بھی ہندوستان کے کچھ علاقوں میں، جیسے کہ گجرات اور مہاراشٹر، نئی تعلیم کے اصولوں پر مبنی اسکول چل رہے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے، یہ تصور قومی سطح پر مکمل طور پر نافذ نہ ہو سکا۔ اس کی وجہ وسائل کی کمی اور سیاسی عزم کا فقدان تھا۔ تاہم، گاندھی جی کے نظریات آج بھی ایک متبادل تعلیمی نظام کی طرف ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔

گاندھی جی کا اردو سے ایک گہرا اور جذباتی رشتہ تھا۔ وہ اسے ہندو-مسلم اتحاد کا ایک طاقتور وسیلہ سمجھتے

> گاندھی جی کے لیے تعلیم صرف کتابی علم کا نام نہیں تھا، بلکہ ایک روحانی سفر تھا۔ انھوں نے سچائی (ستیہ) اور عدم تشدد (اہنسا) کو تعلیم کا مقصد بنایا۔ ان کا کہنا تھا کہ ایک سچا طالب علم وہی ہے جو اپنی تعلیم کو سماج کی بہتری کے لیے استعمال کرے۔ انھوں نے اخلاقی تعلیم پر زور دیا، جو طلبہ کو ہمدردی، ذمے داری، اور سماجی انصاف کا سبق سکھاتی ہے۔

تھے۔ انھوں نے اپنے اخبارات، جیسے کہ 'ہریجن' اور 'ہریجن سیوک'، کو اردو میں شائع کیا تاکہ ان کے پیغامات ہندوستان کے کثیر ثقافتی معاشرے تک پہنچ سکیں۔ گاندھی جی نے کہا تھا: ''اردو ہماری مشترکہ تہذیب کی ایک زندہ علامت ہے۔'' ان کے لیے اردو صرف ایک زبان نہیں تھی، بلکہ ایک ایسی آواز تھی جو ہندو اور مسلم دونوں کے دلوں کو جوڑ سکتی تھی۔

انھوں نے تعلیم کو مقامی زبانوں میں حاصل کرنے کی اہمیت پر زور دیا، اور اردو کو ایک اہم ذریعہ سمجھا۔ ان کا اخبار 'ہریجن سیوک' اس کی نمایاں مثال ہے، جس میں انھوں نے سادہ اور دلچسپ اردو میں مضامین لکھے، جو عام لوگوں تک آسانی سے پہنچ سکتے تھے۔ یہ اخبار نہ صرف سیاسی مسائل پر بات کرتا تھا، بلکہ تعلیم، خود انحصاری، اور سماجی ہم آہنگی جیسے موضوعات پر بھی روشنی ڈالتا تھا۔

'ہریجن سیوک' گاندھی جی کا ایک اہم اردو اخبار تھا، جس کے ذریعے انھوں نے اپنے تعلیمی اور سماجی خیالات کو عام کیا۔ اس اخبار کے مضامین سادہ لیکن گہرے تھے، جو عام لوگوں کے لیے قابل فہم تھے۔ گاندھی جی نے اس کے ذریعے ہندوستان کے شمالی اور وسطی علاقوں کے قارئین تک اپنا پیغام پہنچایا۔ انھوں نے اردو کو ایک ایسی زبان سمجھا جو ہندوستان کی کثرت میں وحدت کی علامت تھی۔

آج کے دور میں، جب کہ اردو کو بعض اوقات صرف ایک مخصوص طبقے کی زبان سمجھا جاتا ہے، گاندھی جی کا یہ نظریہ ہمیں اس کی اہمیت کو دوبارہ سمجھنے کی دعوت دیتا ہے۔ ان کا اخبار 'ہریجن سیوک' اس بات کا ثبوت ہے کہ اردو نہ صرف ایک خوبصورت زبان ہے، بلکہ ایک ایسی طاقت بھی ہے جو مختلف ثقافتوں کو جوڑ سکتی ہے۔

گاندھی جی کے لیے اردو ایک پل تھا جو مختلف ثقافتوں اور مذاہب کو جوڑتا تھا۔ انھوں نے اپنے خطبات میں بارہا کہا کہ ہندوستان کی ترقی اس کی کثیر ثقافتی شناخت کو مضبوط کرنے میں ہے۔ اردو، جو ہندی اور فارسی کا امتزاج ہے، اس اتحاد کی ایک خوبصورت مثال تھی۔ انھوں نے اپنے آشرموں میں اردو کو فروغ دیا، تاکہ طلبہ اسے سیکھ کر اپنے پڑوسیوں کے ساتھ بہتر تعلق قائم کر سکیں۔

آج کے دور میں، اردو رسائل گاندھی جی کے تعلیمی نظریات کو عام کرنے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ یہ رسائل ان کے پیغام کو ایک وسیع اور متنوع حلقۂ قارئین تک پہنچا سکتے ہیں، اور ان کی اس سوچ کو زندہ رکھ سکتے ہیں کہ اردو ہماری مشترکہ وراثت کا ایک اہم ترین حصہ ہے۔

گاندھی جی کے تعلیمی نظریات آج کے ہندوستان کی نیشنل ایجوکیشن پالیسی (NEP) 2020 کے ساتھ گہری مماثلت رکھتے ہیں۔ NEP 2020 مقامی زبانوں میں تعلیم، عملی تربیت، اور طلبہ کی جامع ترقی پر زور دیتی ہے، جو گاندھی جی کے نئی تعلیم کے اصولوں سے ملتی جلتی ہے۔ مثال کے طور پر، NEP 2020 میں تین زبانوں کے فارمولے کو ترجیح دیا گیا ہے، جس میں مادری زبان کو ترجیح دی جاتی ہے۔ یہ گاندھی جی کے اس خیال سے ہم آہنگ ہے کہ تعلیم طالب علم کی اپنی زبان میں ہونی چاہیے تاکہ وہ اسے بہتر طور پر سمجھ سکے۔

تاہم، NEP 2020 اور نئی تعلیم میں کچھ فرق بھی ہیں۔ جہاں گاندھی جی نے ہاتھ کے کام اور دیہی ترقی پر زور دیا، وہیں NEP 2020 ڈیجیٹل تعلیم اور ٹیکنالوجی پر زیادہ توجہ دیتا ہے۔ لیکن دونوں کا مقصد ایک ہی ہے: تعلیم کو ہر فرد تک قابل رسائی اور سماج کے لیے مفید بنانا۔ گاندھی جی کا یہ نظریہ کہ تعلیم کو خود انحصاری اور سماجی ہم آہنگی کو فروغ دینا چاہیے، NEP 2020 کے مقاصد سے ملتا ہے۔

آج کا دور ڈیجیٹل انقلاب کا دور ہے۔ آن لائن کلاسز، ای-لرننگ پلیٹ فارمز، اور مصنوعی ذہانت نے تعلیم کے منظرنامے کو بدل دیا ہے۔ لیکن کیا یہ ڈیجیٹل تعلیم ہمیں وہ اقدار سکھا رہی ہے جو گاندھی جی نے اپنی نئی تعلیم میں بیان کی تھیں؟ گاندھی جی کا ماننا تھا کہ تعلیم کا مقصد صرف معلومات کا حصول نہیں، بلکہ انسان کی اخلاقی اور روحانی ترقی ہے۔ آج کے ڈیجیٹل دور میں، جہاں طلبہ کے پاس معلومات کی بھرمار ہے، گاندھی جی کے نظریات ہمیں یہ سوال پوچھنے پر مجبور کرتے ہیں کہ کیا ہماری تعلیم واقعی ہمیں ایک بہتر انسان بنا رہی ہے؟

مثال کے طور پر، گاندھی جی کے خود انحصاری کے اصول کو ڈیجیٹل تعلیم میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ طلبہ کو آن لائن سیکھنے کی تربیت دی جا سکتی ہے، جیسے کہ کوڈنگ، گرافک ڈیزائننگ، یا ڈیجیٹل مارکیٹنگ، جو انھیں خود کفیل بناتی ہیں۔ اسی طرح، ان کے عدم تشدد کے اصول کو آن لائن پلیٹ فارموں پر امن کی تعلیم اور سماجی ہم آہنگی کے پیغامات کے ذریعے فروغ دیا جا سکتا ہے۔

گاندھی جی کے تعلیمی نظریات کی گونج نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا میں سنائی دیتی ہے۔ یونیسکو کا ''Education for Sustainable Development" پروگرام گاندھی جی کے نظریات سے متاثر ہے، جو ماحولیاتی تحفظ، سماجی مساوات، اور امن کی تعلیم پر زور دیتا ہے۔ ان کا یہ خیال کہ تعلیم کو انسان کو سماج کے لیے مفید بنانا چاہیے، عالمی تعلیمی پالیسیوں میں شامل ہو رہا ہے۔

مثال کے طور پر، جنوبی افریقہ اور نیوزی لینڈ جیسے ممالک میں گاندھی جی کے نظریات سے متاثر تعلیمی پروگرام رائج ہیں، جو طلبہ کو مقامی ثقافت اور ماحولیاتی اقدار سے جوڑتے ہیں۔ یہ پروگرام گاندھی جی کے نئی تعلیم کے اصولوں سے ملتا جلتا ہے، جو عملی تربیت اور سماجی ذمے داری پر زور دیتا ہے۔

ہندوستان میں کئی ادارے گاندھی جی کے تعلیمی نظریات سے متاثر ہیں۔ گجرات ودیاپیٹھ، جو گاندھی جی نے قائم کیا، آج بھی نئی تعلیم کے اصولوں پر عمل کرتا ہے۔ یہاں طلبہ کو زراعت، دستکاری، اور سماجی خدمت کی تربیت دی جاتی ہے۔ اسی طرح، سیواگرام آشرم میں قائم تعلیمی پروگرام گاندھی جی کے ہی نظریات کی عملی شکلیں ہیں۔

عالمی سطح پر، مونٹیسوری اور والڈورف جیسے تعلیمی نظام گاندھی جی کے نظریات سے کچھ حد تک متاثر ہیں۔ یہ نظام طلبہ کی انفرادی صلاحیتوں اور ہمہ جہت ترقی پر زور دیتے ہیں، جو گاندھی جی کے فلسفے سے ملتا جلتا ہے۔

2 اکتوبر، یعنی گاندھی جینتی، ہندوستان اور پوری دنیا کے لیے ایک خاص دن ہے۔ اقوام متحدہ نے اسے عالمی یوم عدم تشدد کے طور پر تسلیم کیا ہے، جو گاندھی جی کے عدم تشدد کے فلسفے کی عالمی اہمیت کو ظاہر کرتا ہے۔ اس دن گاندھی جی کے تعلیمی نظریات پر بات کرنا نہ صرف مناسب ہے، بلکہ ضروری بھی ہے۔ انھوں نے تعلیم کو ایک ایسی طاقت سمجھا جو انسان کو سچائی اور عدم تشدد کے راستے پر لے جاتی ہے۔

گاندھی جینتی کے موقع پر، ہندوستان بھر میں اسکولوں، کالجوں، اور کمیونٹیز میں گاندھی جی کے نظریات پر مباحثے اور سرگرمیاں منعقد کی جاتی ہیں۔ یہ ایک بہترین موقع ہے کہ ہم ان کے تعلیمی پیغام کو نئی نسل تک پہنچائیں، اور خاص طور پر اردو زبان کے ذریعے، جو ان کے لیے ہندو-مسلم اتحاد کا ایک اہم ذریعہ تھی۔

آج کے دور میں، جب دنیا ماحولیاتی تبدیلی، سماجی عدم مساوات، اور تشدد جیسے مسائل سے دوچار ہے، گاندھی جی کے تعلیمی نظریات ایک روشنی کی کرن ہیں۔ ان کا یہ خیال کہ تعلیم کو ماحولیاتی تحفظ اور سماجی ہم آہنگی کو فروغ دینا چاہیے، اقوام متحدہ کے Sustainable Development Goals (SDGs) سے ہم آہنگ ہے۔ خاص طور پر SDG4 (Quality Education) کا مقصد ہر فرد کے لیے معیاری اور جامع تعلیم کو یقینی بنانا ہے، جو گاندھی جی کے نئی تعلیم کے تصور سے ملتا ہے۔

ان کے عدم تشدد کے اصول آج کے امن کی تعلیم کے پروگراموں کے لیے ایک رہنما اصول ہیں۔ مثال کے طور پر، یونیسکو کے پروگرام گاندھی جی کے نظریات سے متاثر ہیں، جو طلبہ کو امن، رواداری، اور سماجی انصاف کا درس دیتے ہیں

گاندھی جی کے تعلیمی نظریات آج بھی ہمارے لیے ایک مشعل راہ ہیں۔ ان کا نئی تعلیم کا تصور، جو خود انحصاری، سماجی ہم آہنگی، اور اخلاقی ترقی پر مبنی ہے، موجودہ تعلیمی نظام کے لیے ایک عظیم سبق ہے۔ آج کے ڈیجیٹل دور میں، جب کہ تعلیم تیزی سے ٹیکنالوجی کے تابع ہو رہی ہے، گاندھی جی ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ تعلیم کا اصل مقصد انسان کی ہمہ جہت ترقی ہے۔

اردو زبان، جو گاندھی جی کے لیے ہندو-مسلم اتحاد کا ایک اہم ذریعہ تھی، خود ان کے اپنے نظریات کی ترسیل کا بھی ایک طاقتور وسیلہ تھی۔ اردو رسائل، مثلاً 'تہذیب الاخلاق' اور 'آجکل'، ان کے تعلیمی نظریات کو نئی نسل تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ خاص طور پر، 2 اکتوبر کے موقع پر، جب پوری دنیا گاندھی جینتی اور عالمی یوم عدم تشدد مناتی ہے، ان کے تعلیمی نظریات پر گفتگو کی ضرورت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

ہمیں چاہیے کہ ہم گاندھی جی کے نظریات کو اپنے اسکولوں، کالجوں، اور کمیونٹیز میں شامل کریں، تاکہ ایک ایسی نسل تیار ہو جو نہ صرف علمی طور پر مضبوط ہو، بلکہ اخلاقی اور سماجی طور پر بھی ذمے دار ہو۔ گاندھی جی کا یہ پیغام کہ تعلیم ایک انقلاب ہے، آج بھی ہمارے لیے ایک رہنما اصول ہے۔

ماخذ و مصادر

1 گاندھی، ایم۔ کے۔ (1927) ہند سوراج۔ نوجیون پرنٹنگ پریس، احمد آباد۔

2 گاندھی، ایم۔ کے۔ (1938)۔ ہریجن، مختلف مضامین۔ احمد آباد۔

3 گاندھی، ایم۔ کے۔ (1937)۔ 'نئی تعلیم'، وردھا کانفرنس رپورٹ، سیواگرام آشرم پبلی کیشنز۔

4 نیشنل ایجوکیشن پالیسی 2020۔ وزارت تعلیم، حکومت ہند۔

5 کمار، کرشنا۔ (1994)۔ Learning from Gandhi۔ گجرات ودیاپیٹھ، احمد آباد۔

6 یونیسکو۔ (2020)۔ Education for Sustainable Development: A Roadmap۔ یونیسکو پبلی کیشنز۔

7 'ہریجن سیوک' اخبار، 1933-1940، مختلف ایڈیشن۔ احمد آباد۔

8 پاریک، آر۔ (2008)۔ 'گاندھیان ایجوکیشن: نئی تعلیم کی عصری اہمیت'۔ جرنل آف ایجوکیشنل ریسرچ، والیوم 12، نمبر 3۔

■

Dr. Nadeem
Dept of Urdu,
Kirori Mal Cellege (University of Delhi)
Delhi- 110007
ahmad_126@yahoo.co.in

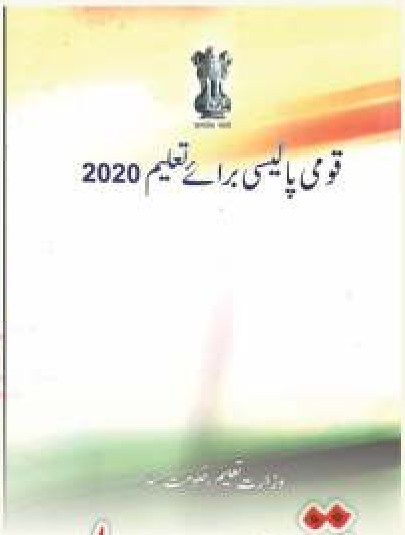

غزالہ شیریں

نئی تعلیمی پالیسی اور علاقائی زبان

کسی بھی انسان کی تعلیمی زندگی میں مادری یا علاقائی زبان کی اہمیت بنیادی ہے اور اگر یہ کہا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا کہ انسان کی تمام تر تعلیمی اور علمی ترقی کا دارومدار اس کی مادری زبان پر ہی منحصر ہوتا ہے کیونکہ اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ درس وتدریس کی زبان اگر فطری اور قابل فہم ہو تو طلبہ نہ صرف نفس مضمون کو بہتر طریقے سے سمجھ سکتے ہیں بلکہ اپنے خیالات کو بھی موثر انداز میں پیش کرنے کے قابل ہوجاتے ہیں، یہی سبب ہے کہ ہندوستان میں آزادی کے بعد سے علاقائی زبانوں کو درس وتدریس کے میدان میں خصوصی اہمیت دی جاتی رہی ہے اور آج بھی اس کی ضرورت کے پیش نظر تعلیمی منصوبہ بندیوں میں علاقائی زبانوں کو خاص مقام حاصل ہے۔

جنوری 2015 میں مجلس عاملہ کے سابق سکریٹری T.S.R. Subramanian کی قیادت میں ایک تعلیمی کمیٹی کی تشکیل کی گئی۔ کمیٹی نے ملک کی ضرورت کے پیش نظر اپنی رپورٹ تیار کی اور بہت سے اہم نکات پر حکومت کی توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی۔ اس رپورٹ کی بنیاد پر 2019 میں نئی تعلیمی پالیسی تیار کرنے کے لیے ایک پینل تشکیل دیا گیا، جس کی قیادت ISRO کے سابق چیف کرشنا سوامی کستوری رنگن نے کی اور بہت غور وفکر کرنے کے بعد 30 جولائی 2020 کو کیبنیٹ نے کمیٹی کے مشوروں کی بنیاد پر نئی تعلیمی پالیسی کو منظوری دے دی۔ یعنی دوران کووڈ 2020 میں بھارت نے عالمی تعلیمی ترقی کے ایجنڈے کو قبول کرتے ہوئے اس میں ترمیم واضافہ کیا اور اسی کے ساتھ ساتھ معیاری تعلیم اور تاحیات سیکھنے کے مواقع فراہم کرنے کا مقصد طے کیا گیا۔ موجودہ دور میں نئی تعلیمی پالیسی کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے جس کی تفصیل ذیل میں پیش کی جارہی ہے:

1. نئی تعلیمی پالیسی کا زمرۂ اول اسکول کی تعلیم سے متعلق ہے۔ اس میں اچھے اسکول کی خوبیاں اور جماعت سوم تک تمام طلباء کی خواندگی اور بنیادی ریاضی کی صلاحیت پیدا کرنے کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ اس پالیسی کی اہم تبدیلی، اسکولی تعلیم کے پیٹرن کو بدلنا اور نئے زمانے سے اس کو ہم آہنگ کرنا ہے۔ اس میں ابتدائی پانچ سالوں میں پری پرائمری کے تین سال اور اول و دوم درجے شامل ہیں۔ دوسرے مرحلے میں سوم تا پنجم جماعتیں شامل کی گئی ہیں۔ تیسرے مرحلے میں ششم، ہفتم، ہشتم درجے میں شامل کیے گئے ہیں۔ آخری چار سالہ مرحلے میں ازنہم تا بارہویں جماعتیں شامل کی گئیں ہیں۔ اس کے علاوہ آنگن واڑی استاد کی تقرری اور اس کی اہلیت وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مہاجر طلبہ کے لیے الگ سے متبادل تعلیمی ادارے قائم کرنے کی بات بھی کہی گئی ہے اور مادری یا علاقائی زبان میں تعلیم دینے اور اس کو ترجیح دینے کی ترغیب دی گئی ہے۔

2. اس پالیسی کا زمرۂ دوم اعلیٰ تعلیم کے بارے میں ہے، جس میں مقامی زبان میں کالج کی تعداد بڑھانے کی سفارش کی گئی ہے اور خود مختار ڈگری فراہم کرنے والے کالج کے قیام کی سفارش کی اہمیت وضرورت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اعلیٰ تعلیمی اداروں میں داخلے کو 24 فیصد سے بڑھا کر 50 فیصد تک لانے کی ہدایت دی گئی ہے۔ نئے زمانے کے تقاضوں کے پیش نظر کالج اور یونیورسٹی میں آن لائن کورسیز چلائے جانے کی افادیت پر زور دیا گیا ہے۔

3. نئی تعلیمی پالیسی کا زمرۂ سوم 'دیگر قابل توجہ اہم خطے' کے عنوان سے ہے۔ اس میں تاحیات تعلیم اور تعلیم بالغان کے لیے رہنما خدوخال کا ذکر کیا گیا ہے۔ بھارتی زبانوں کے فروغ کے لیے مختلف اقدامات کرنے کی سفارش کی گئی ہے۔ اس حصے میں کتابیں، رسالے، اخبارات، ترجمے، کورسیز اور میڈیم وغیرہ جیسے اقدامات مذکور ہیں۔

4. زمرۂ چہارم کا عنوان ہے 'پالیسی کو عمل میں لائیں' یہ زمرہ تین موضوعات پر مشتمل ہے:

1 CABE کے اہم رول کو واضح کیا گیا ہے۔

2 سب کے لیے کفایتی، معیاری تعلیم فراہم کرنے کی بات کہی گئی ہے۔

3 اس پالیسی پر عمل آوری کے متعلق ہدایات دی گئی ہے۔

نئی ایجوکیشن پالیسی میں مادری زبان اور علاقائی زبانوں میں تعلیم دینے کا ذکر خصوصی طور پر کیا گیا ہے۔ جو کئی اعتبار سے بہت اہمیت کا حامل ہے، کیونکہ ماہرین تعلیم کو اس بات کا بخوبی اندازہ ہے کہ انسان کی تخلیقی صلاحیتوں کا سب سے بہتر اظہار مادری زبان میں ہی ممکن ہے، اور یہ نکتہ بھی لائق توجہ ہے کہ اپنے خیالات کے درست اظہار کے لیے بھی مادری زبان کا ہی سہارا لیا جاتا ہے۔ فہم انسانی کا براہ راست تعلق بھی ذہن انسانی اور مادری زبان کے رابطے سے ہی ممکن ہوسکتا ہے۔ یہ ایک قدرتی امر ہے کہ فہم انسانی میں جامعیت، وسعت اور گہرائی صرف مادری زبان میں ہی ممکن ہے۔ الغرض سیکھنے اور سکھانے کے لیے آسان ترین زبان علاقائی یا مادری زبان ہی ہوسکتی ہے اور اس کے علاوہ کسی دوسری زبان کے ذریعے تخلیقی صلاحیتوں کو درست طریقے سے استعمال نہیں کیا جا سکتا ہے۔ دنیا میں ہونے والی مختلف قسم کی ایجادات اور انکشافات کا براہ راست تعلق بھی مادری زبان سے ہی ہوتا ہے تاریخ گواہ ہے کہ دنیا میں بڑے بڑے کارنامے انجام دینے والے دانشوروں نے اپنی مادری اور علاقائی زبانوں کی مدد سے اپنی ایک انفرادی پہچان بنائی ہے۔

علاقائی زبان انسانی شناخت، تشخص اور کردار سازی میں بھی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ہر وہ زبان جس میں لٹریچر تخلیق پا سکتا ہو، ترسیل علم کے لیے بھی بہترین مانی جاتی ہے۔ جب کہ لٹریچر کا تعلق بھی علاقائی زبان سے ہی ہوتا ہے تعلیم کے لیے مادری یا علاقائی زبان سے بہتر کوئی زبان نہیں ہوسکتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ترقی یافتہ دنیا میں زیادہ تر ممالک میں تعلیم ان کی علاقائی زبانوں میں ہی دی جانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

نئی ایجوکیشن پالیسی میں بھی مادری یا علاقائی زبان میں تعلیم دینے کو ضروری بلکہ لازمی قرار دیا گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس پالیسی میں پرائمری تعلیم بذریعہ مادری زبان کو یقینی بنانے کی پرزور وکالت کی گئی ہے اور یہ دعویٰ بھی کیا گیا ہے کہ مادری زبان کے ذریعے تعلیم سائنٹفک نظریے کو مدنظر رکھ کر اپنائی گئی ہے۔ حکومتی پالیسی میں ابتدا سے چھٹی کلاس تک لازمی طور پر علاقائی زبان میں تعلیم دینے کی بات کہی گئی ہے۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ علاقائی زبان میں تعلیم دینے سے بچوں کی تحقیقی اور تخلیقی صلاحیتوں میں حیرت انگیز حد تک اضافہ ہوتا ہے۔ مادری زبان میں تعلیم دیئے جانے میں ایک آسانی یہ ہوتی ہے کہ بچے کے پاس اپنی زبان کے علم کا ایک ذخیرہ پہلے سے موجود ہوتا ہے اس لیے دوران تعلیم بوریت کے بجائے بچہ خوشی محسوس کرتا ہے۔ مادری زبان میں تعلیم دینے سے بچوں کے ننھے ذہنوں پر کم بوجھ پڑتا ہے اور بچوں کے اسکول چھوڑنے کی شرح میں بھی بڑی حد تک کمی دیکھنے کو ملتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب پرائمری سطح پر مادری زبان میں تعلیم دینے کو لازمی بنایا جائے گا تو مختلف علاقوں میں علاقائی زبانوں کے فروغ کا راستہ بھی ہموار ہو جائے گا اور اس ضمن میں اردو کے لیے بھی ترقی کی نئی فضا قائم ہوگی البتہ اس کے لیے شرط یہ ہے کہ تمام اسکولوں میں طلبہ کی ضرورت کے مطابق اردو اساتذہ بحال کیے جانے کے سلسلے میں ضروری اقدامات کو یقینی بنایا جائے۔

مادری زبان مین تعلیم کے بارے میں 'یونیسکو' کا کہنا ہے کہ" جو بچے اپنی مادری زبان سے تعلیم کی ابتدا کرتے ہیں شروع سے ہی ان کی کارکردگی بہتر ہوتی ہے اور ان کی یہ اچھی کارکردگی مسلسل قائم رہتی ہے بہ نسبت ان بچوں کے جو اپنی تعلیم کی ابتداء نئی زبان سے کرتے ہیں۔"

نئی ایجوکیشن پالیسی میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ لوگ اپنی مقامی زبان میں تعلیم حاصل کر سکتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی مقامی زبانوں کے فروغ کی بابت سفارشات بھی پیش کی گئی ہیں۔ اسکول کی زبان کے سلسلے میں سہ لسانی فارمولہ اختیار کرنے کی بات کہی گئی ہے، سہ لسانی فارمولوں میں سنسکرت زبان کا انتخاب کرنے کی ترغیب دی گئی ہے لیکن کہیں پر بھی سنسکرت زبان کو لازمی قرار نہیں دیا گیا ہے۔ پالیسی میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ کسی بھی علاقائی زبان کو کسی دوسری ریاست کے افراد کو سیکھنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا ہے۔ نئی ایجوکیشن پالیسی میں مقامی زبان اور مادی زبان کے فروغ اور ترقی کی بات خصوصی طور پر کہی گئی ہے۔ پالیسی میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ لسانی فارمولوں میں کم سے کم دو زبانیں بھارت کی ہوں جب کہ ایک غیر ملکی زبان بھی پڑھی جا سکتی ہے۔ کسی بھی زبان کو کسی پر لازمی قرار نہیں دیا جا سکتا ہے۔ اس سہ لسانی فارمولے میں خاص لچک رکھی گئی ہے۔

دنیا کے تمام ماہرین تعلیم کا کہنا ہے کہ بچوں کو بنیادی تعلیم ان کی علاقائی زبان میں ہی دی جانی چاہیے۔ سائنس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ بچوں کی ذہن سازی میں ان کی مادری اور علاقائی زبانوں کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ ہمارے ملک میں انگریزی میڈیم اسکولوں پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ حالانکہ آزادی کے بعد حکومت کی طرف سے یہ کوشش کی گئی تھی کہ ملک کے بنیادی اسکولوں میں قومی زبان ہندی کو فروغ ملے لیکن افسوس کہ اس پر عمل نہ کیا جا سکا۔ جہاں تک ملک کی دیگر علاقائی زبانوں کی بات ہے جو اب تک زندہ ہیں تو وہ صرف ان کے چاہنے والوں کی ذاتی کوششوں اور محبتوں کی وجہ سے ہی ممکن ہو سکا ہے ورنہ انگریزیت کے نشہ نے علاقائی زبان کے فروغ کے تمام راستے ناہموار بلکہ مسدود کر دیے تھے۔ انگریزیت کے اس اثر نے دیگر علاقائی زبانوں کے ساتھ ساتھ ہندی اور اردو کو بھی بہت زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔ اسی لیے نئی ایجوکیشن پالیسی میں بنیادی تعلیم بذریعہ مادری زبان یا علاقائی زبان کو مرکزی حیثیت عطا کی گئی ہے۔ میرے خیال میں یہ اس پالیسی کی سب سے اہم خوبی ہے۔ اگر

> نئی ایجوکیشن پالیسی میں مادری زبان اور علاقائی زبانوں میں تعلیم دینے کا ذکر خصوصی طور پر کیا گیا ہے۔ جو کئی اعتبار سے بہت اہمیت کا حامل ہے، کیونکہ ماہرین تعلیم کو اس بات کا بخوبی اندازہ ہے کہ انسان کی تخلیقی صلاحیتوں کا سب سے بہتر اظہار مادری زبان میں ہی ممکن ہے، اور یہ نکتہ بھی لائق توجہ ہے کہ اپنے خیالات کے درست اظہار کے لیے بھی مادری زبان کا ہی سہارا لیا جاتا ہے۔

واقعی قومی سطح پر پرائمری اسکولوں میں مادری زبان میں تعلیم کو فروغ ملتا ہے اور اس پالیسی کے اہم نکات کو نافذ کیا جاتا ہے تو اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ اس سے نہ صرف علاقائی زبانوں کے پھلنے پھولنے کا ماحول سازگار ہوگا بلکہ قومی زبان کے لیے بھی راہیں ہموار ہوں گی اور اس سے اردو زبان کے لیے بھی نئی شاہراہیں تشکیل پائیں گی۔

ہمارے یہاں بچے گھر میں جو زبان بولتے ہیں اس زبان سے انھیں اسکول میں سابقہ نہیں پڑتا ہے بلکہ ان کی تعلیم کی ابتدا انگریزی زبان سے کی جاتی ہے جس کا اثر ان کی پوری تعلیمی زندگی پر پڑتا ہے اور بعد میں وہ کسی بھی شعبے میں کتنی ہی مہارت حاصل کیوں نہ کرلیں لیکن ابتدائی تعلیم مادری زبان میں نہ ہونے کی وجہ سے جو نقص ان میں رہ جاتا ہے وہ کبھی پورا نہیں ہوتا ہے۔ مادری زبان سے ناواقفیت اور بے پروائی ہمارے معاشرے کی پسماندگی کی بڑی وجہ ہے۔ اگر ہم اپنے ملک کا جائزہ اس عالمی تناظر کے پس منظر میں لیں تو بہت ہی افسوسناک صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہمارے یہاں نہ صرف پیشہ ورانہ کورسیز انگریزی میں پڑھائے جاتے ہیں اور انجینئرنگ، طب اور قانون میں انگریزی کے غلبہ کو برقرار رکھا گیا ہے، بلکہ ابتدا سے ہی بچوں کو مادری زبان کے بجائے انگریزی زبان میں تعلیم دینے کو خوبی سمجھتے ہیں اور انھیں اپنی زبان سے ناواقف رکھنے کی گویا شعوری کوشش کرتے ہیں۔ یہاں اس بات پر بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے کہ مادری زبان میں تعلیم پر زور دینے سے ہرگز یہ مطلب نہیں کہ دوسری زبانوں کو کمتر سمجھا جائے یا انھیں پوری طرح سے نظر انداز کیا جائے۔ اس سلسلے میں سابق نائب صدر جمہوریہ جناب وینکیا نائیڈو کی یہ بات اہم ہے کہ ہر شخص کو کئی زبانوں کا ماہر ہونا چاہیے، لیکن مادری زبان میں حصول تعلیم کی حیثیت کلیدی اور بنیادی ہونی چاہیے لیکن انسان اپنی ذاتی صلاحیتوں اور ذوق کے مطابق کتنی بھی زبانیں سیکھ سکتا ہے لیکن یہ حقیقت پیش نظر رہنا بے حد ضروری ہے کہ کسی بھی ملک کے تعلیمی نظام میں مادری زبان کو نظر انداز کیا جانا بڑے خسارے کا سبب بن سکتا ہے اور اس وجہ سے ہماری آنے والی نسلیں اپنے ملک اور قوم کے بے انتہا ثروت مند تہذیب وتمدن سے محروم ہوسکتی ہیں جو یقیناً ایک بڑا نقصان ہے۔

> دنیا کے تمام ماہرین تعلیم کا کہنا ہے کہ بچوں کو بنیادی تعلیم ان کی علاقائی زبان میں ہی دی جانی چاہیے۔ سائنس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ بچوں کی ذہن سازی میں ان کی مادری اور علاقائی زبانوں کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔

تحقیق سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ہر سال دنیا کی کئی زبانیں دم توڑ رہی ہیں۔ اس لیے یہ مشکل بھی ہے کہ قومی سطح پر علاقائی زبان میں تعلیم کا انتظام صد فی صد درست طور پر نافذ کیا جا سکے۔ لیکن نئی ایجوکیشن پالیسی میں اس عمل کو یقینی بنانے کا عہد کیا گیا ہے اور اس کے لیے تمام ریاستی حکومتوں سے تعاون کی درخواست بھی کی گئی ہے اور مرکز کی تعلیمی پالیسی کا نفاذ اسی وقت ممکن اور کامیاب ہوسکتا ہے جب تک کہ ریاستی حکومتیں اس پر لبیک نہ کہیں۔ اچھی بات یہ ہے کہ اس وقت مرکزی حکومت کی اس پالیسی کی حمایت کرنے والی ریاستوں کی تعداد زیادہ ہے۔ اس لیے یہ امید کی جا سکتی ہے کہ آنے والے وقت میں علاقائی زبانوں میں بنیادی تعلیم کے راستے ضرور ہموار ہوں گے اگر علاقائی زبان میں تعلیم کا انتظام کیا جاتا ہے تو خود بخود مادری زبان کو بھی استحکام حاصل ہوگا جو ہمارے ملک کی ترقی کا ضامن قرار دیا جاسکے گا۔

اس طرح اگر ہم حقیقی معنوں میں مادری زبان سے محبت کرتے ہیں اور اس کی کامیابی کے لیے سنجیدہ ہیں تو ہمیں پوری دیانت داری اور حقیقت پسندی کے ساتھ اس کو عملی جامہ پہنانے کی ضرورت ہے۔ جہاں بچوں کی ابتدائی تعلیم کا انتظام مادری زبان میں کرنا ہوگا وہیں اس چیز کو بھی یقینی بنانا ہوگا کہ ہمارے اساتذہ اس قابل ہوں جو کہ واقعی مادری زبان میں مختلف موضوعات کی تدریس کا فریضہ بخوبی انجام دے سکیں۔ سرکار کی یہ نئی تعلیمی پالیسی اپنے دیگر پہلوؤں کے ساتھ ساتھ اس اعتبار سے بھی قابل تعریف ہے کہ اس میں مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے پر غیر معمولی توجہ دی گئی ہے۔ بس اس کو عمل میں لانے کے لیے سنجیدگی اور قوت ارادی سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ اگر ایسا ہوتا ہے تو یقینی طور پر ہمارے ملک میں مادری زبان میں تعلیم کے حوالے سے ایک خوش گوار انقلاب رونما ہوسکتا ہے۔

سرکار کا کام پالیسی بنانا ہے مگر اسے زمینی سطح پر عمل میں لانا ان لوگوں کا کام ہے جو اس شعبے سے براہ راست وابستہ ہیں، مثلاً تدریس سے وابستہ اساتذہ کی ذمے داری ہے کہ وہ دیانت داری سے اپنے فرائض کو ادا کریں اور اسکول کے ذمہ داران مقامی تعلیمی افسران اور انتظامیہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ ہر علاقے میں وہاں کے طلبا کی مادری زبان کے اساتذہ کی تقرری کا نظم کریں اور اس بات کو یقینی بنائیں کہ چھٹی کلاس تک طلبہ کی تعلیم مادری زبان میں ہو۔ خلاصہ یہ کہ نئی ایجوکیشن پالیسی میں مقامی زبانوں کے فروغ کے بارے میں بار بار ہدایت دی گئی ہے، اسی طرح پالیسی نے تعلیم سے متعلق ہر فرد اور ہر ادارے کو اس کی ذمہ داریوں کا احساس دلایا ہے۔ اس نئی تعلیمی پالیسی کے مؤثر عملی نفاذ اور بھارت کے موجودہ تعلیمی نظام میں اس کی شمولیت کو یقینی بنانے کے لیے ملک و معاشرے کے ہر باشعور اور بیدار ذہن فرد، نیم سرکاری و نجی اداروں کو باہمی تال میل کے ساتھ آگے آنا ہوگا۔

مآخذ ومصادر

1 نئی تعلیمی پالیسی اور اردو تدریس، اشاعت 1989، اردو اکادمی، دہلی۔
2 قومی پالیسی برائے تعلیم 2020، وزارت تعلیم حکومت ہند۔
3 نئی تعلیمی پالیسی اور تعلیم کا مقصد، شمیم طارق۔
4 تعلیمی پالیسی، :1979 ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن صدیقی، پروفیسر احمد انس، انسٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد۔
5 'نئی تعلیمی پالیسی 2020 اور سندی تحقیق' مقالہ نگار: سلمان فیصل، مقام ابن سینا اکیڈمی علی گڑھ، 2022
6 نئی تعلیمی پالیسی 2020 مواقع اور اندیشے، از محمد قمر انجم فیضی۔

■

Ghazala Shireen
Research Scholar
Supervsior: Dr. Neelofar Hafeez
Department of Arabic and
PersianUniversity of Allahabad
Prayagraj- 211002 (UP)
Mob.: 9984123852
ghazalashireen95@gmail.com

نوشاد حسین

مصنوعی ذہانت کے دور میں بچوں کی پرورش

اکیسویں صدی میں مصنوعی ذہانت (AI) کا روزمرہ زندگی میں بے مثال انضمام دیکھنے میں آیا ہے۔ گھریلو کاموں کو انجام دینے والے اسمارٹ اسسٹنٹس سے لے کر بچوں کی تفریح اور تعلیم پر اثر انداز ہونے والی الگورتھم پر مبنی تجاویز تک، AI ٹیکنالوجی اب گھریلو ماحول میں گہرائی سے رچ بس گئی ہے۔ آج کے دور میں خاندان نہ صرف روایتی والدین کی ذمہ داریوں سے نبرد آزما ہیں بلکہ وہ اپنے گھروں میں موجود ڈیجیٹل نظام کی موجودگی کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہو رہے ہیں۔ اس نئے منظرنامے میں والدین کے رویے، جنھیں ماضی میں جذباتی قربت، نظم و ضبط اور باہمی ابلاغ و ترسیل جیسے عناصر سے تعبیر کیا جاتا تھا، اب AI کے منطقی اور خودکار آلات کے اثرات سے نئی شکل اختیار کر رہے ہیں۔ والدین کے طرزِ تربیت جیسے مقتدر، نرم خو، یا غفلت آمیز رویے اب اس بات سے بھی جڑنے لگے ہیں کہ وہ AI پر مبنی نظام جیسے تعلیمی ایپلی کیشنز، ڈیجیٹل معاونین یا نگرانی کرنے والی ٹیکنالوجی کو کس طرح استعمال کرتے یا ان پر ذمہ داری منتقل کرتے ہیں۔ اس رجحان نے ایک نئے تصور کو جنم دیا ہے جسے محققین Intelligent Parenting کا نام دے رہے ہیں یعنی ایسا طرزِ پرورش جو بڑھتی ہوئی حد تک ڈیٹا، خودکاری اور الگورتھمی رہنمائی پر انحصار کرتا ہے۔ والدین اب شیڈول بنانے، تعلیم دینے، نگرانی کرنے اور بچوں کے رویے پر نظر رکھنے کے لیے AI استعمال کر رہے ہیں اور یہ سب کچھ اکثر کارکردگی، تحفظ اور بہتر نتائج کے نام پر کیا جا رہا ہے۔ اگرچہ یہ ٹیکنالوجی بعض حوالوں سے سہولت فراہم کرتی ہے مگر اس کا حد سے زیادہ استعمال والدین کی جذباتی حساسیت، فطری ردِعمل اور اخلاقی بصیرت کو کمزور کرسکتا ہے جو کہ انسانیت پر مبنی پرورش کی بنیاد سمجھے جاتے ہیں۔

یہ مقالہ درج ذیل تحقیقی سوالات کی روشنی میں مرتب کیا گیا ہے:

* مصنوعی ذہانت والدین کے فیصلوں، اختیارات اور جذباتی وابستگی پر کس حد تک اثر انداز ہو رہی ہے؟
* AI پر مبنی ٹولز کے استعمال سے والدین کے رویوں میں کس نوعیت کی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں؟
* AI والدین کے کردار کو کہاں تک سہارا دے رہا ہے اور کہاں اسے بدل رہا ہے؟

اس مقالے کا مقصد والدین کے روزمرہ کے رویوں پر AI کے اثرات کا جائزہ لینا ہے اور خاص طور پر جذباتی (محبت پر مبنی) اور منطقی (AI سے متاثرہ) طرزِ پرورش کے درمیان پیدا ہونے والے تناؤ کا تجزیہ کرتا ہے۔ اس مقالے کے دائرہ کار میں موجودہ علمی لٹریچر کا جائزہ، والدین اور AI کے تصوری سانچوں اور رویوں کی وضاحت اور ابھرتے ہوئے اخلاقی، نفسیاتی اور سماجی خدشات پر تنقیدی بحث بھی شامل ہے۔

روایتی پرورش کے نظریات اور اسالیب کا جائزہ

پرورش ہمیشہ سے ہی نفسیات اور ارتقائی مطالعے کا ایک مرکزی موضوع رہا ہے جس کے ذریعے ماہرین نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ والدین کا طرزِ عمل بچوں کی نشوونما کو کس طرح متاثر کرتا ہے۔ روایتی نظریات والدین اور بچوں کے درمیان تعلقات میں جذباتی، رویہ جاتی اور ادراکی (Cognitive) پہلوؤں پر گہری روشنی ڈالتے ہیں—وہ پہلو جو اب مصنوعی ذہانت (AI) پر مبنی مداخلتوں کا سامنا کر رہے ہیں یا ان کی تکمیل کر رہے ہیں۔

1 **بومرائنڈ کا طرزِ پرورش (Baumrind's Parenting Styles)**: ڈائینا بومرائنڈ (1966, 1991) نے والدین کے طریقۂ پرورش کے تین بنیادی طریقوں — مقتدرانہ (Authoritative)، آمرانہ (Authoritarian) اور نرم گیر یا نرم دل (Permissive) کی نشاندہی کی ہے۔ بعد ازاں میکابی اور مارٹن (1983) نے چوتھے طریقے یعنی غافل یا غیر ملوث پرورش (Uninvolved / Neglectful) کا اضافہ کیا۔ یہ اسالیب بنیادی طور پر والدین کی گرمجوشی (Responsiveness) اور کنٹرول (Demandingness) کی سطح سے پہچانے جاتے ہیں۔ ذیل میں ان کی تفصیل پیش کی گئی ہے:

* **مقتدرانہ طرزِ پرورش (Authoritative)**: مقتدرانہ طرزِ پرورش وہ اندازِ پرورش ہے جس میں والدین نظم و ضبط کے اصولوں پر سختی سے کاربند ہوتے ہیں لیکن ساتھ ہی بچوں کے ساتھ محبت، شفقت اور مکالمے کو بھی اہمیت دیتے ہیں۔ ایسے والدین نہ صرف واضح حدود مقرر کرتے ہیں بلکہ بچوں کی رائے اور جذبات کا احترام بھی کرتے ہیں۔ یہ طرزِ پرورش توازن، رہنمائی اور اعتماد پر مبنی ہوتا ہے جس سے بچوں میں خود اعتمادی، ذمہ داری اور بہتر سماجی رویے فروغ پاتے ہیں۔
* **آمرانہ طرزِ پرورش (Authoritarion)**: آمرانہ طرزِ پرورش وہ طریقہ ہے جس میں والدین سخت گیر، حکم چلانے والے اور نظم و ضبط پر حد سے زیادہ زور دینے والے ہوتے ہیں۔ ایسے والدین بچوں سے مکمل اطاعت چاہتے ہیں لیکن ان کی

رائے، احساسات یا جذبات کو کم اہمیت دیتے ہیں۔ اس طرزِ پرورش میں گفت وشنید کی گنجائش کم ہوتی ہے اور والدین اکثر سزا کو تربیت کا اہم ذریعہ سمجھتے ہیں۔ نتیجتاً بچے ڈر، بے اعتمادی یا بغاوت جیسے رویّوں کا شکار ہو سکتے ہیں۔

* **نرم خو طرزِ پرورش:** نرم خو طرزِ پرورش وہ طریقہ ہے جس میں والدین بچوں پر بہت کم پابندیاں عائد کرتے ہیں اور ان سے زیادہ توقعات نہیں رکھتے۔ ایسے والدین عام طور پر بچوں کی ہر خواہش پوری کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور نظم و ضبط کے معاملے میں نرمی برتتے ہیں۔ اس طرز میں والدین محبت اور حمایت تو فراہم کرتے ہیں مگر حدود اور اصول قائم کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ نتیجتاً بچے خود مختاری تو حاصل کر لیتے ہیں لیکن ان میں نظم، ذمہ داری اور خود پر قابو پانے کی صلاحیت کم ہو سکتی ہے۔

* **لاپرواہ طرزِ پرورش یا غفلت آمیز طرزِ پرورش:** لاپرواہ طرزِ پرورش وہ انداز ہے جس میں والدین نہ بچوں کی جذباتی ضروریات پر توجہ دیتے ہیں اور نہ ہی ان کی نگرانی یا رہنمائی کرتے ہیں۔ ایسے والدین اکثر بچوں کی تعلیم، تربیت، جذبات اور روزمرہ مسائل سے لاتعلق رہتے ہیں۔ اس طرزِ پرورش میں محبت، توجہ اور نظم و ضبط تینوں کی کمی پائی جاتی ہے جس کے نتیجے میں بچے احساسِ محرومی، کم اعتمادی اور غیر صحت مند سماجی رویّوں کا شکار ہو سکتے ہیں۔

یہ طریقے آج بھی بچوں کی تربیت کے نتائج کو جانچنے کے بنیادی پیمانے سمجھے جاتے ہیں اور جدید علمی مباحث میں ان کا اثر نمایاں ہے۔

> **مصنوعی ذہانت (AI) اب کوئی محض تصوراتی یا مستقبل کی چیز نہیں رہی — بلکہ وہ خاندانی زندگی کا ایک لازمی اور سرگرم حصہ بن چکی ہے۔ اسمارٹ ٹیکنالوجی کی تیز رفتار ترقی نے گھریلو معمولات اور والدین و اولاد کے درمیان باہمی روابط کے طور طریقوں کو تبدیل کر دیا ہے۔ روزمرہ کے معمولات کی تنظیم سے لے کر اسکرین کے استعمال کی نگرانی تک AI نے خاندان کی زندگی میں ایک مستقل حیثیت حاصل کر لی ہے۔**

2. **انسلاک کا نظریہ (Attachment Theory):** یہ نظریہ جان باؤلبی (1969) نے پیش کیا اور میری آئنز ورتھ (1978) نے اسے وسعت دی۔ اس کے مطابق بچپن میں والدین یا نگہبان کے ساتھ قائم ہونے والا ابتدائی جذباتی تعلق بچے کی سماجی، جذباتی اور ادراکی نشوونما پر گہرا اثر ڈال سکتا ہے۔ اگر بچے کو ایک محفوظ انسلاک (Secure Attachment) میسر آ جائے یعنی والدین حساس، دستیاب اور بچے کی ضروریات سے ہم آہنگ ہوں — تو بچہ اعتماد، لچک اور جذباتی ذہانت جیسی خوبیاں سیکھتا ہے۔ اس کے برعکس، غیر محفوظ یا منتشر انسلاک (Insecure or Disorganized Attachment) بچوں میں اضطراب، خود سے لاتعلقی یا جارحانہ رویوں کو جنم دے سکتا ہے۔ یہ نظریہ اس حقیقت کو اجاگر کرتا ہے کہ والدین کی جذباتی موجودگی، حساسیت اور قربت بچے کی ابتدائی ترقی کے لیے کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔

3. **سیکھنے کا سماجی نظریہ (Social Learning Theory):** البرٹ بینڈورا (1977) کے مطابق بچے اپنے رویے، اقدار اور معاشرتی اصولوں کے مشاہدے، نقل اور نمونہ سازی (Modeling) کے ذریعے سیکھتے ہیں۔ اس نظریہ کے تحت والدین محض نگراں نہیں بلکہ فعال کردار ساز (role models) ہوتے ہیں جن کے عمل اور ردِعمل کو بچے شعوری اور لاشعوری طور پر اپنا لیتے ہیں۔ یہ نظریہ والدین کے طرزِ عمل کو نہ صرف جذباتی بلکہ ادراکی سرگرمی بھی قرار دیتا ہے جہاں پیار اور تعلق کے ساتھ ساتھ مسلسل سیکھنے کے مواقع، سزا و جزا کا توازن اور طرزِ زندگی کی مثال فراہم کرنا شامل ہوتا ہے۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ اب انہی عملوں کو AI پر مبنی نظام جیسے ورچوئل اسسٹنٹس اور ایجوکیشنل بوٹس کے سپرد کیا جا رہا ہے۔

4. **روایتی پرورش میں جذبات و منطق کا توازن:** روایتی نظریات اس امر پر متفق ہیں کہ مؤثر پرورش کی بنیاد انسانی تعلق، اخلاقی رہنمائی اور جذباتی ہم آہنگی پر ہوتی ہے۔ ایسے عناصر جیسے ہمدردی، پیار، حساسیت اور والدین کی دستیابی بچے کی شخصیت، سماجی مہارتوں اور خودداری کے فروغ میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ دوسری جانب منطقی پہلو — مثلاً ساخت، مستقل مزاجی، رویے کو مضبوط کرنا اور ذہنی نمونہ سازی — نظم و ضبط، تعلیمی کامیابی اور اخلاقی نشوونما کے لیے یکساں طور پر اہم ہیں۔ تاہم یہ منطقی عمل ہمیشہ انسانی تعلقات کے ذریعے اور ثقافتی و اخلاقی اقدار کے تناظر میں انجام پاتے رہے ہیں۔ مگر جب ان فرائض کو مصنوعی ذہانت پر مبنی آلات کے سپرد کیا جانے لگے تو یہ خدشہ پیدا ہوتا ہے کہ جذباتی قربت، اخلاقی گفتگو اور انسانوں پر مبنی رہنمائی کہیں پس پشت نہ چلی جائے۔ آج والدین AI کو شیڈول بنانے، نگرانی کرنے اور تعلیمی رہنمائی فراہم کرنے کے لیے استعمال کر رہے ہیں جس سے جذباتی تعلق کی شدت میں کمی کا خطرہ بڑھتا جا رہا ہے۔

گھریلو زندگی میں مصنوعی ذہانت کا ظہور

مصنوعی ذہانت (AI) اب کوئی محض تصوراتی یا مستقبل کی چیز نہیں رہی — بلکہ وہ خاندانی زندگی کا ایک لازمی اور سرگرم حصہ بن چکی ہے۔ اسمارٹ ٹیکنالوجی کی تیز رفتار ترقی نے گھریلو معمولات اور والدین و اولاد کے درمیان باہمی روابط کے طور طریقوں کو تبدیل کر دیا ہے۔ روزمرہ کے معمولات کی تنظیم سے لے کر اسکرین کے استعمال کی نگرانی تک AI نے خاندان کی زندگی میں ایک مستقل حیثیت حاصل کر لی ہے۔

1. **اسمارٹ گھروں، ڈیجیٹل معاونین اور بچوں کی نگرانی کی ایپلیکیشنز کا کردار:** ایمیزون الیکسا (Amazon Alexa)، گوگل نیسٹ اور ایپل سری (Apple's Siri) جیسے اسمارٹ گھریلو آلات نے مکالماتی مصنوعی ذہانت کو روزمرہ کی پرورش کا حصہ بنا دیا ہے۔ یہ ڈیجیٹل معاونین بچوں کے سوالات کے جوابات دینے، نیند سے قبل موسیقی چلانے، یاددہانی کرانے اور روشنی یا درجہ حرارت کو کنٹرول کرنے جیسے کاموں میں والدین کی مدد کرتے ہیں۔ اسی کے ساتھ بچوں کی نگرانی کے لیے استعمال ہونے والی ایپلیکیشنز اور GPS سے لیس پہننے کے قابل آلات والدین کو بچوں کی جائے وقوع، آن لائن سرگرمیوں اور ممکنہ خطرات سے متعلق اطلاعات فراہم کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ ٹیکنالوجی والدین کو سہولت اور ذہنی سکون مہیا کرتی ہے لیکن یہ والدین و اولاد کے تعلقات میں نگرانی کے عنصر کو متعارف کراتی ہے جس سے اعتماد، خود اختیاری اور رازداری سے متعلق اخلاقی سوالات جنم لیتے ہیں۔

2. **تعلیمی ٹیکنالوجی، AI اساتذہ اور اسکرین کے وقت پر قابو پانے کے آلات:** مصنوعی ذہانت نے تعلیمی ٹیکنالوجی (EdTech) کے شعبے کو نئی جہتیں عطا کی ہیں۔

Duolingo، Khan Academy اور Squirrel AI جیسے پلیٹ فارمز سیکھنے والوں کی کارکردگی کے مطابق مواد فراہم کرتے ہیں اور ان کی کمزوریوں کی بنیاد پر اضافی رہنمائی اور معاونت فراہم کرتے ہیں (Luckin et al., 2016)۔ ایسے AI اساتذہ اکثر ان والدین کے لیے ایک اہم سہارا بن جاتے ہیں جو وقت یا وسائل کی کمی کا سامنا کرتے ہیں۔ اسی طرح Google Family Link اور Apple Screen Time جیسے اسکرین مانیٹرنگ ٹولز والدین کو ایسی AI پر مبنی ڈیش بورڈز مہیا کرتے ہیں جن کے ذریعے وہ بچوں کے موبائل استعمال کی نگرانی، ایپلیکیشنز کی حد بندی اور ڈیجیٹل نظم و ضبط قائم کر سکتے ہیں۔ اگرچہ یہ ٹولز والدین کو اپنے بچوں کی ڈیجیٹل عادات پر قابو پانے کی سہولت دیتے ہیں تاہم ان کی وجہ سے تربیت میں انسانی مکالمے کی جگہ آہستہ آہستہ مشینی الگورتھمز لے رہے ہیں جس سے والدین اور بچوں کے مابین جذباتی گفت و شنید متاثر ہو سکتی ہے۔

3. **والدین کا الگورتھمی تجاویز پر انحصار:** والدین کے طرزِ عمل میں ایک نمایاں تبدیلی یہ دیکھنے میں آئی ہے کہ وہ مختلف گھریلو اور تربیتی فیصلوں میں اب مصنوعی ذہانت سے حاصل ہونے والی تجاویز پر انحصار کرنے لگے ہیں۔ نیند کے اوقات، غذائی منصوبہ بندی، تعلیمی مواد کے انتخاب اور نظم و ضبط کی حکمت عملیوں کے لیے والدین AI پر مبنی سسٹمز سے رہنمائی لیتے ہیں (Saxena et al., 2023)۔ YouTube Kids اور Netflix جیسے پلیٹ فارمز بچوں کی عمر اور دلچسپیوں کے مطابق مواد تجویز کرتے ہیں جس سے بچوں کی سوچ، رجحانات اور ذوق پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ اگرچہ یہ الگورتھمک امدادی نظام (algorithmic aids) بظاہر مفید معلوم ہوتا ہے لیکن اس کی بنیاد پر کام کرنے والے الگورتھمز اکثر 'بلیک باکس' کی حیثیت رکھتے ہیں یعنی والدین یہ نہیں جان پاتے کہ کس منطق پر یہ سفارش کی گئی ہے۔ یہ عدم شفافیت والدین کی فیصلہ سازی کے اختیار کو محدود کر سکتی ہے اور انسانی فہم و دانش کو مشینی منطق کے تابع بنا سکتی ہے۔

4. **ٹیکنو فیرنس (رشتوں میں مداخلت کرنے والی ٹیکنالوجی):** 'ٹیکنو فیرنس' (Technoference) ایک اصطلاح ہے جو اُن روزمرہ کی مداخلتوں کی طرف اشارہ کرتی ہے جو ڈیجیٹل ٹیکنالوجی کی وجہ سے انسانی روابط میں پیدا ہوتی ہیں۔ گھریلو سیاق و سباق میں اس کا مظاہرہ اس وقت ہوتا ہے جب والدین بچوں کے ساتھ تعلقات کے بجائے اپنی توجہ موبائل اسکرین یا دیگر آلات پر مرکوز رکھتے ہیں — جیسے کھانے کے دوران فون چیک کرنا، کھیل کے وقت پیغامات کا جواب دینا یا بچوں کو بہلانے کے لیے ڈیجیٹل آلات پر انحصار کرنا۔ تحقیقی مطالعے سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ بلند سطح کی ٹیکنو فیرنس والدین کی جذباتی حساسیت میں کمی، بچوں میں رویہ جاتی مسائل اور والدین و اولاد کے درمیان جذباتی بندھن کی کمزوری سے جُڑی ہوتی ہے (Radesky et al., 2015)۔

جیسے جیسے AI گھریلو معمولات میں تیزی کے ساتھ داخل ہو رہی ہے یہ خدشہ بڑھتا جا رہا ہے کہ مشینی سہولت پسندی انسانی محبت، توجہ اور باہمی تعلق کی جگہ لے لے گی۔

مصنوعی ذہانت کے دور میں محبت اور منطق

ٹیکنالوجی اور والدین کے مابین تعامل نے پرورش کے روایتی تصور اور اس کے عملی اطلاق میں ایک گہرا مگر نازک تغیر پیدا کیا ہے۔ اس تبدیلی کے مرکز میں 'محبت' اور 'منطق' کے درمیان کشمکش کارفرما ہے — والدین کے دو بنیادی پہلو جواب مصنوعی ذہانت (AI) کے عہد میں نئے سرے سے متعین اور تقسیم ہو رہے ہیں، وہ درج ذیل ہیں:

1. **والدین کی پرورش میں محبت کی ساخت:** روایتی طور پر والدین کی محبت گرمجوشی، ہمدردی، جسمانی قربت، جذباتی ردِعمل اور مسلسل موجودگی کے ذریعے ظاہر ہوتی ہے۔ یہی اوصاف بچوں میں محفوظ وابستگی، جذباتی توازن اور اعتماد پیدا کرتے ہیں (Bowlby, 1969؛ Ainsworth et al., 1978)۔ محبت فطری، تعلقاتی اور ارتقائی نوعیت کی حامل ہوتی ہے — اس میں بچے کی بدلتی ہوئی جذباتی ضروریات کو محسوس کرنا اور نرمی سے جواب دینا شامل ہے۔ محبت میں وہ لمحات بھی شامل ہوتے ہیں جب والدین خوشیوں میں شریک ہوتے ہیں، دکھ میں دلاسہ دیتے ہیں، خاموشی میں سکون دیتے ہیں اور اخلاقی و جذباتی نشوونما کی پرورش کرتے ہیں۔ یہ تمام عناصر ایسے ہیں جنھیں نہ ناپا جا سکتا ہے نہ خودکار بنایا جا سکتا ہے اور نہ ہی مشینی منطق کے ذریعے دہرایا جا سکتا ہے۔

2. **والدین کی پرورش میں منطق کی ساخت:** اس کے برعکس والدین کی منطق سے مراد وہ منظم اور مقصدی رویے ہیں جن میں معمولات کو قائم رکھنا، اصول بنانا، نتائج کا اطلاق کرنا اور نظام الاوقات مرتب کرنا شامل ہے۔ یہ طرزِ عمل کارکردگی، پیش بینی اور ذمہ داری کی تنظیم پر مبنی ہوتا ہے — وہ تمام میدان جن میں AI بہترین کارکردگی دکھاتی ہے۔ منطقی پرورش اکثر کھانے کے منصوبے، سونے جاگنے کے معمولات، تعلیمی نگرانی یا اسکرین کے استعمال کے ضوابط میں دکھائی دیتی ہے (Luckin et al., 2016)۔ اگرچہ یہ سرگرمیاں بچے کی علمی اور طرزِ عمل کی نشوونما میں معاون ہوتی ہیں لیکن ان کا مرکز زیادہ تر نظم و ضبط ہوتا ہے جذباتی قربت نہیں۔

3. **مصنوعی ذہانت کی وابستگی منطق سے ہے نہ کہ محبت سے:** مصنوعی ذہانت اپنی ساخت کے لحاظ سے منطق کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ ہے نہ کہ محبت کے ساتھ۔ یہ نظام بہتر نتائج، خودکار فیصلے اور ڈیٹا پر مبنی اقدامات فراہم کرتے ہیں لیکن ان میں وہ جذباتی بصیرت اور داخلی فہم شامل نہیں جو انسانی تعلقات کا خاصہ ہے۔ مثال کے طور پر:

* اسمارٹ اسپیکر بچوں کو دانت صاف کرنے کی یاددہانی تو کرا سکتے ہیں مگر جذباتی تسلی نہیں دے سکتے۔
* AI پر مبنی اساتذہ تعلیمی مواد کو بچے کی رفتار سے ہم آہنگ تو کر سکتے ہیں مگر کسی چھوٹی کامیابی پر سچی خوشی کا اظہار نہیں کر سکتے۔
* والدین کی نگرانی کی ایپس ڈیجیٹل رویے کی خلاف ورزیوں کی نشان دہی تو کر سکتی ہیں مگر بچے کی الجھن یا تکلیف سے ہمدردی نہیں رکھ سکتیں۔

AI کا یہ حد سے زیادہ جھکاؤ منطق کی جانب پرورش کو صرف نظم و نسق تک محدود کر دیتا ہے اور اُس جذباتی محنت کو نظر انداز کرتا ہے جو بچے کی شخصیت، ہمدردی اور جذباتی تحفظ کو پروان چڑھاتی ہے۔

4. **جذباتی پرورش اور الگورتھمی عقل کے درمیان کشمکش:** AI کے بڑھتے ہوئے استعمال نے جذباتی پرورش اور الگورتھمی عقل کے درمیان ایک نئی نوعیت کی کشمکش کو جنم دیا ہے۔ ایک جانب AI والدین کو جدید خاندانی زندگی کی پیچیدگیوں سے نمٹنے میں سہولت فراہم کرتی ہے، دوسری جانب یہ ایک ایسا طرزِ پرورش فروغ دیتی ہے جو جذباتی ربط کے بجائے کنٹرول، نگرانی اور کارکردگی کو ترجیح دیتا ہے۔ والدین رفتہ رفتہ جذباتی موجودگی کو بھی آؤٹ سورس کرنے لگتے ہیں — مثلاً سونے سے پہلے بچوں کو

کہانیاں سنانے کے بجائے ڈیجیٹل کہانیاں چلوائی جاتی ہیں یا گفت وشنید پر مبنی نظم و ضبط کے بجائے AI الرٹس پر انحصار کیا جاتا ہے۔ وقت کے ساتھ یہ رجحان تعلقات کی گہرائی کو کمزور کرسکتا ہے اور پرورش ایک مشینی لین دین میں بدل سکتی ہے۔ مزید برآں الگورتھمی نظام اس بات میں شفاف نہیں ہوتے کہ وہ کن ترجیحات کی بنیاد پر نتائج مرتب کرتے ہیں اور یہ ترجیحات اکثر خاندان کی ثقافتی اقدار، جذباتی اہداف یا اخلاقی نظریات سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ اصل چیلنج یہ ہے کہ AI منطق کی نقالی تو کرسکتی ہے، مگر محبت کی نہیں— اور محبت ہی وہ بنیادی عنصر ہے جو بچوں کو جذباتی طور پر صحت منداور سماجی طور پر ذمہ دار بنانے کے لیے ناگزیر ہے۔

مصنوعی ذہانت سے متاثرہ والدین کے طرز پرورش کا مجوزہ تصوراتی خاکہ

یہ سمجھنے کے لیے کہ مصنوعی ذہانت والدین کے کردار کو کس طرح بدل رہی ہے، ضروری ہے کہ ہم روایتی اقسام کے تحت آگے بڑھیں اور ایسا نیا تصوراتی خاکہ مرتب کریں جو AI کے استعمال، جذباتی شمولیت اور والدین کی حکمتِ عملی میں کنٹرول کے انداز کو جامع انداز میں واضح کرے۔ یہ خاکہ باؤمرائنڈ (Baumrind) جیسے کلاسیکی ماڈلز کی نفی نہیں کرتا بلکہ انھی بنیادوں پر تعمیر کرتے ہوئے یہ واضح کرتا ہے کہ والدین کے کردار کو کس طرح ڈیجیٹل ٹیکنالوجی نے سہارا دیا ہے یا کس حد تک اس کی جگہ لی ہے۔ یہ مجوزہ اقسام اس بات کی عکاسی کرتی ہیں کہ AI کس حد تک والدین کے معمولات اور ان کے تربیتی و پرورش کے طور طریقوں کو اثر انداز کر رہی ہے، والدین کی جذباتی موجودگی کس درجے پر ہے اور رہنمائی یا نگرانی کے غالب طریقے کیا ہیں۔ ہر طرز پرورش روایتی نگہبانی اور عصری ڈیجیٹل طور طریقوں کا ایک امتزاج پیش کرتا ہے۔

جدول 1: مصنوعی ذہانت سے متاثر والدین کے طرز عمل

طرز پرورش	AI کا استعمال	جذباتی شمولیت	کنٹرول کا طریقہ	نمائندہ آلات و ایپس
الگورتھمی نگہبانی	بلند	کم	ایپ پر مبنی	والدین کی نگرانی کی ایپس، GPS ٹریکرز
تقویت یافتہ مقتدرانہ	معتدل	بلند	AI کی رہنمائی کے ساتھ	اسمارٹ اسپیکرز، تعلیمی پلیٹ فارمز
ٹیکلو-درگزر کرنے کا طرز	بلند	غیر فعال	بچے کی قیادت پر مبنی	YouTube Kids، AI پر مبنی ویڈیوز
باشعور سائبرگ نگہبانی	متوازن	بلند	انسانی رہنمائی (شریک استعمال)	مشترکہ AI ٹولز، تعلیمی گیمز
بے تعلق ڈیجیٹل نگہبانی	نہایت بلند	نہایت کم	مکمل خودکار	ہوم کیمرے، AI بیبیز، خودکار یاددہانیاں

1. **الگورتھمی نگہبانی:** اس طرز پرورش کی نمایاں خصوصیات میں ٹیکنالوجی پر حد درجہ انحصار اور جذباتی شمولیت کی شدید کمی شامل ہے۔ والدین نگرانی، نظام الاوقات اور رویے کی تنظیم کو مکمل طور پر ایپس اور ڈیجیٹل آلات کے سپرد کردیتے ہیں۔ کنٹرول کا طریقہ کار مکالمے کے بجائے خودکار نظام پر مبنی ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ طریقہ کار موثر ہو سکتا ہے لیکن یہ والدین و بچوں کے درمیان اعتماد اور گرمجوشی کو مجروح کرسکتا ہے (Saxena et al.,2023)۔ مثال کے طور پر GPS ٹریکرز، اسکرین ٹائم کنٹرولرز اور AI پر مبنی نگرانی کے نظام کے ذریعے بچے کے رویے پر گفتگو کے بغیر قابو پانا۔

2. **تقویت یافتہ مقتدرانہ نگہبانی:** یہ طرز پرورش Baumrind کے مقتدرانہ ماڈل سے متاثر ہے اور اس میں AI کو محض ایک معاون آلہ سمجھا جاتا ہے نہ کہ جذباتی شمولیت کا نعم البدل۔ والدین AI کو سیکھنے میں مدد یا معمولات میں معاونت کے لیے استعمال کرتے ہیں لیکن جذباتی طور پر خود بھی موجود رہتے ہیں اور انسانی فہم و بصیرت سے بچے کی رہنمائی کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر اسمارٹ اسپیکر کے ذریعے گھریلو کام یا ہوم ورک میں مدد دینا لیکن ساتھ ساتھ روزانہ بات چیت اور جذباتی تبادلہ برقرار رکھنا (Lee et al., 2021)۔

3. **ٹیکلو-درگزر طرز نگہبانی:** یہ طرز پرورش روایتی 'درگزر' یا 'نرمی پر مبنی' نگہبانی کا ڈیجیٹل انداز پیش کرتا ہے جس میں بچوں کو AI پر مبنی مواد تک بلا روک ٹوک رسائی حاصل ہوتی ہے۔ یہ طرز عموماً سہولت یا تصادم سے بچاؤ کی خاطر اختیار کیا جاتا ہے۔ والدین کی شمولیت نہایت کم ہوتی ہے اور AI کو محض تفریح یا توجہ بٹانے والے ذریعے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر بغیر والدین کی نگرانی کے YouTube Kids یا Netflix جیسے پلیٹ فارمز پر بچوں کا گھنٹوں AI کی تجویز کردہ ویڈیوز دیکھنا (Radesky et al., 2015)۔

4. **باشعور سائبرگ نگہبانی:** یہ ایک ابھرتا ہوا طرز پرورش ہے جو AI اور انسانی موجودگی کے درمیان توازن قائم کرتا ہے۔ اس میں والدین ٹیکنالوجی کے استعمال میں بچوں کے ساتھ شریک ہوتے ہیں، مواد پر گفتگو کرتے ہیں اور تنقیدی سوچ کو فروغ دیتے ہیں۔ AI یہاں ایک باہمی طور پر سیکھنے کے آلے کے طور پر استعمال ہوتی ہے نہ کہ والدین کی جگہ لینے والی چیز کے طور پر۔ مثال کے طور پر تعلیمی ویڈیوز کو بچے کے ساتھ مل کر دیکھنا، AI چیٹ بوٹس کے ذریعے زبان سیکھنا اور بعد میں گفتگو کے ذریعے جذبہ ہمدردی اور فہم کو پروان چڑھانا۔

5. **بے تعلق ڈیجیٹل نگہبانی:** یہ الگورتھمی نگہبانی کی انتہا ہے جس میں والدین کی ذمہ داریوں کو مکمل طور پر خودکار نظام کے حوالے کردیا جاتا ہے— جیسے کھانے کی یاددہانی، نیند کی کہانی یا نظم و ضبط کا نظام سب AI کے ذمے۔ اس طرز پرورش میں جذباتی موجودگی نہ ہونے کے برابر رہ جاتی ہے اور یہ طرز اُن خاندانوں میں زیادہ عام ہوسکتا ہے جہاں وقت کی شدید قلت اور ٹیکنالوجی کا غلبہ ہو۔ مثال کے طور پر AI کیمرے کے ذریعے دور بیٹھ کر بچے کے رویے پر نظر رکھنا، مگر براہِ راست گفتگو نہ کرنا۔

یہ تصوراتی خاکہ بچے کی پرورش کے تصور کو AI کے دور میں نئے سرے سے ترتیب دیتا ہے— نہ کہ محبت کو منطق سے بدلنے کے طور پر، بلکہ ایک تسلسل کے طور پر جس میں شعوری انتخاب، اخلاقی آگہی اور جذباتی وابستگی شامل ہو۔ ان طریقوں کو سمجھ کر والدین اور پالیسی ساز بہتر طور پر اندازہ لگا سکتے ہیں کہ AI کے آلات بچوں کی نشوونما اور خاندانی تعلقات پر کس طرح اثر انداز ہو رہے ہیں۔

اخلاقی، نفسیاتی اور سماجی مضمرات

اگرچہ مصنوعی ذہانت والدین کے لیے بے شمار سہولیات فراہم کرتی ہے تاہم گھریلو زندگی میں اس کے بڑھتے ہوئے کردار نے کئی اہم اخلاقی، نفسیاتی اور سماجی خدشات کو جنم دیا ہے۔ یہ خدشات محض کارکردگی یا افادیت تک محدود نہیں بلکہ اس بنیادی سوال سے جڑے ہیں کہ ایک بچے کی پرورش کو انسانی، جذباتی طور پر حساس اور اخلاقی طور پر مضبوط انداز میں کیسے ممکن بنایا جاسکتا ہے۔

1. **بچے کی خودمختاری اور رازداری:** سب سے سنگین اور فوری نوعیت کا مسئلہ بچوں کی خودمختاری اور رازداری کا کم ہوتا ہوا دائرہ ہے۔ نگرانی پر مبنی ٹیکنالوجیز جیسے GPS ٹریکرز، AI بیبی مانیٹرز اور ڈیٹا اکٹھا کرنے والے تعلیمی ایپس بچوں کے لیے ایک مسلسل مشاہدے کا ماحول تشکیل دیتے ہیں۔ اگرچہ یہ آلات تحفظ کے نام پر فروخت کیے جاتے ہیں مگر حقیقت میں یہ بچوں کی خود انحصاری، اعتماد اور صحت مند نشوونما کے لیے درکار خطرہ مول لینے کے رویّوں کو محدود کر سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں کئی AI پر مبنی ایپس نابالغ بچوں سے بغیر اُن کی باقاعدہ رضامندی کی حساس معلومات جمع کرتی ہیں۔ یہ امر آگاہ رضامندی، ڈیٹا کے مالکانہ حقوق اور طویل مدتی ڈیجیٹل شناخت کے حوالے سے گہرے اخلاقی سوالات کو جنم دیتا ہے۔

2. **بچپن کا ڈیٹافائی ہونا اور پیش گوئی پر مبنی نگہبانی:** بچوں کی زندگیوں کو تیزی سے 'ڈیٹافائی' کیا جا رہا ہے — یعنی انھیں قابلِ پیائش اکائیوں میں تبدیل کر کے الگورتھمز کے ذریعے تجزیہ کیا جاتا ہے۔ نیند کے معمولات، سیکھنے کی رفتار، اسکرین کے استعمال کا دورانیہ حتیٰ کہ جذباتی اظہار بھی ریکارڈ کیے جاتے ہیں تاکہ والدین کو پیش گوئی پر مبنی معلومات فراہم کی جاسکیں۔ اگرچہ مقصد والدین کو بہتر فیصلے کرنے میں مدد دینا ہوتا ہے لیکن یہ تجزیے لاشعوری طور پر بچوں کو ان کے ماضی کے رویّوں کی بنیاد پر محدود کر سکتے ہیں، بجائے اس کے کہ انھیں ارتقاء، تبدیلی اور فطری انسانی ردِعمل کی آزادی دی جائے (Williamson et al., 2022)۔ اس عمل سے یہ خطرہ پیدا ہوتا ہے کہ بچے محض ڈیٹا سیٹ بن کر نہ رہ جائیں اور ان کی نشوونما کا فطری عمل متاثر ہو۔ والدین بھی اپنے بچوں کو ایک ہمدردانہ نگاہ سے دیکھنے کے بجائے الگورتھمی عینک سے دیکھنے لگتے ہیں۔

3. **فطری نگہبانی کی مہارتوں کا زوال:** جیسے جیسے والدین اپنی متعدد ذمہ داریاں AI کو سونپتے جا رہے ہیں مثلاً نیند کی یاد دہانی، تعلیمی معاونت یا رویّے کی اصلاح وغیرہ، ویسے ویسے وہ فطری نگہبانی کی مہارتیں کھوتے جا رہے ہیں جو انسانی تجربے، ثقافتی حکمت اور جذباتی شعور سے پروان چڑھتی ہیں۔ AI کی سہولت والدین کے اعتماد، ردِعمل کی حساسیت اور صبر کو غیر محسوس طریقے سے کمزور کر سکتی ہے (Morris, 2023)۔ وقت کے ساتھ الگورتھمی انحصار والدین کو بچوں کے غیر لفظی اشاروں، جذباتی اتار چڑھاؤ اور فطری تعاملات کے بارے میں بے حس کر سکتا ہے جو مربوط پرورش کے لیے نہایت ضروری ہوتے ہیں۔

4. مصنوعی ذہانت اور جذباتی دوری: مصنوعی ذہانت کی منطق پر مبنی ساخت بچے کی پرورش میں جذباتی لاتعلقی کو فروغ دے سکتی ہے۔ ایک چیٹ بوٹ ریاضی پڑھا سکتا ہے مگر جذباتی حوصلہ افزائی نہیں کر سکتا۔ ایک اسمارٹ اسپیکر یاد دہانی کرا سکتا ہے مگر ہمدردی کا جذبہ فراہم نہیں کر سکتا۔ جب روزمرہ کی نگہبانی میں AI بطور ثالث شامل ہو جاتی ہے تو خطرہ ہوتا ہے کہ جذباتی قربت کی جگہ محض مشینی کارکردگی حاصل کر لے (Radesky et al., 2015)۔ ایسے ماحول میں پلنے والے بچے تعلقات کی کمزوری، جذباتی وابستگی کی کمی اور جذباتی فہم میں فقدان کا شکار ہو سکتے ہیں۔ نتیجتاً ایک ایسا طرزِ پرورش جنم لیتا ہے جو عملی لحاظ سے مؤثر تو ہوتا ہے مگر جذباتی طور پر محروم۔

5. **ڈیپ فیکس، تحریف اور گمراہ کن غلط معلومات کا خدشہ:** مصنوعی ذہانت وسیع تر سماجی خطرات بھی پیدا کر رہی ہے۔ بچے اور والدین دونوں ہی ڈیپ فیکس، جھوٹی معلومات اور مصنوعی ذہانت سے تیار کردہ گمراہ کن مواد کا شکار ہو سکتے ہیں (West, 2019)۔ ذاتی نوعیت کے سفارشاتی نظام بچوں کو تعصب پر مبنی اور نقصان دہ یا نامناسب مواد کی طرف لے جا سکتے ہیں اور یہ سب کچھ 'مطابقت' کے پردے میں ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ بعض والدین سے متعلق ایپس یا ڈیجیٹل اثر و رسوخ رکھنے والے افراد تجارتی یا نظریاتی ایجنڈے کی ترویج کرتے ہیں اور والدین کو شعوری طور پر متاثر کرنے کے بجائے ان کے جذبات سے کھیلتے ہیں۔ اگر ڈیجیٹل خواندگی نہ ہو تو خاندان ایسے الگورتھمی استحصال کا شکار ہو سکتے ہیں جسے روکنا نہایت مشکل ہوتا ہے۔

یہ اخلاقی، نفسیاتی اور سماجی مضمرات اس بات پر زور دیتے ہیں کہ مصنوعی ذہانت کے ڈیزائن پر مبنی نقطہ نظر اختیار کیا جائے، مؤثر ضوابط تشکیل دیے جائیں اور والدین میں ڈیجیٹل فہم و فراست پیدا کی جائے۔ AI ایک قیمتی معاون ضرور بن سکتی ہے لیکن اسے ہرگز نگہبانی کے ان جذباتی، اخلاقی اور فطری پہلوؤں کی جگہ نہیں لینے دینا چاہیے — جو انسان کی حیثیت سے ہمارے سب سے اہم اور مقدس تجربات میں شامل ہیں۔

مصنوعی ذہانت کے دور میں والدین کے اہداف پر از سرِ نو غور

خاندانی زندگی میں مصنوعی ذہانت کے انضمام نے نگہبانی کے اہداف کو بنیادی سطح پر نئے سرے سے متعین کرنے کی ضرورت پیدا کر دی ہے۔ روایتی طور پر والدین کا مقصد ایسے بچوں کی پرورش کرنا تھا جو ذمہ دار، ہمدرد اور خودمختار ہوں مگر AI کے دور میں یہ اہداف زیادہ پیچیدہ ہو گئے ہیں۔ اب والدین کو انسانی اقدار اور مشینی منطق کے درمیان توازن قائم کرنا ہے تاکہ کارکردگی اور سہولت جذباتی گہرائی اور اخلاقی نشوونما کی قیمت پر نہ حاصل کی جائے۔

1. **انسانی اقدار اور مشینی منطق کے درمیان توازن:** AI سے بھرپور ماحول میں والدین کے لیے یہ فطری ہے کہ وہ وقت کی بچت، رویّوں کی نگرانی اور علمی ترقی کے لیے خودکاری اور ڈیٹا پر مبنی نظام پر انحصار کریں۔ تاہم پرورش کو ان انسانی اقدار پر قائم رہنا چاہیے جن میں ہمدردی، شفقت، صبر اور اخلاقی تفکر شامل ہیں — ایسے اوصاف جو مشینیں کبھی نقل نہیں کر سکتیں (Turkle, 2017)۔ اگرچہ AI معمولات کو منظم کرنے اور مشورے دینے میں معاون ہو سکتی ہے لیکن وہ اخلاقی سیاق، ثقافتی لطافت اور جذباتی حساسیت سے عاری ہے۔ لہٰذا AI کے دور میں نگہبانی شعوری طرزِ عمل کا تقاضا کرتی ہے یعنی یہ جاننا کہ کب AI کا استعمال مفید ہے اور کب ایک انسانی نگراں کی حیثیت سے جذباتی فہم و بصیرت کے ساتھ خود مداخلت کرنا ضروری ہے۔

2. **ڈیجیٹل ماحول میں بچوں کی جذباتی ذہانت کی پرورش:** چونکہ بچے اب ہر دن AI پر مبنی پلیٹ فارمز اور ڈیجیٹل معاونین سے تعامل کر رہے ہیں اس لیے ان میں جذباتی ذہانت (EQ) کو فروغ دینا نہایت اہم ہو گیا ہے۔ جذباتی ذہانت — جیسے خود آگاہی، ہمدردی، جذبات پر قابو پانے کی صلاحیت اور سماجی مہارتیں — صرف حقیقی انسانی تعاملات سے پروان چڑھتی ہیں نہ کہ اسکرین کے استعمال یا مشینی نقل سے (Goleman, 1995)۔ والدین کو چاہیے کہ وہ بچوں کے ساتھ رُوبرو گفتگو، مشترکہ کھیل، تنازعات کے حل اور جذباتی قصہ گوئی جیسے مواقع فراہم کریں تاکہ AI ٹیوٹرز یا ورچوئل اسسٹنٹس سے ہونے والے غیر جذباتی تعاملات کا توازن قائم ہو سکے (Radesky et al., 2020)۔ ڈیجیٹل دور میں EQ صرف ایک انفرادی خوبی نہیں بلکہ ایک ایسا حفاظتی ذریعہ ہے جو بچوں کو مشینی منطق کے غیر انسانی اثرات سے محفوظ رکھتا ہے۔

3. **کیا والدین کی کردار سازی روبوٹ جیسی ہوتی جا رہی ہے؟:** ایک نہایت

باریک مگر گہرا تغیر رونما ہو رہا ہے یعنی والدین خود بھی مشینی انداز اپنا رہے ہیں جیسے وہ AI کی منطق پر مبنی کارکردگی کی نقل کر رہے ہوں۔ جب والدین مکالمے، شفقت اور تجسس کے بجائے چیک لسٹ، اسکرین مانیٹرنگ ڈیش بورڈز اور خودکار ہدایات کو ترجیح دیتے ہیں تو وہ انسانی حساسیت کے بجائے مشینی رویے کی مثال قائم کرتے ہیں۔ بچے صرف وہی نہیں سیکھتے جو والدین کہتے ہیں بلکہ وہ بھی سیکھتے ہیں کہ والدین کیسے برتاؤ کرتے ہیں۔ اگر نگراں خود جذباتی طور پر غیر حاضر، آلات پر منحصر یا ہر وقت کثیرالجہتی (Multitasking) میں مصروف ہوں تو وہ بچوں کے سامنے ایسے تعلقات کو معمول بنا دیتے ہیں جو جذباتی طور پر کٹے ہوئے اور ڈیجیٹل ذرائع سے چلنے والے ہوتے ہیں۔ لہٰذا والدین کے اہداف پر نظرِ ثانی کا مطلب ہے کہ وہ شعوری طور پر خود کو عملی نمونہ بنائیں یعنی ہمدردی، توجہ اور اخلاقی فیصلے کی مثال بن کر — نہ کہ یہ سب محض ڈیجیٹل آلات کے سپرد کر دیں۔

4. **ڈیجیٹل اور جذباتی خلا کو پاٹنا:** AI کی معاونت سے چلنے والی نگہبانی کا سب سے بڑا چیلنج یہ ہے کہ وہ ڈیجیٹل-جذباتی خلا کو کیسے پُر کرے۔ اس کے لیے 'ڈیجیٹل جذباتی خواندگی' کو فروغ دینا ضروری ہے یعنی ایسی صلاحیت کہ انسان ٹیکنالوجی کو تنقیدی نظر سے دیکھ سکے اور اس کے ساتھ جذباتی موجودگی اور تعلق کی گہرائی کو برقرار رکھ سکے۔ والدین اس خلا کو درج ذیل طریقوں سے پُر کر سکتے ہیں:

* ٹیکنالوجی کا مشترکہ استعمال جیسے بچوں کے ساتھ مل کر دیکھنا، کھیلنا یا سیکھنا۔
* ڈیجیٹل تجربات پر بات چیت مثلاً انھوں نے کیا دیکھا یا سیکھا اور اس پر ان کے جذبات کیا تھے۔
* ڈیجیٹل مصروفیت کے وقت کے ساتھ ساتھ اس کے مقصد اور معیار پر بھی حدود کا تعین کریں۔
* بچوں کو سکھانا کہ وہ تحریک آمیز الگورتھمز کو پہچانیں اور جذباتی سچائی کو سوشل میڈیا کی سطحی مقبولیت پر ترجیح دیں۔

بالآخر AI کے عہد میں والدین کا مقصد ٹیکنالوجی کی اہمیت سے انکار نہیں بلکہ ٹیکنالوجی کے اندر انسانیت کو واپس لانا ہے۔

اختتامیہ اور مستقبل کے امکانات

خاندانی زندگی میں مصنوعی ذہانت (AI) کی آمد نے نگہبانی کے طور طریقوں میں ایک بنیادی تبدیلی پیدا کر دی ہے جس نے نگہداشت، اختیار اور جذباتی تعلق کے اظہار کے طریقوں کو نئے سرے سے متعین کیا ہے۔ اس مقالے میں یہ استدلال پیش کیا گیا کہ اگرچہ AI نگہبانی کے تنظیمی و علمی پہلوؤں جیسے نظام الاوقات، تعلیم اور نگرانی میں قابلِ قدر مدد فراہم کرتی ہے لیکن یہ جذباتی ذہانت اخلاقی لطافت اور تعلقاتی گہرائی سے محروم ہے جو ایک بچے کی صحت مند نشوونما کے لیے نہایت ضروری عناصر ہیں۔ اس مقصد کے لیے ایک تصوراتی خاکہ (Conceptual Typology) پیش کیا گیا جو AI سے متاثر نگہبانی کے مختلف اطوار کو اجاگر کرتا ہے جیسے الگوردمی، ٹیکنو-نرمی، معاون مقتدر اور باشعور سائبر نگہبانی۔ یہ خاکہ جذباتی شمولیت اور ٹیکنالوجی پر انحصار کے دائرے کو واضح کرتا ہے اور والدین، اساتذہ اور پالیسی سازوں کو موجودہ طرزِ عمل کا تنقیدی جائزہ لینے کا ایک نیا زاویہ فراہم کرتا ہے۔ اس پوری بحث کے مرکز میں 'محبت اور منطق' کے مابین ایک بنیادی کشمکش موجود ہے یعنی ایک طرف وہ جذباتی گرمی اور ہم آہنگی ہے جو روایتی نگہداشت کا خاصہ ہے اور دوسری طرف وہ کارکردگی اور یکسانیت ہے جو AI پر مبنی تکنیک کا خاصہ ہے۔ اگرچہ AI آلات معمولات اور فیصلوں کو بہتر انداز میں منظم کر سکتے ہیں لیکن اس بات کا خطرہ موجود ہے کہ والدین AI پر حد سے زیادہ انحصار کرنے لگیں، جس سے ان کی داخلی بصیرت اور ہمدردی کی صلاحیت دب سکتی ہے۔ اس چیلنج سے نمٹنے کے لیے آئندہ نگہبانی میں درج ذیل پہلو شامل ہونے چاہئیں:

* ایسی AI ڈیزائن پر زور دینا جو جذباتی ذہانت سے آراستہ ہو اور انسانی شفقت کی جگہ نہ لے بلکہ اس میں معاون ہو۔
* والدین کے لیے ڈیجیٹل خواندگی کی تربیت کرنا تاکہ وہ AI آلات کو تنقیدی، بااخلاق اور ذمہ دارانہ انداز میں استعمال کر سکیں۔
* نگہبانی کے اہداف پر ازسرِ نو غور کرنا تاکہ تعلق کی گہرائی، جذباتی نشوونما اور اخلاقی خودمختاری کو اولیت دی جا سکے۔

مستقبل میں قابلِ توجہ تحقیقی پہلو: AI پر مبنی نگہبانی کے اثرات کو مزید گہرائی سے سمجھنے کے لیے درج ذیل تحقیقی پہلو توجہ کے متقاضی ہیں:

* **خاندانی تعلقات پر طویل مدتی مطالعات:** ایسی تجرباتی تحقیق کی ضرورت ہے جو یہ جانچ سکے کہ طویل عرصے تک AI آلات کے استعمال سے بچوں میں جذباتی وابستگی، ہمدردی اور خاندانی ہم آہنگی کس حد تک متاثر ہوتی ہے۔
* **مختلف ثقافتوں میں AI کے استعمال کا تقابلی جائزہ:** نگہبانی کے اصول اور ڈیجیٹل رویے ثقافتی بنیادوں پر مختلف ہوتے ہیں۔ تقابلی مطالعات سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ مختلف ثقافتی اقدار AI سے متاثر نگہبانی کے اخلاقی و جذباتی اثرات کو کس طرح ڈھالتی ہیں۔
* **بچوں کے زاویہ نظر سے AI کا مطالعہ:** موجودہ ادب زیادہ تر بالغوں کے تجربات پر مرکوز ہے۔ بچوں کی آواز شامل کر کے، یعنی کہ وہ AI کو کیسے دیکھتے ہیں، ڈیجیٹل اسسٹنٹس پر کتنا اعتماد کرتے ہیں یا تکنیکی-مداخلت کو کس طرح محسوس کرتے ہیں، زیادہ جامع تصویر سامنے آ سکتی ہے۔
* **پالیسی سازی اور ضوابط:** نگرانی، ڈیٹا کی رازداری اور تحریف جیسے اخلاقی مسائل کے لیے مؤثر اور سخت قانونی فریم ورک درکار ہے تاکہ گھریلو سطح پر AI کے استعمال کو بچوں کے حقوق اور فلاح و بہبود کے ساتھ ہم آہنگ کیا جا سکے۔

نتیجتاً مصنوعی ذہانت کے دور میں نگہبانی کو ایک گہرے انسانی عمل کے طور پر برقرار رکھنا ہوگا جس کی بنیاد ہمدردی، جذباتی موجودگی اور اخلاقی تفکر پر ہو۔ AI موجودہ زندگی کی پیچیدگیوں کو سنبھالنے میں ضرور مددگار ثابت ہو سکتی ہے لیکن وہ کبھی محبت، داخلی بصیرت اور اخلاقی ذمہ داری کا متبادل نہیں بن سکتی۔ یہ وہ خوبیاں ہیں جو والدین اور بچے کے رشتے کی اصل شناخت ہیں۔ مستقبل کا اصل چیلنج AI کو مسترد کرنا نہیں بلکہ اس کے استعمال میں انسانیت کو دوبارہ شامل کرنا ہے۔

■

Prof. Naushad Husain
Principal, MANUU, College of Teacher Education
Shanti Nagar, Behind Holy Family School
Near Prakash Vidyalaya, Airport Road, Gandhi Nagar
Bhopal- 462036 (MP)
Mob.: 7063594144
noushadhusain@gmail.com

مصنوعی ذہانت کی افادیت اور اردو زبان و ادب کا فروغ

محمد شمیم اختر

مصنوعی ذہانت جیسا کہ نام سے ظاہر ہے انسانوں کے ہاتھوں تیار کردہ سوجھ بوجھ اور مسئلے حل کرنے کی صلاحیت ہے یعنی انسان کے ہاتھوں تیار کردہ ایسی عقل یا فہم جو مشینوں اور کمپیوٹر سسٹم میں پیدا کی جائے تاکہ وہ انسان کی طرح سوچ سکیں اور فیصلے کر سکیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ مصنوعی ذہانت کمپیوٹر سائنس کی وہ شاخ ہے جس کا مقصد ایسی مشینیں تیار کرنا ہے جو انسانوں کی طرح سوچ سکیں، سمجھ سکیں، سیکھ سکیں اور مسائل کا حل تلاش کر سکیں۔ مصنوعی ذہانت کا دائرہ صرف خودکار حساب کتاب یا ڈیٹا پروسیسنگ تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کا اصل ہدف انسانی دماغ کے تجزیاتی، تخلیقی، فہم و ادراک اور فیصلہ سازی کی صلاحیتوں کی نقل تیار کرنا ہے۔

مصنوعی ذہانت محض ایک ٹیکنالوجی نہیں بلکہ ایک ایسا نظریہ اور عملی نظام ہے جس میں ریاضی، منطق، شماریات، نفسیات، لسانیات اور کمپیوٹر سائنس کے مختلف پہلوؤں کو یکجا کیا گیا ہے۔ اس کی ایجاد نے جہاں زندگی کے مختلف شعبوں میں دلچسپی اور حیرت انگیزی کے عناصر نمایاں کیے ہیں وہیں تعلیم کے شعبے میں بھی اس کا استعمال ناگزیر ہوتا جا رہا ہے۔ AI پر مبنی ایسی بہت ساری ایپس ہیں جو طالب علموں کو سیکھنے کا طریقہ اور مختلف زبانوں میں مواد کو آسانی سے پڑھنے کی سہولت فراہم کرتی ہیں۔ یہ بڑی مقدار میں معلومات کو تیزی سے پروسیس کرتی ہیں اور اس کے ساتھ ہی روبوٹکس، اسپیس ریسرچ اور بایوٹیکنالوجی میں تحقیق کے نئے دروازے کھولتی ہیں۔

اسی طرح زبان کے لیے بھی مصنوعی ذہانت کا استعمال اب لازمی ہوتا جا رہا ہے۔ کہتے ہیں کہ زبان کسی بھی قوم کی تہذیب، ثقافت، تاریخ اور فکری ورثے کی آئینہ دار ہوتی ہے اور اردو زبان تو برصغیر کی مشترکہ تہذیب اور ادبی روایات کا گہرا عکس پیش کرتی ہے۔ مگر بدلتے وقت کے ساتھ، اس ڈیجیٹل دور میں زبانوں کی بقا اور فروغ جدید ٹیکنالوجی سے ہم آہنگ ہونے پر منحصر کرتا ہے۔ اس تناظر میں مصنوعی ذہانت ایک ایسا ذریعہ بن کر ابھری ہے جو اردو کی ترویج و اشاعت کے لیے نہ صرف مواقع فراہم کر سکتی ہے بلکہ اسے عالمی سطح پر نئی زندگی بھی دے سکتی ہے۔ یہ اردو ادب کو تخلیق، تحقیق، ترویج اور ترجمے کے نئے امکانات سے ہم کنار کر سکتی ہے۔ ماہرین کا تو کہنا ہے کہ مصنوعی ذہانت اردو زبان کے فروغ میں ایک انقلابی کردار ادا کر سکتی ہے بس شرط یہ ہے کہ ہم اس ٹیکنالوجی کو محض صارف کے طور پر نہیں بلکہ تخلیق کار اور اسے فروغ دینے والے کے طور پر استعمال کریں۔

اردو زبان کی ترقی و ترویج میں مصنوعی ذہانت کا کردار کئی پہلوؤں سے نمایاں ہے۔ ان میں ادبی مواد کی تخلیق میں مدد، تحقیق اور مطالعہ میں آسانی، خودکار ترجمہ اور لسانی رابطہ، سوشل میڈیا اور ڈیجیٹل اشاعت اور اردو کی تدریس میں جدید سہولیات وغیرہ شامل ہیں۔

مصنوعی ذہانت کی بدولت اردو رسم الخط، تلفظ اور معنی کو ڈیجیٹل پلیٹ فارمز پر مؤثر طریقے سے منتقل کرنا ممکن ہے۔ AI پر مبنی نیچرل لنگویج پروسیسنگ یعنی NLP ماڈلز اردو کی تحریر کو شناخت، ترجمہ اور صوتی صورت میں تبدیل کر سکتے ہیں، جس سے اردو مواد کو عالمی سطح پر انٹرنیٹ صارفین تک پہنچایا جا سکتا ہے، سرچ انجنز میں اردو کی نمائندگی بڑھ سکتی ہے اور اردو بولنے والے باآسانی موبائل اور کمپیوٹر پر اپنی زبان میں کام کر سکتے ہیں۔

مصنوعی ذہانت پر مبنی ٹولز کہانی، نظم، مضمون اور ڈرامہ وغیرہ لکھنے میں مصنف کو خیال اور ڈھانچہ فراہم کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ لکھنے والوں کے لیے موضوعات کے نئے زاویے اور خیالات مہیا کر سکتے ہیں۔ یہ ادب کے اسلوب کی نقل کر کے نئی تخلیقات پیش کر سکتی ہے اور اس طرح یہ سہولت نئے لکھنے والوں کو تحریک دے سکتی ہے اور اردو ادب کو نئے موضوعات سے مالا مال کر سکتی ہے اور نتیجتاً اس سے اردو مواد کی تخلیق میں بے پناہ اضافہ ہو سکتا ہے۔

مصنوعی ذہانت کے ذریعے اردو کے قدیم اور نایاب مخطوطات کو ڈیجیٹل شکل میں محفوظ کر کے ان پر تحقیق آسان کی جا سکتی ہے۔ اس کی مدد سے ہزاروں صفحات پر مشتمل کتابوں میں مطلوبہ حوالہ یا شعر فوری طور پر تلاش کیا جا سکتا ہے۔ مصنوعی ذہانت کے ذریعے کسی ناول، کہانی یا شاعری کے اسلوب، موضوعات اور لفظیات کا آسانی سے تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ نقادوں اور محققین کے لیے ایک نیا زاویہ بھی فراہم کر سکتی ہے۔

اسی طرح گوگل ٹرانسلیٹ، چیٹ جی پی ٹی جیسے پلیٹ فارمز پہلے ہی اردو کے ترجمے میں مصنوعی ذہانت کا استعمال کر رہے ہیں۔ مستقبل میں زیادہ ترقی یافتہ AI ماڈلز کے ذریعے اردو سے دیگر زبانوں میں اور دیگر زبانوں سے اردو میں فوری اور درست ترجمہ ممکن ہو سکے گا۔ عالمی سطح پر اردو ادب، صحافت اور تعلیمی مواد کی رسائی بڑھے گی۔ مختلف زبانوں کے درمیان لسانی رکاوٹیں کم ہوں گی اور اردو عالمی مکالمے کا حصہ بن پائے گی۔ اس کے علاوہ اس کے ذریعے مختلف شعرا کے کلام کو دنیا بھر کے قارئین تک پہنچایا جا سکتا ہے۔

مصنوعی ذہانت سے اردو زبان میں Speech-to-Text اور Text-to-Speech ٹیکنالوجی بھی بہتر ہو رہی ہے۔ اس کے ذریعے نابینا یا کمزور بصارت

والے افراد کے لیے آواز کے ذریعے اردو مواد تک رسائی آسان ہوسکتی ہے یعنی نابینا افراد کے لیے اردو ادب کو آواز کی شکل میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ قاری اپنی آواز میں بات کرے گا اور AI اسے خودکار طریقے سے تحریر میں تبدیل کردے گا۔ آن لائن لیکچرز، لیکچرز کے نوٹس اور آڈیو بکس کی خودکار تیاری، مختلف لہجوں اور بولیوں کو ڈیجیٹل شکل میں محفوظ کرنے جیسے اقدامات میں مصنوعی ذہانت سے کافی مدد مل سکتی ہے۔

مصنوعی ذہانت کے ذریعے اردو رسم الخط، خوشخطی اور پرانے مخطوطات کو ڈیجیٹائز کرکے نایاب کتب اور تاریخی دستاویزات کو بھی محفوظ کیا جاسکتا ہے۔ قدیم اردو مواد یا دھندلے متن کو نئے قاری کے لیے پڑھنے کے قابل بنایا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ خطاطی کے نئے ڈیزائن تخلیق کیے جاسکتے ہیں جو ڈیجیٹل آرٹ اور گرافکس میں استعمال ہوسکتے ہیں۔

مصنوعی ذہانت اردو لغت اور ذخیرۂ الفاظ کے لیے ایک انقلابی ٹیکنالوجی ہے۔ یہ نہ صرف موجودہ الفاظ کو بہتر طور پر محفوظ اور منظم کرسکتی ہے بلکہ نئے الفاظ کی تخلیق، قدیم الفاظ کی بازیافت اور الفاظ کے درست تلفظ کو عام کرنے میں بھی مددگار ہے۔ یوں اردو زبان کا دامن مزید وسیع اور ترقی یافتہ ہوتا چلا جائے گا۔ مصنوعی ذہانت پر مبنی یہ نظام لاکھوں اردو متن یعنی کتب، مضامین، اخبارات، سوشل میڈیا پوسٹس وغیرہ کا تجزیہ کرکے نئے الفاظ اور ان کے مختلف استعمالات سامنے لاسکتا ہے۔ ان الفاظ کو خودکار طور پر لغت میں شامل کرکے ایک زندہ اور ترقی پذیر لغت تیار کی جاسکتی ہے۔ ایک ہی لفظ کے مختلف معانی ہوسکتے ہیں، جیسے 'علم' کا مطلب سائنس بھی ہوتا ہے اور آگاہی، معلومات، واقفیت اور عرفان بھی۔ AI متن کے سیاق وسباق کے مطابق یہ بتاسکتا ہے کہ یہاں لفظ کا کون سا مطلب درست ہے۔

مصنوعی ذہانت پر مبنی ایپلی کیشنز اور اسمارٹ ٹیچنگ ٹولز اردو زبان سیکھنے میں بھی مددگار ثابت ہوسکتے ہیں۔ ایسے انٹرایکٹو چیٹ بوٹس تیار کیے جاسکتے ہیں جو طلبا سے اردو میں مکالمہ کریں۔ تلفظ کی درستگی کے لیے صوتی تجزیہ کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ ذاتی نوعیت کا نصاب تیار کیا جاسکتا ہے جو طالب علم سیکھنے کی رفتار اور ضرورت کے مطابق ہو۔

مصنوعی ذہانت پر مبنی ریڈنگ ایپس اور ای بکس اور آڈیو بکس نئی نسل کو اردو ادب کی طرف مائل کرسکتی ہیں۔ اس کے علاوہ سوشل میڈیا پر اردو شاعری اور اردو نثر کو زیادہ آسانی سے فروغ دیا جاسکتا ہے۔ خودکار سب ٹائٹلز اور ہیش ٹیگ تجزیہ کے ذریعے یہ مواد کی رسائی کو وسعت بخشتی ہے۔ اس کے علاوہ ویڈیوز، بلاگز اور پوڈکاسٹس کو دنیا بھر میں پہنچاتی ہے۔

آج اسکول اور کالج وغیرہ میں چیٹ جی پی ٹی اور دوسری اے آئی ٹیکنالوجی کا بڑے پیمانے پر استعمال ہو رہا ہے۔ روزنامہ انقلاب میں ستمبر 2024 میں شائع اُسید اشہر کے مضمون، مصنوعی ذہانت کے طلبہ پر 7 مثبت اور 7 منفی اثرات کے مطابق ''متعدد سروے میں انکشاف ہوا ہے کہ کم و بیش 44 فیصد طلبہ پروجیکٹ یا کسی اہم سبق کی تیاری میں چیٹ جی پی ٹی کا استعمال کرتے ہیں۔'' وہ لکھتے ہیں، ''اے آئی کی مدد سے ہر طالب علم اپنی مخصوص ضروریات کے مطابق تعلیمی مواد تیار کرسکتا ہے۔ اے آئی اس لحاظ سے بھی کارآمد ہے کہ اگر کوئی طالب علم بہت زیادہ ذہین نہیں ہے تو یہ ٹیکنالوجی اس کے سیکھنے کے حساب سے تعلیمی مشمولات تیار کرسکتی ہے۔ طلبہ کی زندگی میں اے آئی ایک اچھا آپشن بن کر ابھر رہا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اے آئی کی مدد سے تمام طلبہ پڑھائی کے راستے میں چیلنجز کو عبور کرتے ہوئے اور سیکھنے کی راہ میں پیچھے رہے بغیر آگے بڑھ سکتے ہیں۔ اے آئی کے استعمال کی وجہ سے طلبہ کے سیکھنے کا تجربہ بھی دلچسپ بن سکتا ہے مگر طلبہ کو ذہن نشین رہے کہ جس طرح ہر چیز کے فائدے ہوتے ہیں، اسی طرح نقصانات بھی ہوتے ہیں۔''

اب تو سپریم کورٹ میں بھی مختلف زبانوں کے ترجمے کے لیے مصنوعی ذہانت کی خدمات لی جارہی ہیں۔ حکومت کی پالیسیوں، پروگراموں، پیش رفتوں اور حصولیابیوں کے سلسلے میں پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کو اطلاعات کی ترسیل کے عمل میں مصروف حکومت ہند کی کلیدی ایجنسی، پریس انفارمیشن بیورو (پی آئی بی) میں 25 جولائی 2025 کو شائع ایک خبر کے مطابق کیس مینجمنٹ میں مصنوعی ذہانت (اے آئی) اور مشین لرننگ (ایم ایل) پر مبنی آلات کو نصب کیا جارہا ہے جن کا استعمال آئینی بنچ کے معاملات میں زبانی دلائل نقل کرنے میں ہو رہا ہے۔ عدالت عظمی انگریزی زبان سے 18 ہندوستانی زبانوں یعنی آسامی، بنگالی، گارو، گجراتی، ہندی، کنڑ، کشمیری، کھاسی، کونکنی، ملیالی، مراٹھی، نیپالی، اوڑیا، پنجابی، سنتھالی، تمل، تیلگو اور اردو میں فیصلوں کے ترجمے میں نیشنل انفارمیٹکس سینٹر (این آئی سی) کے ساتھ قریبی ہم آہنگی میں ان کا استعمال کررہی ہے۔ اے آئی اور ایم ایل پر مبنی ٹولز (آلات) کا استعمال سپریم کورٹ آف انڈیا کے ذریعے فیصلہ سازی کے عمل میں کیا جارہا ہے۔ خبر کے مطابق مصنوعی ذہانت پر مبنی ٹول، سپریم کورٹ پورٹل اسسٹنس ان کورٹ ایفیشینسی (ایس یو پی اے سی ای) جس کا مقصد مقدمات کی شناخت کے علاوہ نظیروں کی بہتر تلاش کے ساتھ مقدمات کے حقیقی میٹرکس کو سمجھنے کے لیے ایک ماڈیول تیار کرنا ترقی کے تجرباتی مرحلے میں ہے۔

اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل انتونیو گوتیرش نے بھی مصنوعی ذہانت کو انقلابی قدم قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ اس کی انقلابی صلاحیتوں سے کام لے کر پائیدار ترقی کو یقینی بنایا جاسکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ مصنوعی ذہانت ہماری دنیا اور زندگیوں کو تبدیل کررہی ہے اور اس سے پائیدار ترقی کے حصول کی سمت میں اقدامات کی رفتار تیز کی جاسکتی ہے۔

مصنوعی ذہانت کے جہاں بہت سارے فائدے ہیں تو وہیں اس کے استعمال کے ممکنہ خطرات اور چیلنجز بھی موجود ہیں۔ زبان وادب کے حوالے سے اس کا سب سے بڑا خطرہ لکھنے والوں کی تخلیقی صلاحیت کے متاثر ہونے کا ہے۔ ہر مصنف کا اپنا تخلیقی انداز ہوتا ہے، مصنوعی ذہانت کے استعمال سے وہ انفرادیت اور جدت ختم ہوسکتی ہے۔ تاہم اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہوگا کہ مصنوعی ذہانت کے تمام تر فوائد اور نقصانات کو پیش نظر رکھ کے اگر ہم اس کے مثبت پہلوؤں سے فائدہ اٹھائیں تو اردو زبان نہ صرف ڈیجیٹل دنیا میں ایک نمایاں مقام حاصل کرے گی بلکہ عالمی سطح پر اپنی ہمہ گیریت اور ادبی حسن کے ساتھ زیادہ مؤثر انداز میں متعارف ہوسکے گی۔ اس طرح مستقبل کا اردو ادب وہ ہوگا جس میں انسانی تخلیقی شعور اور مصنوعی ذہانت کی سائنسی بصیرت مل کر ایک نئی ادبی جہت کو جنم دیں گے۔

■

Dr. Md. Shamim Akhter
Jogabai Extension,
Jamia Nagar, Okhla
New Delhi - 110025
Mail id: shamimshah2@gmail.com
Mobile:9711252848

محمد آصف رضا

اردو زبان کا ڈیجیٹل چہرہ

بلاشبہ زبان محض اظہار خیال کا ذریعہ نہیں بلکہ تمدن کا آئینہ، ثقافت کا زینہ اور تہذیب کی معنوی روایت ہوتی ہے، جو قوموں کے احساسات و جذبات کی عکاسی کرتی ہے۔ اردو زبان، جس کی تشکیل و تعمیر مختلف تہذیبوں و ثقافتوں کے میل جول سے ہوئی تھی، وہی زبان آج ایک ایسے گردشِ ماہ و سال میں داخل ہو چکی ہے جہاں ڈیجیٹل دنیا نے اس کے لسانی خد و خال کو نئی سمت و رفتار عطا کی ہے۔ سوشل میڈیا کی برقی دنیا میں اردو محض الفاظ کا مجموعہ نہیں رہ گئی ہے بلکہ ایک تخلیقی اظہار، ایک صوتی و بصری تجربہ اور ایک نئی فکری ترنگ بن چکی ہے۔

اردو زبان کا یہ سفر جو کبھی دہلی اور لکھنؤ کی گلیوں، درباروں اور شعری نشستوں سے ہوتا ہوا طباعت کے میدان میں داخل ہوا تھا، آج ایک نئی دنیا کی ڈیجیٹل فضا میں سانس لے رہا ہے۔ اکیسویں صدی کا آغاز دنیا بھر میں ڈیجیٹل انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ جب موبائل فون عام ہوئے، انٹرنیٹ ہر ہاتھ تک پہنچا، اور سماجی رابطوں کے مختلف پلیٹ فارم وجود میں آئے، تو زبان کا ایک نیا چہرہ، ایک نیا روپ ابھرنے لگا۔ فیس بک، ایکس (ٹوئٹر)، انسٹاگرام، یوٹیوب، اور واٹس ایپ جیسے پلیٹ فارم اردو کو ایک زندہ، متحرک اور روزمرہ کی زندگی سے جڑی زبان میں تبدیل کر رہے ہیں۔ جہاں ایک طرف قدیم اور روایتی اسالیب دم توڑتے نظر آتے ہیں، وہیں دوسری طرف نئے طرزِ اظہار، نئے لہجے اور تازہ بیانیے جنم لے رہے ہیں۔ اب اردو کسی شہر، گلی، درسی کتاب یا مشاعرے تک محدود نہیں بلکہ اسکرین پر ٹائپ ہوتی، ہیش ٹیگز میں مقید ہوتی، میمز میں ہنستی، اور ویڈیوز میں بولتی ہوئی سنائی دیتی ہے۔

سوشل میڈیا نے اردو زبان کو ایک نئی جہت بخشی ہے، جہاں اب یہ صرف تحریری یا رسمی زبان نہیں رہی، بلکہ آواز، لہجے، چہرے کے تاثرات اور بصری انداز کا حصہ بن چکی ہے۔ لکھنؤ کی تہذیبی اردو، حیدرآباد کا مخصوص لب و لہجہ، پٹنہ کی سادہ بیانی اور بے ساختہ انداز، یا ممبئی کی تیز رفتار شہری بولی.... یہ سب سوشل میڈیا پر ایک ساتھ جلوہ گر ہو کر اردو کی وسعت و تنوع کو اجاگر کرتے ہیں۔ ان شہروں کی زبان میں نہ صرف الفاظ کا فرق ہے بلکہ اظہار کا ایک مخصوص مزاج بھی ہے جو اب ویڈیوز اور آڈیو پیغامات کے ذریعے پوری دنیا تک پہنچ رہا ہے۔ گویا سوشل میڈیا نے زبان کو رسمی اور روایتی انداز سے الگ، زندہ اور متحرک بنا دیا ہے۔ اب اردو صرف بولی نہیں جاتی، بلکہ دیکھی اور سنی بھی جاتی ہے۔

ادب کی دنیا میں اسلوب کی حیثیت روح کی ہوتی ہے۔ سوشل میڈیا نے اردو کے اسلوب کو نئی لے، نیا آہنگ، اور نیا زاویہ عطا کیا ہے۔ روایتی اسلوب جہاں تشبیہات، استعارات، اور صنائع بدائع سے آراستہ ہوتا تھا، وہیں موجودہ اسلوب میں سادگی، براہِ راست اظہار، طنز و مزاح، اور عوامی لہجہ غالب آ چکا ہے۔ مختصر جملے، جذباتی علامات، اور روزمرہ محاورات اب اردو کے اسلوب کا جزو لاینفک بن چکے ہیں۔

سوشل میڈیا نے اردو زبان کو صرف تحریری سطح پر نہیں بلکہ جذباتی اور صوتی اظہار کے ایک نئے دور میں داخل کر دیا ہے۔ اب الفاظ کے ساتھ ساتھ علامات، وقفے، آوازوں کی نمائندہ تحریریں بھی اردو اظہار کا حصہ بن چکی ہیں۔ صارفین جملے کی ساخت کو اس طرح ترتیب دیتے ہیں کہ وہ محض معلوماتی نہ رہیں، بلکہ ایک جذبہ، ایک کیفیت، اور ایک تجربہ بن جائیں۔

مثال کے طور پر جب کوئی لکھتا ہے: ''تم یاد بہت آتے ہو...'' یا ''کیا بات ہے!!''، ''تو''... ''اور''!!'' جیسی علامات محض رسم الخط نہیں بلکہ جذبات کا اظہار بن جاتی ہیں۔ ان کے بغیر جملہ شاید سادہ اور سپاٹ محسوس ہو، مگر ان کی موجودگی جملے کو زندگی اور اظہار کی شدت عطا کرتی ہے۔ اسی طرح "uff"، "haye"، "ufff"، "arey wah" جیسے الفاظ لکھنے والے کے احساسات کو قاری تک صوتی انداز میں منتقل کرتے ہیں، گویا زبان بولی نہیں جا رہی، بلکہ سنائی دے رہی ہے۔

یہ تمام عناصر اس بات کی دلیل ہیں کہ اردو زبان اب محض الفاظ تک محدود نہیں رہی۔ سوشل میڈیا نے اسے ایک ہمہ گیر، جذباتی اور بصری اظہار میں ڈھال دیا ہے، جہاں زبان صرف لکھی نہیں جاتی بلکہ محسوس کی جاتی ہے۔

سوشل میڈیا پر اردو کا سب سے زیادہ نمایاں ہوتا ہوا رومن رسم الخط ہے جس کا چلن بڑھتا جا رہا ہے۔ اگرچہ اس سے زبان کا دائرہ وسیع ہوا ہے، مگر ساتھ ہی یہ اردو کے اصل رسم الخط کے لیے خطرے کی گھنٹی بھی ہے۔

رومن اردو صوتی اور فوری اظہار کو آسان بناتی ہے، مگر یہ املا، معنی اور لسانیات میں ابہام پیدا کرتی ہے۔

زبان کی ساخت جب جدید ٹیکنالوجی اور ڈیجیٹل میڈیا کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوتی ہے تو اس میں اختصار، سہولت، اور رفتار جیسے عناصر در آتے ہیں۔ اردو زبان بھی اس تبدیلی سے مستثنیٰ نہیں رہی اور اردو میں بھی یہی مظاہر دیکھنے کو ملے۔ روایتی جملے کی ترکیب، فعل و فاعل کی ترتیب، اور نحوی اصول اکثر مختصر، برقی اور اظہاریت پسند اسالیب کے تابع ہو چکے ہیں۔ اس تبدیلی کا سب سے واضح اظہار سوشل میڈیا، میسجنگ ایپس اور انٹرنیٹ کی زبان میں نظر آتا ہے۔ جیسے:

"Kya haal Hai?"

"tum kab aaoge?"

"kyun pareshan ho?"

"main busy hoon?"

آج کل اردو بولنے اور لکھنے والے سہولت اور جلد بازی کو ترجیح دیتے ہیں، خاص طور پر نوجوان نسل جو ٹیکنالوجی کے تیز رفتار دور میں پروان چڑھی ہے۔ یہ انداز اب نہ صرف روزمرہ کی زبان میں رائج ہے بلکہ مکمل خیالات اور احساسات کے مؤثر اظہار کا ذریعہ بھی بن چکا ہے۔ یہ جملے اپنی سادگی اور مختصر ہونے کی وجہ سے فوری افہام و تفہیم فراہم کرتے ہیں، جو خاص طور پر آن لائن گفتگو میں بے حد کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔

یہ جملے اب نہ صرف عام ہو چکے ہیں بلکہ مکمل فکری اظہار کا ذریعہ بن چکے ہیں۔ جملوں میں economy of language کا رجحان بڑھا ہے، یعنی کم الفاظ میں زیادہ اظہار۔ اس کے نتیجے میں بعض اوقات جملوں کا روایتی حسن مجروح ہوتا ہے، مگر نئی تاثیر پیدا ہوتی ہے۔

اس تبدیلی کے چند پہلو زبان کے روایتی حسن سے مختلف ضرور ہیں۔ مختصر جملے، کہیں کہیں نحوی قواعد کی خلاف ورزی کرتے نظر آتے ہیں، اور بعض اوقات ادبی اور فنی خوبصورتی کا وہ اثر نہیں رہتا جو کلاسیکی اردو میں پایا جاتا تھا۔ لیکن اس کے بدلے میں ایک نئی زبان کی تاثیر اور رفتار پیدا ہوتی ہے، جو سماجی روابط اور معلومات کے تبادلے کو تیز اور مؤثر بناتی ہے۔ اس میں اظہار کی طاقت تو ہے ہی، ساتھ ہی یہ زبان آسان اور عوامی ہو جاتی ہے، جس سے اس کی رسائی وسیع ہوتی ہے۔

مزید برآں، اس زبان میں ٹرانسلٹریشن یعنی اردو کے الفاظ کو رومن حروف میں لکھنے کا رواج بھی بڑھا ہے، جو ڈیجیٹل ٹائپنگ میں سہولت کے ساتھ ساتھ نوجوانوں میں مقبولیت کا باعث بنا ہے۔ اس طرح کے جملے زبان کے ارتقاء کی نمائندگی کرتے ہیں جو زبان کو زندگی بخشنے کے لیے نئے اصول اور اسلوب اپنا رہے ہیں۔

اس پورے عمل میں ایک تخلیقی تسلسل نظر آتا ہے، جہاں زبان اپنی جڑوں سے جڑے رہتے ہوئے بدلتے ہوئے ماحول اور معاشرتی رویوں کے مطابق خود کو ڈھال رہی ہے۔ یہ ارتقائی عمل محض تبدیلی نہیں بلکہ

سوشل میڈیا نے اردو زبان کو صرف تحریری سطح پر نہیں بلکہ جذباتی اور صوتی اظہار کے ایک نئے دور میں داخل کر دیا ہے۔ اب الفاظ کے ساتھ ساتھ علامات، وقفے، آوازوں کی نمائندہ تحریریں بھی اردو اظہار کا حصہ بن چکی ہیں۔ صارفین جملے کی ساخت کو اس طرح ترتیب دیتے ہیں کہ وہ محض معلوماتی نہ رہیں، بلکہ ایک جذبہ، ایک کیفیت، اور ایک تجربہ بن جائیں۔

ایک تخلیقی تسلسل ہے جو اردو کو نئی نسل سے جوڑتا ہے اور اسے زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ کرتا ہے۔

یوں کہا جا سکتا ہے کہ اردو زبان کا یہ ڈیجیٹل اور ٹیکنالوجی سے متاثر چہرہ، زبان کی فہم، اظہار اور تیز تر مواصلات کے تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش ہے۔ یہ زبان کو نہ صرف زندہ اور فعال رکھتا ہے بلکہ اسے وسیع تر مخاطبین تک پہنچانے کا ذریعہ بھی بنتا ہے۔ اس جدت کے باوجود، ضروری ہے کہ ہم زبان کی تہذیبی و ادبی قدر کو بھی سمجھیں اور اس کے تخلیقی توازن کو برقرار رکھیں تا کہ اردو کی خوبصورتی اور معیار متاثر نہ ہو۔

اس تناظر میں، زبان کی یہ نئی ساخت اور اظہار کے انداز اگرچہ روایتی اصولوں سے کچھ حد تک ہٹ کر ہیں، مگر یہ اردو زبان کی بقا، وسعت، اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگی کا ایک لازمی حصہ ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ روایتی اردو کو چھوڑ دیا جائے بلکہ دونوں انداز میں توازن قائم رکھا جائے تا کہ اردو ایک زندہ، مؤثر، اور عالمی زبان کے طور پر ترقی کرے۔

آن لائن رسائل، واٹس ایپ اور فیس بک گروپس، اردو بلاگز، پوڈکاسٹ، اور ڈیجیٹل مباحثے، مشاعرے اب اردو ادب کا حصہ بن چکے ہیں۔ یہ نئے ذرائع ادب کی جمالیاتی وسعت، تجرباتی تنوع، اور قارئین کی شمولیت کو بڑھا رہے ہیں۔ ایک وقت تھا جب مشاعرہ سننا یا افسانہ پڑھنا صرف کتاب یا مجلس کے ذریعے ممکن تھا، مگر اب ہر سوشل میڈیا استعمال کرنے والا بیک وقت سامع بھی ہے، قاری بھی، اور بعض اوقات خود تخلیق کار بھی۔ اس طرح ادب کا منظر نامہ محض کتابوں کی دنیا تک محدود نہیں رہا، بلکہ اب یہ موبائل کی اسکرین پر بھی زندہ و متحرک ہے۔

ڈیجیٹل طور پر اردو لکھنے والوں کو مختلف رجحانات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: قدیم روایتی اسلوب پر قائم افراد، صرف رومن اردو استعمال کرنے والے، ہائبرڈ (اردو + انگریزی/ ہندی) لکھنے والے، اور طنز و مزاح سے بھرپور انداز meme-based انداز اپنانے والے۔ ان سب رجحانات نے اردو کو ایک کثیر لسانی، کثیر اسلوبی اور کثیر تہذیبی اظہار میں بدل دیا ہے۔ ہر طبقے کا اظہار مختلف ہے مگر جڑیں اردو زبان سے جڑی ہیں۔

اس منظر نامے میں کچھ پہلو ایسے بھی ہیں جو باعثِ تشویش ہیں، جیسے اردو رسم الخط کا تدریجی زوال، زبان کا ساختیاتی و اسلوبیاتی سطح پر انتشار، معیار زبان کے تعین کا فقدان اور تفریح و ادب کے درمیان تحدیدی روایات کا خاتمہ۔ گویا نسل نو کو اردو محاورات، ضرب الامثال اور کلاسیکی ادب سے وہ برقرار نہیں رہی۔ جو ماضی میں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان پہلوؤں سے اردو زبان کی لسانی شناخت اور علمی وقار پر سوالات اٹھنے لگے ہیں۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ اساتذہ، ادیب، محققین اور زبان شناس اس تناظر میں ایک منظم حکمتِ عملی اپنائیں تا کہ زبان کا یہ ارتقائی سفر صرف سطحی

نہ رہے بلکہ فکری و تہذیبی اعتبار سے بھی مستحکم ہو۔

اس کے برخلاف، سوشل میڈیا نے کئی مثبت امکانات بھی پیدا کیے ہیں جیسے عالمی سطح پر اردو کے فروغ کی نئی راہیں کھلی ہیں، ہر فرد کو اظہار کی آزادی اور مواقع میسر آئے ہیں، اور نئے طرزِ اظہار، اصناف اور اسالیب کی تشکیل نے اردو زبان کو زیادہ ہمہ گیر بنا دیا ہے۔ اس کے ذریعے اردو ایک عالمی تہذیبی مکالمے کا حصہ بنتی جا رہی ہے۔ اردو زبان کا دائرہ اثر اب محض برِصغیر کے ممالک — ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش — تک محدود نہیں رہا، بلکہ سوشل میڈیا اور ڈیجیٹل ذرائع ابلاغ نے اسے ایک عالمی زبان کے طور پر متعارف کرایا ہے۔ وہ زبان جو کبھی صرف دہلی، لکھنؤ، لاہور یا حیدرآباد دکن کے علمی و ادبی حلقوں میں زندہ تھی، آج وہی زبان خلیجی ممالک، یوروپ، شمالی امریکا، افریقہ، ترکی، اور وسط ایشیائی ریاستوں میں نہ صرف سمجھی جاتی ہے بلکہ بولی، لکھی اور سنی بھی جا رہی ہے۔

سوشل میڈیا نے زبان کی جغرافیائی سرحدوں کو ختم کر دیا ہے۔ آج ایک نوجوان اگر یوکرین، ترکی یا کینیڈا میں بیٹھ کر اردو زبان میں کوئی ٹویٹ کرے، تو وہ لمحوں میں دہلی، لندن، دبئی، یا نیویارک میں پذیرائی حاصل کر لیتا ہے۔ ویڈیوز، آڈیوز، میمز، اور انسٹاگرام ریلز اردو زبان کو ایک ایسی لچک دے رہے ہیں جس کی بدولت یہ زبان صرف قومی اظہار نہیں بلکہ ایک عالمی ثقافتی مظہر بنتی جا رہی ہے۔

خلیج میں کام کرنے والے برصغیر کے لاکھوں محنت کش ہوں، یا یوروپ و امریکا میں مقیم اردو بولنے والے طلبا، اساتذہ، فنکار اور مصنفین — سب نے اپنی ثقافت اور زبان کو زندہ رکھنے کے لیے سوشل میڈیا کا سہارا لیا ہے۔ ان کی بدولت اردو اب محض ایک 'روایتی' زبان نہیں بلکہ ایک "عالمی برانڈ" بن چکی ہے، جو لندن کے اردو اخبار سے لے کر کینیڈا کے اردو پوڈکاسٹ تک ہر جگہ موجود ہے۔

یہ وسعت صرف تحریری اظہار تک محدود نہیں، بلکہ اردو کی سمعی و بصری موجودگی بھی دنیا بھر میں محسوس کی جا رہی ہے۔ یوٹیوب پر اردو ولاگرز، انسٹاگرام پر اردو شاعری کی ویڈیوز، اور فیس بک پر اردو مزاحیہ کلپس — یہ سب اردو کو ایک نئی زندگی دے رہے ہیں۔ جہاں پہلے اردو کی شناخت صرف ادب یا شاعری تک محدود

سوشل میڈیا اگرچہ زبان کی ساخت، معیار اور روایت کے لیے کچھ چیلنجز پیدا کرتا ہے، لیکن یہی وہ پلیٹ فارم ہے جو اردو کو نئی وسعت، نئی توانائی اور نئے مخاطبین عطا کرتا ہے۔ ہاں مگر، اگر ہم اس تبدیلی کو تنقیدی شعور، ادبی بصیرت اور لسانی حکمت کے ساتھ سمجھیں، تو اردو ایک نئی عالمی اور عصری زبان کے طور پر ابھر سکتی ہے — ایسی زبان جو روایت سے جڑی ہو، مگر جدیدیت سے آشنا بھی ہو۔

تھی، اب وہ سیاست، مزاح، تعلیم، اور مذہبی جیسے متنوع موضوعات پر بھی ڈیجیٹل سطح پر موجود ہے۔

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ سوشل میڈیا نے اردو زبان کو عالمی منظرنامے پر ایک نئی شناخت دی ہے۔ اب اردو صرف ایک 'قومی' زبان نہیں، بلکہ ایک بین الاقوامی ثقافتی آواز ہے۔ ایک ایسی آواز لکھنؤ کی گلیوں سے لے کر لندن کے کیفے، اور دہلی کی یونیورسٹیوں سے لے کر دبئی کے دفاتر تک سنائی دیتی ہے۔

اردو کا یہ نیا عالمی چہرہ نہ صرف اس کی اہمیت کو بڑھاتا ہے بلکہ اس کے مستقبل کے امکانات کو بھی روشن بناتا ہے۔ اب اردو سیکھنے، بولنے اور سمجھنے والے صرف برصغیر کے باشندے نہیں، بلکہ دنیا بھر کے وہ لوگ ہیں جو اردو کے ذریعے ایک جذباتی، تہذیبی اور ادبی رشتہ قائم کرنا چاہتے ہیں۔ سوشل میڈیا نے اردو کو نہ صرف زندہ رکھا ہے بلکہ اسے ایک ہمہ گیر عالمی زبان بنا دیا ہے، جو وقت کے ساتھ مزید پھیلتی جا رہی ہے۔

غرض یہ کہ اردو زبان کا یہ ڈیجیٹل روپ اس کے فکری، ادبی اور تہذیبی تسلسل کا ایک زندہ اور متحرک اظہار ہے، جو نہ صرف زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہے بلکہ نئی نسل کے تخلیقی ذوق سے بھی جڑا ہوا ہے۔ سوشل میڈیا نے اردو کو محض ایک روایتی زبان کے درجے سے نکال کر ایک عالمی، کثیرالمتن اور بصری و سمعی اظہار میں تبدیل کر دیا ہے۔ اب اردو صرف لکھی یا بولی نہیں جاتی، بلکہ دیکھی، سنی اور محسوس کی جاتی ہے۔ اس ڈیجیٹل منظرنامے میں لہجے، تلفظ، ایموجی، صوتی تاثرات اور علامتی طریقۂ اظہار سب مل کر اردو کو ایک نئی اور نسبتاً تازہ جہت فراہم کرتے ہیں۔

یہ ارتقا کوئی وقتی یا سطحی تبدیلی نہیں بلکہ ایک گہرا تخلیقی تسلسل ہے، جو اردو کو صرف محفوظ نہیں کر رہا بلکہ اسے وسعت بھی دے رہا ہے۔ مختلف خطوں، ثقافتوں اور طبقات سے تعلق رکھنے والے افراد جب سوشل میڈیا پر اردو کے ذریعے اظہارِ خیال کرتے ہیں، تو وہ زبان کے دائرہ اثر کو عالمی سطح پر پھیلاتے ہیں۔

سوشل میڈیا اگرچہ زبان کی ساخت، معیار اور روایت کے لیے کچھ چیلنجز پیدا کرتا ہے، لیکن یہی وہ پلیٹ فارم ہے جو اردو کو نئی وسعت، نئی توانائی اور نئے مخاطبین عطا کرتا ہے۔ ہاں مگر، اگر ہم اس تبدیلی کو تنقیدی شعور، ادبی بصیرت اور لسانی حکمت کے ساتھ سمجھیں، تو اردو ایک نئی عالمی اور عصری زبان کے طور پر ابھر سکتی ہے — ایسی زبان جو روایت سے جڑی ہو، مگر جدیدیت سے آشنا بھی ہو۔

حوالہ جات

1 شمس الرحمٰن فاروقی، 'اردو کا ابتدائی زمانہ'، دہلی، 1999
2 وزیر آغا، 'نئے تناظر'، انجمن ترقی اردو، دہلی، 1979
3 گوپی چند نارنگ، 'ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات'، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، 2004
4 ڈاکٹر گیان چند جین، لسانی مطالعے، قومی کونسل برائے فروغ زبان، نئی دہلی 2023
5 پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین، 'سوشل میڈیا اور اردو زبان'، مضمون، ریختہ
6 شان الحق حقی، اردو زبان کی رومن املا، اردو نامہ، بابت اپریل تا جون 1960
7 ڈاکٹر سہیل بخاری، اردو کی کہانی، لاہور، 1975
8 ہارون خان شروانی، اردو رسم خط اور طباعت
9 نصابی کتب جرنلزم اینڈ ماس کمیونیکشن مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد
Sturtevant, Linguistic change, Chicago, 1961 (بحوالہ لسانی مطالعے)
10 Irfan Khan,. "Digital Urdu :The Evolution of Script and Style in the Age of Social Media", International Journal of Linguistic Studies, Vol. 12, No. 3, 2022.
11 Nishat Shaheen. "Language Mixing in Urdu Social Media Communication", Journal of Language and Society, 2021

■

Md. Asif Raza
Maulana Azad National Urud University
Sambhal Campus
Sambhal (UP)
Mob.:9808767659
noorimiyan92@gmail.com

دورِ حاضر میں پریم چند
مطالعہ کی نئی جہتیں

صغیر افراہیم

راشد الخیری، دیانرائن نگم، پنڈت جنارد ھن جھا اور نیاز فتح پوری سے لے کر کمل کشور گوئنکا اور پردیپ جین تک، تقریباً 100 برس کے دوران پریم چند پر مختلف زاویوں سے کام ہوا ہے۔ ابتدا میں رومانیت اور حقیقت پسندانہ رجحانات کے تحت، پھر طویل عرصہ تک مارکسوادی نقطۂ نظر سے پریم چند، اور ان کی افسانوی تخلیقات کا عمیق مطالعہ کیا گیا ہے۔ جدید رویوں کے حامل دانشورانِ ادب نے اگرچہ پریم چند پر کم اور ان کے ناقدین پر زیادہ گفتگو کی ہے لیکن انھوں نے بھی یہ تسلیم کیا ہے کہ:

1. پریم چند کا ذہن ارتقا پذیر تھا۔
2. وہ ماضی اور حال کے اکثر رجحانات اور تقاضوں سے واقف تھے۔
3. ان کا فن حالات کے ساتھ ترقی کر رہا تھا۔
4. ان کے خیالات رونما ہونے والے واقعات کی رفتار کا ساتھ دے رہے تھے۔
5. وہ عوام کی روح میں اتر کر، ان کے لرزتے، دھندلے اور سہمے خوابوں کو دیکھتے اور دِکھاتے تھے۔
6. کسانوں، مزدوروں اور عورتوں کو استحصالی نظام کے مایا جال سے نکال کر، ایک بہتر اور پرسکون زندگی عطا کرنا چاہتے تھے۔

موضوع کی سطح پر کائنات سے ذات تک سمٹنے اور پھر ہیئتی اور لسانیاتی اعتبار سے انھیں دیکھنے کے عہد، یعنی 1980 کے آس پاس سے پریم چند کے غیر افسانوی ادب کو بھی مختلف اور متضاد زاویوں سے پرکھا جا رہا ہے، اس میں سرفہرست سیلیش زیدی، مدن گوپال، پردیپ جین اور کمل کشور گوئنکا ہیں۔ کمل کشور گوئنکا نے اپنی کتاب 'پریم چند ادھین کی نئی دِشائیں'[1] کے ذریعہ آواز بلند کی، کہ فکر وفن کے کئی ایسے پہلو ہیں جو تشنہ ہیں اور خصوصی توجہ کے مستحق ہیں۔ کمل کشور[2] جو ابھی پچھلے ماہ (یکم اپریل 2025) ہم سے رخصت ہوئے ہیں، پریم چند کے مطالعہ کی کئی نئی جہتوں کی نشاندہی کرتے ہوئے جدّتِ طبع، اسالیب بیان، تکنیکی رجحانات، کرداروں کی آویزش پر زور دیا، نیز تہذیبی وتاریخی تضاد وتصادم کے لحاظ سے بھی تحقیق وتنقید کو مزید استحکام بخشا۔[3] ان کی وسیع النظری اور ہشت پہل کاوشوں نے ہمیں احساس دلایا ہے کہ افسانوی ادب کے علاوہ پریم چند کے غیر افسانوی ادب کا بھی یکسوئی اور دلجمعی سے، مطالعہ کرنا ہوگا، اور تلاش وتحقیق کے بعد دستیاب تحریروں کی تفصیلات کو cross check کرنا ہوگا۔ یہ مطالعہ (مضامین، تبصرے، انشائیے، ترجمے، خطوط، اداریے، کالم)[4] بعض غلط فہمیوں کے ازالہ کے ساتھ پریم چند کے خواب کی تعبیر اور تعمیر میں مزید معاون ثابت ہوسکتا ہے۔

انشائیے، تراجم، خطبات، مکتوبات پر کام کرتے ہوئے، پریم چند ایک ادیب، نقاد اور صحافی کی حیثیت سے بھی سامنے آتے ہیں۔ ان نئی جہتوں کے وسیلے سے مابعد جدید دانشوروں نے واضح کیا ہے کہ 'عیدگاہ' محض بچوں کی نفسیات پر مبنی کہانی نہیں، غربت وامارت کا استعارہ بھی ہے اور اس کی نئی قرأت سوال قائم کرتی ہے کہ فطرہ کی رقم درِ یتیم حامد کو کیوں نہیں مل سکی؟ بے بس اور مفلس امینہ نے اپنے اور اپنے پوتے کی گزر بسر کے لیے ہاتھ پھیلانے کے بجائے محنت ومزدوری کو کیوں ترجیح دی؟ بھشتی، وکیل، سپاہی جیسے کرداروں کے مابین لوہے کا چمٹہ کیا تازیانے کی شکل اختیار کر سکتا ہے اور فولادی 'دستِ پناہ' عوامی اقتدار اور جمہوری نظام کی بشارت ثابت ہوسکتا ہے؟ اسی طرح افسانہ 'کفن' پر سوال قائم ہوا ہے کہ یہ کس کردار کا کفن ہے؟ گھیسو، مادھو، زمیندار یا سلیقہ سے نکموں کا پیٹ پالنے والی بدھیا کا، یا اس کے پیٹ میں پلنے والے معصوم کا، یا پھر حقائق سے چشم پوشی اختیار کرنے والے مہذب معاشرہ کا؟

دورِ حاضر کے کمل کشور گوئنکا جیسے معدودے چند ناقدین کی مسلسل جاں فشانی، تلاش وجستجو اور بے باکانہ اظہار پریم چند شناسی کے نئے در کھول رہا ہے۔ انھوں نے اردو اور ہندی کی تحریروں کے اعداد وشمار، عمومی جائزے اور تبصرے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ دھول سے اٹی ہوئی فائلوں میں بند راز ونکات اور گم ہو جانے والے شہ پاروں کو از سرِ نو تلاش کیا۔ مثلاً ہائی اسکول کے نصاب میں شامل ہونے والی پریم چند کی مرتبہ کتاب 'باکمالوں کے درشن' پر درجنوں سوالات قائم کیے۔ الہ آباد کے مشہور اردو ناشر رام نرائن نے جب اسے 1929 میں شائع کیا تو اس کی خوب واہ واہ ہوئی۔ نگراں کمیٹی نے کیوں اعتراض جتاتے ہوئے پریم چند کو کچھ مشورے دیئے؟ نیز دو سال بعد کیوں اس شور کی روشنی میں ترمیم وتنسیخ ہوئی؟ وغیرہ وغیرہ۔

1980 سے قبل پریم چند کے اکثر ناقدین نے اپنے محققانہ اور ناقدانہ فن پاروں میں اس پر زور دیا کہ پریم چند کے افسانوں، ناولوں اور ڈراموں میں ان کے عہد تک کے ہندوستان کے معاشی، سیاسی، طبقاتی اور عوامی کشمکش کا واضح اور تابناک نقشہ ملتا ہے۔ بلاشبہ یہ زاویۂ نگاہ درست ہے کہ پریم چند نے قصہ کہانیوں کو محلوں سے

نکال کر چوپال تک پہنچایا۔ شہزادیوں، شہزادوں اور امیر زادوں کی جگہ عوام کو مرکزیت عطا کرتے ہوئے غور و فکر، جدو جہد و عمل کے نئے کینوس اجاگر کیے، لیکن کیا پریم چند کی ادبی خدمات کا دائرہ یہیں تک محدود ہے؟ انھوں نے نثر کی تقریباً ہر صنف میں فن کا کمال دکھایا ہے۔ اس لیے دورِ حاضر کے باشعور ناقدین اور محققین، ان کی تمام نگارشات کی درجہ بندی[5] کرتے ہوئے مطالعہ کی نئی نئی جہتیں تلاش کر رہے ہیں۔ یہ وہ جہتیں ہیں جن پر ماضی میں کم توجہ دی گئی تھی۔ یہ مطالعہ اپنی جگہ بہت اہم اور قابلِ رشک ہے۔ پریم چند کے مضامین پر گوئنکا کی طرح یکسوئی اور دلجمعی سے کام کرنے سے ظاہر ہوا کہ اہم شخصیات پر ان کے 27 مضامین ہیں جو 'زمانہ'، 'آوازِ خلق'، 'اردوئے معلیٰ' کی فائلوں میں موجود ہیں۔ ان میں اگر اکبر اعظم ہیں تو رانا پرتاپ بھی، کالی داس ہیں تو شیخ سعدی بھی، شرر و سرشار ہیں تو بہاری اور بھارتیندو بھی۔ شخصیات کے علاوہ 28 تنقیدی مضامین ہیں جو معروف ادیبوں کے فن پاروں پر لکھے گئے ہیں۔ ناول کا فن، ناول کا موضوع، مختصر افسانے کا فن، انشائیے اور صحافت کا فن جیسے موضوعات بھی ان میں جلوہ گر ہیں۔

صحافت کے آداب سے واقف اس فنکار (پریم چند) کو، پنڈت بدری ناتھ سدرشن، جگت موہن لال رواں اور ثاقب کانپوری کے مشورے سے رسالہ 'زمانہ' اور اخبار 'آوازِ خلق' کا اعزازی معاون مدیر بنایا گیا تھا۔ پریم چند نے بھی رسماً نہیں صحافت کے رموز و نکات کا پورا لحاظ رکھتے ہوئے ذمہ داریاں ادا کیں۔ افسانہ اور حقیقت کو ایک دوسرے میں تحلیل کر دینے والا یہ فنکار اپنے ایک افسانہ 'موت کے بعد' میں اخبار نویسی کو بنیادی موضوع بناتا ہے تو دوسرے افسانہ 'لعنت' میں ایڈیٹر کے فرائض سے اپنے قارئین کو دلچسپ انداز میں آگاہ کرتا ہے۔ انداز سادہ مگر طنز ملیح لیے ہوئے ہے۔ موجودہ میڈیا اور آج کے صحافی کو ان مضامین کے گہرے مطالعہ کی ہی نہیں، انھیں آگے بڑھانے اور عوام تک پہنچانے کا فریضہ بھی ادا کرنا چاہیے۔

'جہانِ پریم چند' میں اس کا ذکر ضمنی طور پر آتا ہے کہ پریم چند نے گاندھی جی کی تقریر سے متاثر ہو کر سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ غور کیجیے تو یہ سرفروشی، جاں نثاری اور حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ایک بڑا مجاہدانہ عمل ہے۔ انھوں نے کسی مجبوری کے تحت نہیں بلکہ سوچ سمجھ کر، 15 فروری 1921 کو نوآبادیاتی نظام کی جابرانہ قوت کے خلاف، بطور احتجاج استعفیٰ دیا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے ایک نئے عزم و حوصلہ کے ساتھ بنارس کے ادبی رسالہ 'مریادا' اور گیان منڈل کے روزنامہ 'آج' سے تعلق قائم کیا اور آخر میں (1923 میں) سرسوتی پریس (بنارس) سے رشتہ جوڑا۔ ماہنامہ 'ہنس' اور ہفتہ وار 'جاگرن نکالا'، وہ 'مادھوری' اور 'پرتاپ' میں بھی کام کرتے رہے اور ایک باشعور فکشن رائٹر کی طرح، صحافتی تحریروں میں بھی طبقاتی تقسیم پر بے باکانہ طور پر لکھتے رہے۔ ان کے ڈیڑھ سو کالموں اور ساڑھے چار سو اداریوں میں ڈاکٹر شانتی کمار (میدانِ عمل) کے

> **پریم چند نے قصہ کہانیوں کو محلوں سے نکال کر چوپال تک پہنچایا۔ شہزادیوں، شہزادوں اور امیر زادوں کی جگہ عوام کو مرکزیت عطا کرتے ہوئے غوروفکر، جدوجہد و عمل کے نئے کینوس اجاگر کیے، لیکن کیا پریم چند کی ادبی خدمات کا دائرہ یہیں تک محدود ہے؟ انھوں نے نثر کی تقریباً ہر صنف میں فن کا کمال دکھایا ہے۔**

کردار کا بھی عکس نظر آتا ہے اور ٹھاکر درشن سنگھ (صرف ایک آواز) کی گونج بھی سنائی دیتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے بامعنی اداریوں میں ہوری، دھنیا، گوبر، جھونا، سلیا، ہرکھو، ماتادین اور داتادین (گئودان) کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں تو ناول 'چوگانِ ہستی' کا سورداس، عدم تشدد کے استقامت کا استعارہ اور صحافتی رنگ میں مستحکم فریاد فغاں نظر آتا ہے۔ 'دودھ کی قیمت' کا منگل، 'نجات' کا دکھی اور 'سوا سیر گیہوں' کا شنکر کرپشن، اقربا پروری، انسانی حقوق کی خلاف ورزی بلکہ تاناشاہی کی نشاندہی کرتے ہوئے انقلابی چولے کو چننے کا احساس دلاتے ہیں۔

نواب رائے اور دھنپت رائے کو پریم کے ساگر میں ڈبو دینے والا پریم چند مختلف جہتوں اور زاویوں سے ادبی خدمات انجام دیتا رہا ہے۔ اس عظیم فنکار کی تمام تحریروں کا معروضی مطالعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس کی تحریریں ہر دور کی نمائندہ تحریروں میں شمار کیے جانے کے لائق ہیں اور یہی بڑے فنکار کی عظمت کا راز ہے۔ ان میں نوآبادیاتی نظام سے عالمگیریت کی ذو معنی ترقی کا ہر عکس تلاش کیا جا سکتا ہے۔ پریم چند نے دیہی اور قصباتی ماحول میں 'نیکی کر دریا میں ڈال' کے اس منظر نامہ کو بھی اجاگر کیا ہے جہاں کسی پر نیکی کر کے احسان جتانا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ مگر آج، خاص طور سے کووڈ-19 کے بعد، صاحب اقتدار افراد بلکہ ترقی یافتہ اشخاص کا احسان جتانے کا رویہ، پریم چند کے زاویۂ نگاہ سے بہت بدلا ہوا اور تضحیک آمیز محسوس ہوتا ہے۔ دراصل ہمارے عہد کے یہ وہ نمائشی بہی خواہ ہیں جو اپنی شناخت اور پہچان بنانے کے لیے دوسروں کی انفرادیت کو ختم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ غور کریں تو اعلیٰ ڈگریوں کے بوجھ تلے دبا ہوا، ہمارا یہ معاشرہ، بالواسطہ طور پر، پریم چند کی افادیت، اہمیت اور معنویت کو مزید مستحکم کرتا ہے۔

قلم کے اس مزدور نے تمام عمر تعلیم و تربیت کو فوقیت دی، محض ڈگری کو نہیں، اس عمل سے چشم پوشی کا نتیجہ آج سامنے ہے۔ مختلف جہتوں سے ان کا مطالعہ نمایاں اظہار ہے کہ پریم چند کے لیے صبحِ بنارس اور شامِ اودھ ایک سمان ہیں۔ وہ مدن گوپال کو لکھتے ہیں کہ ''میں اردو میں تخلیق کرتا ہوں۔ میری صبح ہندی کے لیے اور شام اردو کے لیے ہے''۔ محمد عاقل سے کہتے ہیں ''کبھی میں اردو میں پہلے لکھتا ہوں اور اس کا انوواد کرتا ہوں اور کبھی ہندی میں لکھتا ہوں اور بعد میں اس کا اردو ترجمہ کرتا ہوں''۔

گاؤں، قصبہ، شہر کو ایک مثلث کی شکل دیتے ہوئے، وہاں کی سوندھی سوندھی خوشبو کے ان گنت سہانے خواب دیکھنے والا پریم چند، آج کی نقل مکانی کے اسباب کو دیکھ کر شاید مزید بے چین ہو اٹھتا۔ علم کی بے قدری، خواتین کی زبوں حالی، مزدوروں کی تنگ دستی اور کسانوں کی کسمپرسی کے ماحول میں، رشوت خوری اور لوٹ مار کے نئے نئے طریقے، مسیحائی کے منصب پر فائز عملے کی بے توجہی، انتظامیہ کی بے بسی کے منظر نامہ میں بڑھتے ہوئے واقعات بلاشبہ انھیں تلملا دیتے۔ شدت سے ابھرنے والا یہ شعوری اور لاشعوری احساس ان کی مختلف تحریروں کے معروضی مطالعے پر، عصرِ حاضر کے دانش وروں کو مزید لکھنے پر آمادہ کر رہا ہے۔ یہاں میں ماضی اور حال کو مربوط کرنے والی چند مثالوں پر

اکتفا کرنا چاہتا ہوں۔ پریم چند کی 12 مارچ 1934 کے 'جاگرن' میں شائع ہونے والی تحریر 'بیکاری کیسے دور ہو' ہر حساس ذہن میں آج بھی تیر کی طرح چبھتی ہے۔ 31 جولائی 1933 کے 'جاگرن' میں 'رشوت کی گرم بازاری' کے عنوان سے قلم بند کی گئی تحریر کو اگر ہم اپریل 1931 کے ساہتیہ سالوچک کے لیکھ 'ہمارے نیتاؤں کی بہکی باتیں' سے منسلک کریں تو بدلتے ہوئے منظر نامہ کی دھند صاف ہوتی دکھائی دے گی۔ مطالعہ اور مشاہدہ اس کا غماز ہے کہ پریم چند کا ماہنامہ زمانہ، کانپور کے فروری 1906 کے شمارہ میں شائع ہونے والا طویل مضمون 'ڈراما جنگ روس و جاپان' پہلی جنگِ عظیم کا نقیب بنتا ہے تو 28 سال بعد 19 فروری 1934 کے 'جاگرن' میں چھپنے والا کالم 'روس اور جاپان میں تناؤ' دوسری جنگ عظیم سے نپٹنے کا اشاریہ محسوس ہوتا ہے کیونکہ ایک سال پہلے وہ 10 اپریل 1933 کے 'جاگرن' میں بعنوان 'جرمنی میں یہودیوں کا اتیاچار' قلم بند کر چکے تھے۔

پریم چند کی دور رسی، دور بینی اور انسانی ہمدردی سے لبریز 'جاگرن' میں شائع ہونے والی تحریریں خصوصاً 15 اکتوبر 1932، 22 مئی 1933 اور 26 اکتوبر 1934 کے بالترتیب یہ کالم:

1. مولانا شوکت علی کی گہری سوجھ بوجھ
2. سچی راج نیتی
3. سورگیہ مولانا محمد علی کا فارمولہ

تخصیص وتمیز کو منہدم کرتا ہے اور ان کے لیے تازیانہ ثابت ہوتا ہے جنھیں توہم پرستی، اندھی عقیدت مندی سے وابستہ روایتوں کی زیادہ فکر ہے، بدحال عوام، کسان اور مزدور کی نہیں۔ پریم چند نے ستمبر 1924 میں کانپور سے شائع ہونے والے 'پرتاپ' میں شری کرشن کے یوم پیدائش پر لکھے اپنے مضمون میں 'ہندو مسلم پرشن' کو ایک اہم مگر نہایت وسیع دائرے میں دیکھا تھا۔ استفہامیہ نکات کے اسباب وعلل بھی بتائے تھے مگر ہمارے پاس اتنا حوصلہ کہاں کہ اس نسخہ کو ہم اپنی عملی زندگی کا حصہ بنا سکیں۔

میں اپنی بات کو 'ہنس' دسمبر 1933 میں شائع ہونے والے پریم چند کے مضمون 'جیون اور ساہتیہ میں گھرنا کا استھان' پر ختم کرنا چاہتا ہوں جس کے مطالعہ، اور جس پر عمل کی آج شدید ضرورت ہے۔ اس کے ذریعے تفریق کی دیواریں منہدم ہو سکتی ہیں۔ کیونکہ

اردو ہندی ادب میں بھی عالمی ادب کی طرح متنوع تبدیلیاں ہورہی ہیں۔ ایسے میں مکمل طور سے ہندوستانی افکار وخیالات اور تہذیب وتمدن کے عکاس کے طور پر اپنے قد کو مزید بلند کرنے والا یہ فنکار نہ صرف عصری تقاضوں پر پورا اترتا ہے بلکہ مطالعہ پریم چند کی نئی جہتوں کی جانب دانشوران ادب کو راغب بھی کررہا ہے، اس سے ترسیل وتفہیم کے نئے در کھل رہے ہیں۔

تفریق کے ہر پہلو نے ہمیں گہرے زخم دیئے ہیں۔ لیکن یہ کیا کم خوشی کی بات ہے کہ انسانیت، محبت اور علم وفن سے بے لوث لگاؤ رکھنے والے آج یکجا ہوکر، مجاہد فکر وعمل، منشی پریم چند کو خلوصِ دل سے یاد کر رہے ہیں اور ان کے مطالعہ کی نئی نئی جہتیں تلاش کر رہے ہیں، شاید اس وجہ سے بھی کہ ادب نواز فنکاروں اور دانشوروں نے سمجھ لیا ہے کہ اب محض عقیدت اور مفروضوں سے بات بننے والی نہیں ہے۔ صارفیت اور عالمگیریت کا بڑھتا ہوا تصور، زندگی اور متعلقاتِ زندگی کو براہِ راست متاثر کررہا ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ اردو ہندی ادب میں بھی عالمی ادب کی طرح متنوع تبدیلیاں ہورہی ہیں۔ ایسے میں مکمل طور سے ہندوستانی افکار وخیالات اور تہذیب وتمدن کے عکاس کے طور پر اپنے قد کو مزید بلند کرنے والا یہ فنکار نہ صرف عصری تقاضوں پر پورا اترتا ہے بلکہ مطالعہ پریم چند کی نئی جہتوں کی جانب دانشوران ادب کو راغب بھی کررہا ہے، اس سے ترسیل وتفہیم کے نئے در کھل رہے ہیں۔ کتابوں سے دوری قائم ہوتے ہوئے اس دور میں بھی مطالعہ کی نئی نئی جہتوں کی تلاش پریم چند کے افکار ونظریات کے زندہ وتابندہ ہونے کی سب سے بڑی مثال ہے۔

حواشی

1. 1981 میں شائع ہونے والی اس کتاب کے تعلق سے گوئنکا نے مقدمہ میں تفصیل سے جدید افکار ونظریات کے تعلق سے لکھا ہے اور برتی جانے والی کوتاہیوں پر سخت تنقید کی ہے۔ کتاب کا دوسرا ایڈیشن ترمیم وتنسیخ کے ساتھ 2007 میں شائع ہوا۔ اس اہم کتاب کا ترجمہ این سی پی یو ایل کے توسط سے محمد صغیر حسین نے کیا۔ عالمی یوم کتاب کے موقعے پر (23 اپریل 2025) ڈاکٹر شمس اقبال (ڈائریکٹر این سی پی یو ایل) نے بڑے تزک واحتشام کے ساتھ اس کا اجرا کرایا۔
2. بلند شہر کے مارواڑی پریوار میں کمل کشور 11 اکتوبر 1938 کو پیدا ہوئے۔ 1961 میں دہلی یونیورسٹی سے ہندی میں ایم اے کیا۔ 1972 میں اسی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔ موضوع تھا 'پریم چند کے اپنیاسوں کا شلپ ودھان'۔ 1984 میں رانچی یونیورسٹی سے پریم چند کے جیون پر ڈی لٹ کی سند حاصل کی۔ وہ 1962 سے مسلسل لکھتے رہے ہیں۔ 1974 میں ان کی پہلی کتاب جس نے شہرت حاصل کی، وہ ان کا تحقیقی مقالہ تھا جس میں انھوں نے روایتی انداز سے الگ ہٹ کر پریم چند کے ناولوں کی ہیئت اور فن پر مدلل بحث کی تھی اور لسانیاتی خوبیوں کو اجاگر کیا تھا۔ فنی نزاکتوں اور طریق کار کے برتنے کے انداز کو جس طرح انھوں نے پیش کیا ہے بعد میں اس کی پیروی کی گئی۔ دراصل ان کی پوری زندگی جدید تحقیق وتنقید کی آئینہ دار ہے۔
3. شاعر، محقق، نقاد، صحافی، ڈرامہ نویس کے علاوہ کمل کشور نے بچوں کے ادب کو بھی موضوع بنایا ہے مگر ان کی اصل شہرت کا باعث پریم چند پر ان کا اعلیٰ درجہ کام ہے۔ 'پریم چند کا اپراپت ساہتیہ' اور 'پریم چند وشوکوش' نے ادبی حلقے میں ہلچل مچائی ہے۔
4. (i) مضامین: 28 سوانحی (اردو میں) 10 تنقیدی مضامین اردو میں، 18 ہندی میں
   (ii) تبصرے: 17 (اردو میں)
   (iii) انشائیے: 32 (اردو میں 13، ہندی میں 19)
   (iv) اداریے: 450 (آج، مریادا، ہنس، جاگرن وغیرہ میں)
   (v) کالم: 150 (مادھوری، پرتاپ، جاگرن، ہنس وغیرہ میں)
   (vi) خطوط: 695 (اردو میں 465، ہندی میں 225، انگریزی میں 5)
   (vii) ترجمے: 10
5. اگر صرف پریم چند کے خطوط کی ہی شیرازہ بندی کی جائے تو اردو میں 465، ہندی میں 220، اور انگریزی میں لکھے گئے پانچ خط دستیاب ہیں۔ شخصیات کے نام 660، ایڈیٹر یا ادارے کے نام 23، اور بغیر نام کے 7 خط مدن گوپال نے یکجا کیے ہیں۔ کمل کشور نے اس جانب توجہ دلائی ہے کہ 58 لوگوں کے نام لکھے گئے خطوط میں محض دیا نرائن نگم کے نام 350 مکاتیب ہیں۔

■

Prof. Sagheer Afraheim
Ex. Chairman Department of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh- 202001 (UP)
Mob.: 9358257697
s.afraheim@yahoo.in

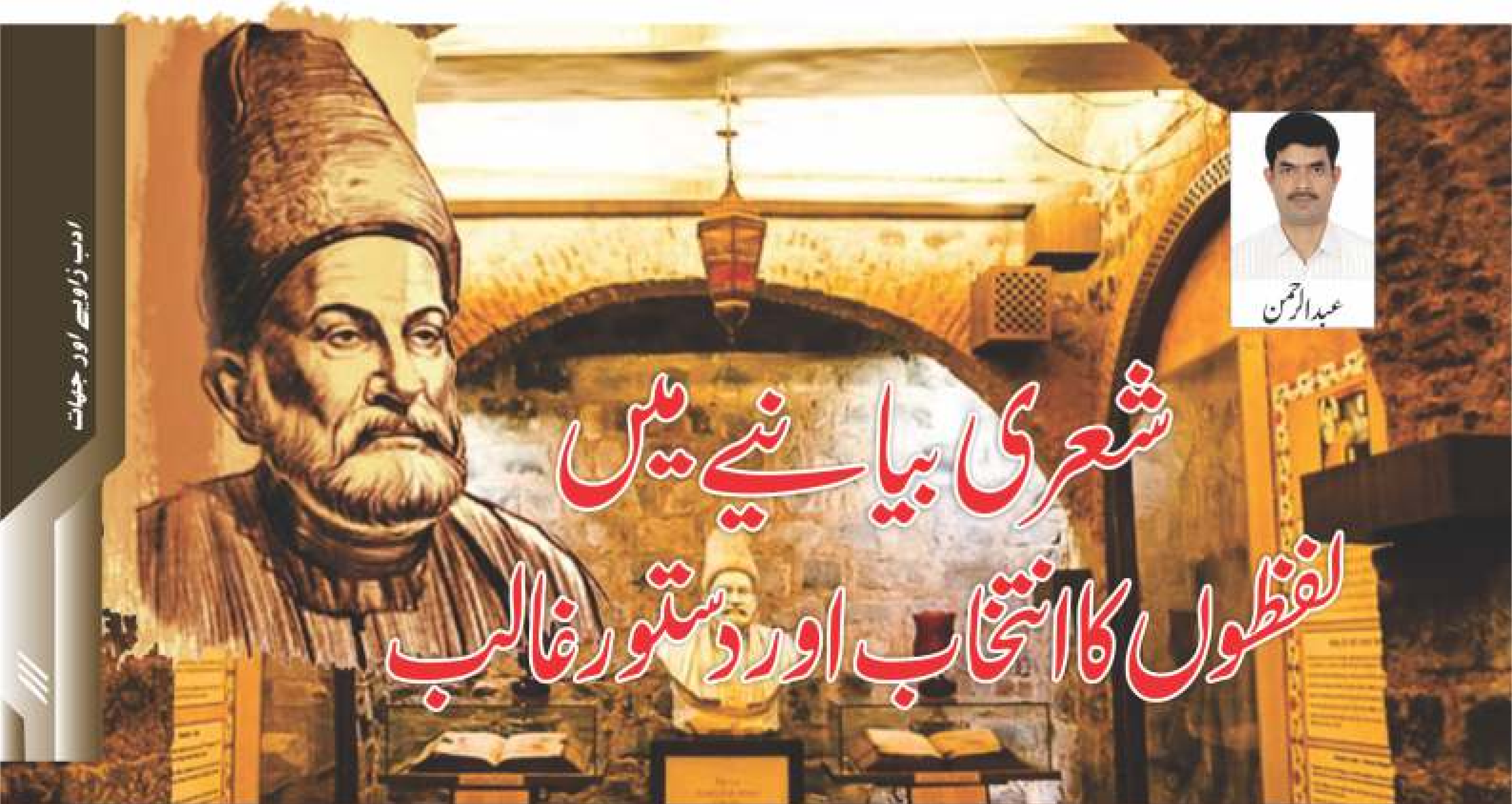

عبدالرحمن

شعری بیانیے میں لفظوں کا انتخاب اور دستور غالب

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالب میرے اشعار میں آوے
(غالب)

اردو شاعری کو اگر ادوار میں تقسیم کیا جائے تو مرزا اسداللہ غالب پانچویں دور کے شاعر قرار پاتے ہیں۔ اس دور تک اردو شاعری نے ایک سنہری منزل طے کر لی تھی۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ غالب ایسے ماحول کے پروردہ ہیں جس میں اردو شاعری کے معیارات متعین کیے جا چکے تھے۔ بلندی تخیل، تنفص الفاظ، معنی آفرینی، منظرکشی اور پیکر تراشی؛ کسی بھی فن پارے کی قدر و قیمت متعین کرنے لگی تھیں۔ میر کا لہجہ اور ان کی سادگی و ندرت بیان دنیائے شاعری میں رقصاں تھی۔ ایسے ماحول میں ایک نئی شناخت قائم کرنا کوئی عام بات نہ تھی۔ لیکن مرزا نوشہ نے اپنی جولانی تخیل، وسعت مطالعہ اور موزونی طبع سے پورے عہد کو ایک نئے رنگ و آہنگ سے متعارف کیا اور 'گنجینۂ الفاظ' سے 'معنی کا ایسا طلسم' تیار کیا کہ اساتذۂ فن بھی مسحور ہو گئے۔ اس شعری طلسمات میں دیدۂ بینا کے لیے ادب اور ادبیت کی ہر وہ خوبی نظر آتی ہے جس کا وہ متلاشی ہوتا ہے۔ موسیقی، فلسفہ، لسانیات، تاریخ، طب، جفر اور رمل کی اصطلاحیں اپنے کروفر کے ساتھ جلوہ نما ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عبدالرحمن بجنوری کو لکھنا پڑا کہ:

''ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں: وید مقدس و دیوان غالب۔ لوح سے تمت تک مشکل سے سو صفحے ہیں لیکن کیا ہے جو یاں حاضر نہیں۔ کون سا نغمہ ہے جو اس ساز زندگی کے تاروں میں بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں ہے۔ شاعری کو اکثر شعرا نے اپنی اپنی حد نگاہ کے مطابق حقیقت اور مجاز، جذبہ اور وجدان، ذہن اور تخیل کے لحاظ سے تقسیم کیا ہے مگر یہ تقسیم خود ان کی نارسائی کی دلیل ہے۔ شاعری انکشافات حیات ہے جس طرح زندگی اپنی نمود میں محدود نہیں۔ شاعری بھی اپنے اظہار میں لاتعین ہے۔ اس لحاظ سے مرزا کو ایک ربع النوع تسلیم کرنا لازم آتا ہے۔ غالب نے بزم ہستی میں جو فانوس خیال روشن کیا ہے کون سا 'پیکر تصویر' ہے جو اس کے 'کاغذی پیرہن' پر منازل زیست قطع کرتا ہوا نظر نہیں آتا۔''[1]

غالب کی حیات و خدمات کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ غالب کی زیادہ تر تصنیفات فارسی میں ہیں، اردو میں شاعری کا ایک دیوان اور خطوط کے دو مجموعے [عود ہندی اور اردوئے معلّی] ہیں۔ تقریباً سات تصانیف ['دیوان غالب فارسی'، 'مہر نیم روز'، 'دستنبو'، 'قاطع برہان'، 'پنج آہنگ'، 'نگارستان سخن'، 'قادر نامہ'، 'لطائف غیبی' اور 'درفش کاویانی'] فارسی میں ہیں۔ لیکن غالب کے فکر و فن پر کتنی کتابیں لکھیں گئیں اس کا باقاعدہ کوئی شمار نہیں ہے۔ اگر ان کی حیات و خدمات پر منعقد سمینار، سمپوزیم، رسائل نمبر اور تحقیقی مقالات کو چھوڑ دیا جائے تو بھی یہ گنتی ہزار سے زائد ہے۔ جو یہ سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ آخر ان چند کتابوں میں ایسی کیا خوبی ہے کہ آج غالب کی وفات کے ڈیڑھ سو سال بعد بھی ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ادبی حلقوں اور تحقیقی اداروں میں وہی کروفر نظر آتا ہے۔ اس کا ایک بہتر جواب یہ ہو سکتا ہے کہ غالب کے 'گنجینۂ معنی کا طلسم' ہی ایسا ہے کہ ہر روز نت نئے معنی سامنے آتے ہیں۔

غالب کی فکری حیات کا احاطہ کرنے کے لیے تمام بڑے ادیبوں اور ناقدوں نے کوششیں کی ہیں۔ لیکن کسی بھی ادبی تحقیق کو حرف آخر کہنا درست نہیں ہے۔ بسا اوقات ایسے اہم گوشے غیر اہم بن کر پردۂ خفا میں رہ جاتے ہیں جن پر کسی حصول(Achivment) کا انحصار ہو سکتا ہے۔ مثلاً ماہرین غالبیات میں سے کسی ایک نے بھی اب تک غالب کو 'فاصلاتی تعلیم کے بنیاد گزار' کے طور پر نہیں دیکھا تھا۔ جس پر پروفیسر صادق حسین نے حال ہی میں ایک کتاب ترتیب دی ہے۔

ظاہری بات ہے کہ شاعری اور خاص طور پر غالب کے کلام کی تفہیم جس میں 'بیان' اور 'معانی' کی وہ تمام صنعتیں موجود ہیں جو کسی فن پارے کا منتہی ہو سکتی

ہیں۔اس لیے ایسے قاری کے لیے غالب کا کلام قدرے مشکل ہے؛ جس کا تعلق ادب اور خصوصاً فارسی زبان سے نہ ہو۔اس حوالے سے شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

غالب کی فارسیت کا نمایاں وصف (لسانی اعتبار سے) اس کی پیچیدگی ہے اور (کیفیت کے اعتبار سے) اس کی تجریدیت ہے۔ تجریدیت کا ذکر میں تھوڑا بہت کر چکا ہوں۔ پیچیدگی سے میری مراد مرکبات میں ان الفاظ کا داخل کرنا ہے جو بجائے خود ترکیب یا فقرے کا وصف رکھتے ہیں۔ مثلاً 'خوں شدہ' ایک فقرہ ہے۔'دل خوں شدہ' ایک اور طرح کا فقرہ ہے۔ جب اس کو مرکب کیا تو 'دل خوں شدۂ کش مکش' کا فقرہ بنا۔ اب اس کو پھر مرکب کیا اور 'دل خوں شدۂ کشمکش حسرت دیدار' کا فقرہ بنا۔ 'خوں شدہ' کے اپنے معنی ہیں۔ 'دل' فاعل بھی ہوسکتا ہے لیکن اگر 'دل خوں شدہ' کو ایک فقرہ مانا جائے تو 'دل' کی فاعلیت ختم ہوجاتی ہے، اور یہ پورا فقرہ دوسرے مصرعے میں 'آئینہ' کی صفت بن جاتا ہے ظاہر ہے کہ محض توالی اضافت کے ذریعہ یہ بات نہیں حاصل ہوسکتی۔ پیچیدہ فارسیت کی یہ صفت صرف غالب سے مخصوص ہے۔ انھوں نے اس کو اردو زبان میں پوری طرح حل کرلیا ہے۔ جو لوگ مومن وغیرہ کی فارسیت کو غالب کے مقابلے میں لاتے ہیں، وہ اس نکتے کو نظر انداز کرجاتے ہیں کہ غالب کی فارسیت کا اصل جوہر اس بات میں ہے کہ وہ ایسے فقروں کو مرکب کرتے ہیں جو خود ترکیب یا فقرے کا حکم رکھتے ہیں، اور ان کے یہاں اکثر (جیسا کہ اوپر کی مثال سے واضح ہوا ہوگا) فارسیت دو مصرعوں میں نئے نئے ربط پیدا کرنے کا عمل کرتی ہے۔2

چونکہ اردو زبان دراصل عربی، فارسی اور ہندی کا آمیزہ ہے اور کم وبیش عربی اور فارسی زبان کے الفاظ تمام شعرا کے یہاں موجود ہیں لیکن فارسیت کو جس طرح غالب نے اپنے کلام میں برتا ہے؛ اس کی تہہ تک عام قاری کی رسائی خاصی مشکل ہے۔ بعض اشعار تو اس قدر پر پیچ ہیں کہ ان کے تلامذہ بھی ان کی تہہ تک نہیں پہنچ پاتے تھے۔ مولوی عبدالرزاق شاکر کے نام غالب کے ایک خط کا اقتباس دیکھیں جس میں غالب نے خود اپنے اشعار کے چند مصرعوں کی تشریح کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''پہلے معنی ابیات بے معنی سنیے، 'نقش فریادی' الخ، ایران میں رسم ہے کہ دادخواہ کاغذ کے کپڑے پہن کر حاکم کے سامنے جاتا ہے۔ جیسے مشعل دن کو جلانا یا خون آلودہ کپڑا بانس پر لٹکا کرلے جانا۔ پس شاعر خیال کرتا ہے کہ نقش کس کی شوخیِ تحریر کا فریادی ہے کہ جو صورت تصویر ہے، اس کا پیرہن کاغذی ہے؟ یعنی ہستی اگرچہ مثل تصاویر اعتبار محض ہو، موجب رنج وملال و آزار ہے۔

'شوق ہر رنگ، الخ' رقیب، بہ معنی مخالف، یعنی شوق سروسامان کا دشمن ہے۔ دلیل یہ کہ قیس جو زندگی میں ننگا پڑا پھرتا تھا، تصویر کے پردے میں بھی ننگا ہی رہا۔ لطف یہ ہے کہ مجنوں کی تصویر باطن عریاں ہی کھنچتی ہے، جہاں کھنچتی ہے۔

> غالب ایک شعر کے لیے ستر کنویں نہیں بلکہ تمام کنوؤں کو جھانکتے اور اس کی خشکی وتری کو ٹٹولتے ہیں۔ ایک ایک لفظ کو علم کلام، علم عروض اور نحو وصرف کے میزان پر پرکھنے کے علاوہ اساتذہ شعرا [خصوصاً فارسی کے شعرا] کے کلام کی کسوٹی پر تولتے ہیں۔ پھر اس لفظ کے استعمال پر حتمی مہر ثبت کرتے ہیں۔

'زخم بے داد، الخ' یہ ایک بات میں نے اپنی طبیعت سے نئی نکالی ہے جیسا کہ شعر میں، شعر۔

نہیں ذریعۂ راحت، جراحت پیکاں
وہ زخم تیغ ہے، جس کو کہ دل کشا کہیے

یعنی زخم تیر کی توہین، بہ سبب ایک رخنہ ہونے کے اور تلوار کے زخم کی تحسین بہ سبب ایک طاق سا کھل جانے کے، 'زخم نے داد نہ دی تنگی دل کی'، یعنی زائل نہ کیا تنگی کو، 'پرافشاں'، بہ معنی 'بے تاب' اور یہ لفظ تیر کے مناسب۔ حاصل یہ کہ تیر تنگی دل کی داد کیا دیتا، وہ تو خود ضیق مقام سے گھبرا کر پرفشاں وسراسیمہ نکل گیا۔'3

اس اقتباس کے پہلے جملے پر غور کریں 'پہلے معنی ابیات بے معنی سنیے، 'نقش فریادی، الخ...' یعنی عبدالرزاق شاکر شعر کے اصل مفہوم تک نہیں پہنچ سکے۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ غالب کے اشعار عام اور بسا اوقات خاص قاری کے لیے بھی مشکل ہیں اور ان اشعار کی تہوں میں پوشیدہ مفاہیم تک رسائی 'غالب کی فکری جہات' تک رسائی حاصل کرنے پر منحصر ہے۔ اور غالب کی فکری سطح تک پہنچنے میں غالب کے خطوط اہم ذریعہ ہیں۔ ان کے مطالعے سے ان پر پیچ الفاظ، تراکیب اور اصطلاحات کی حتمی سلجھتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یعنی تفہیم غالب کے باب میں خطوط غالب [خصوصاً تلامذہ کے نام] وہ کلید ہیں جن سے 'غالب کے فکری ابعاد' روشن ہوتے ہیں۔

غالب ایک شعر کے لیے ستر کنویں نہیں بلکہ تمام کنوؤں کو جھانکتے اور اس کی خشکی وتری کو ٹٹولتے ہیں۔ ایک ایک لفظ کو علم کلام، علم عروض اور نحو وصرف کے میزان پر پرکھنے کے علاوہ اساتذہ شعرا [خصوصاً فارسی کے شعرا] کے کلام کی کسوٹی پر تولتے ہیں۔ پھر اس لفظ کے استعمال پر حتمی مہر ثبت کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر منشی ہرگوپال تفتہ کے نام خط کا اقتباس دیکھیں۔

''چہ گل چہ لالہ چہ نسترن مکنید

کیا گلاب کا پھول، کیا لالہ، کیا موتیا، کیا چنبا [چمپا] نہ کرو، زنہار نہ کرو، یعنی کیا نہ کرو؟ اب جب تمھیں کہو کہ صاحب ذکر نہ کرو، تب کوئی جانے ورنہ کبھی جانا نہیں جاتا کہ ذکر نہ کرو۔ اے تم نے کہا بھی کہ ہمارا مقصود یہ ہے کہ ذکر نہ کرو۔ حضرت! 'ذکر' مضاف کیوں کر ہوسکتا ہے؟

گل ولالہ نسرین ونسترن کی طرف کہو گے کہ 'ذکر' کا لفظ نہیں 'بیان' کا لفظ اوپر کے مصرع میں ہے۔ وہ 'بیان' کا لفظ رسوں سے اور زنجیروں سے ان چار لفظوں سے ربط نہیں پاتا۔ مطلع لکھو، قطعہ لکھو، ترجیع بند لکھو، یہ مصرع معنی دینے کا ہی نہیں، مہمل محض ہے۔''4

یعنی شعری لفظیات کے حوالے سے غالب کا ایک خاص شیوہ ہے کہ الفاظ بے ربط اور مہمل نہ ہوں، بلکہ لفظی اور معنوی دونوں سطح پر مربوط اور متعدد ابعاد کے حامل ہوں۔ مثال کے طور پر (غزل) 'نقش فریادی'

کے مقطع کا شعر دیکھیں۔

میں کہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

اس شعر کے پہلے مصرعے میں لفظ 'اسیری' دوسرے مصرعے کے لفظ 'زنجیر' سے کنایۃً مربوط ہے۔اسی طرح پہلے مصرعے میں 'آتش زیر پا' سے 'موئے آتش دیدہ' مربوط ہے۔اس شعر میں مستعمل الفاظ 'موئے آتش دیدہ' اور 'حلقۂ زنجیر' کی ایک اور خوبی انفرادیت کے باوجود یک کیفیتی نسبت ہے۔یعنی 'جھلسے ہوئے بال' اور 'زنجیر کی کڑی' کی شکل ایک جیسی ہوتی ہے۔جس سے واضح ہوتا ہے کہ اس شعر کے تمام الفاظ عمارت کی اینٹ کے مانند ایک دوسرے سے بندھے اور نگوں کی طرح جڑے ہوئے ہیں اور انھیں لفظوں سے وہ منظر ابھرتا ہے جو غالب ہمیں دکھانا چاہتے ہیں۔ چودھری عبدالغفور سرور کے نام خط کا ایک اقتباس دیکھیں۔

سبزۂ خط سے ترا کاکل سرکش نہ دبا
یہ زمرد بھی حریف دم افعی نہ ہوا

''قبول دعا وقت طلوع منجملہ مضامین شعری ہے جیسے کتان کا پرتو ماہ میں پھٹ جانا اور زمرد سے افعی کا اندھا ہوجانا۔ آصف الدولہ نے افعی تلاش کرکے منگوایا اور قطعات زمرد اس کے محاذی چشم رکھے کچھ اثر نہ ہوا۔''5

اس شعر میں 'سبزۂ خط'، 'کاکل سرکش'، 'زمرد' اور 'افعی' چار الفاظ ہیں لیکن چاروں اپنے مقام، مرتبہ اور معنویت کے اعتبار سے ایک دوسرے سے اس قدر مربوط ہیں کہ ان میں سے کسی ایک لفظ کو بدلنے سے معنویت اور منظر کشی میں وہ خوبصورتی باقی نہیں رہے گی جو ابھی ہے۔یعنی ان چاروں لفظوں میں ایک طرف معنویت ہے تو دوسری طرف تشابہ۔یعنی 'سبزۂ خط' اور 'زمرد' میں ہریالی کی مشابہت اور 'کاکل سرکش' اور 'افعی' میں کالے پن کی مشابہت۔غور کرنے کی بات یہ بھی ہے کہ دونوں ہی مشابہتوں میں 'رنگ' کو اہمیت حاصل ہے اور دونوں رنگ اپنے اپنے معنی کے اعتبار سے بے حد اہم ہیں۔ یعنی 'ناگ' کا رنگ کالا ہوتا ہے اور 'کاکل' کالے اور بڑے بال کو کہتے ہیں، جب کہ 'سبزۂ خط' ہریالی مائل ہوتا ہے اور 'زمرد' کا رنگ ہرا ہوتا ہے۔یعنی 'زمرد' اور 'سبزۂ خط' میں ہریالی کی مشابہت ہے۔اب ان سب سے الگ ان کی کیفیت پر غور کریں کہ 'سبزۂ خط'، 'کاکل'

شاعری میں لفظی ارتباط اور معنوی ہم آہنگی کو بڑی اہمیت حاصل ہے اس لیے اگر کسی شعر میں لفظی یا معنوی طور پر بے ربطی ہو اور مقصدیت غیر واضح ہو تو وہ شعر موثر نہیں ہوگا۔اس لیے یہ کہنا درست ہے کہ غالب کا شعری نظریہ ورجل کے نظریے ['جس طرح ریچھنی اپنے بدصورت بچے کو چاٹ چاٹ کر خوبصورت اور چمکدار بنا دیتی ہے اسی طرح شاعروں کو اپنی تخلیقات کو مختلف زاویوں سے دیکھنا اور سنوارنا چاہیے۔] سے قریب ہے۔

کے نیچے ہوتا ہے۔جس سے 'سبزۂ خط' کا 'کاکل' سے دبنا لازم آتا ہے۔لیکن خلاف عادت معنی پیدا کرنے کے لیے جو 'زمرد' اور 'افعی' کی تمثیل لائی گئی ہے وہ بڑے کمال کی ہے۔یعنی عام قاعدہ یہ ہے کہ 'زمرد' پتھر اگر 'ناگ' سانپ کے آنکھ کے سامنے پڑجائے تو وہ اندھا ہوجاتا ہے۔تو 'کاکل سرکش' جو 'افعی' یعنی ناگ سانپ کے مانند ہے، اسے 'سبزۂ خط' پر نہیں لٹکنا چاہیے تھا، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اسی لیے 'افعی' کے سامنے 'زمرد' رکھنے سے 'افعی' اندھا نہ ہوا۔یعنی معشوق عاشق کی تمام تر تدبیرات، قواعد و توہمات کے باوجود رام نہ ہوسکا۔

مذکورہ بالا توضیحات کا مقصد یہ ہے کہ شعری اظہار خیال میں غالب کا اولین دستور: معنی کی ابلاغ و ترسیل کے لیے مناسب لفظوں کا انتخاب ہے۔ان کے اشعار کا مطالعہ کریں تو کہیں کسی لفظ پر ایسا احساس نہیں ہوگا کہ اس لفظ کے بجائے بھی کام چل سکتا تھا یا اس لفظ کے بجائے یہ لفظ زیادہ موزوں ہوسکتا تھا۔مثال کے طور پر بوسہ کے لیے 'لب' کا استعمال ہوتا ہے۔ اس لیے غالب کے نزدیک بوسہ کے لیے 'زبان' کا استعمال بے قاعدہ اور غیر موزوں ہے۔سعدالدین خاں شفق کے نام خط کا یہ اقتباس دیکھیں:

''ایک جگہ آپ تحریر میں سہو کر گئے ہیں۔

ع اے مطرب جادوفن بازم رہ ہوشم زن

دو میم آپڑے ہیں، ایک محض بیکار ہے 'دیگر' کی جگہ آپ 'بازم' لکھ گئے ہیں۔

ع اے مطرب جادوفن دیگر رہ ہوشم زن''6

مذکورہ بالا پہلے مصرعے میں 'بازم' اور 'ہوشم' دو الگ الگ الفاظ ہیں لیکن دونوں میں ایک حرف 'میم' کی تکرار ہے اس لیے تصحیح کرتے ہوئے لفظ 'بازم' کو اس کے بہتر متبادل میں تبدیل کر دیا۔اس تبدیلی سے 'صوتی تکرار' ختم ہوگئی ہے۔اور متکلم کی بات بھی وہی رہی، اس کی ابلاغ و ترسیل میں میں کسی قسم کی رکاوٹ بھی پیدا نہیں ہوئی۔لفظوں کے انتخاب اور تغیر و تبدل کے حوالے سے ہی منشی شیونرائن کے نام خط کا یہ اقتباس دیکھیں:

جو لفظ ٹکسال سے باہر تھے وہ بدل ڈالے مثلاً 'وے' کو، کہ یہ گنوارو بولی ہے 'وہ' یہ ٹھیٹ اردو ہے، 'کرانا' یہ بیرونجات کی بولی ہے 'کروانا' یہ صحیح ہے، 'راجے' یہ غلط ہے 'راجہ' صحیح ہے، کہیں کہیں روابط و ضمائر مربوط نہ تھے ان کو مربوط کر دیا ہے۔7

اس اقتباس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ غالب لفظوں کے ایسے ماہر نباض ہیں جو اس کے ظاہری اور باطنی سقم کو ایک نظر میں بھانپ لیتے ہیں۔ ایک ماہر شیشہ گر کی طرح آہنگی اور ہنرمندی سے وہ سب کرجاتے ہیں جس سے 'الفاظ' عیوب، قبح و سقم سے مشفا (صحت مند) اور معانی کی تہ در تہ پرتوں کے متحمل ہوجاتے ہیں۔

شاعری میں لفظی ارتباط اور معنوی ہم آہنگی کو بڑی اہمیت حاصل ہے اس لیے اگر کسی شعر میں لفظی یا معنوی طور پر بے ربطی ہو اور مقصدیت غیر واضح ہو تو وہ شعر موثر نہیں ہوگا۔اس لیے یہ کہنا درست ہے کہ غالب کا شعری نظریہ ورجل کے نظریے ['جس طرح ریچھنی

اپنے بدصورت بچے کو چاٹ چاٹ کر خوبصورت اور چمکدار بنا دیتی ہے اسی طرح شاعروں کو اپنی تخلیقات کو مختلف زاویوں سے دیکھنا اور سنوارنا چاہیے۔] سے قریب ہے۔ اس حوالے سے تفتہ کے نام خط کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''میں نے مانا تمھاری شاعری کو میں جانتا ہوں کہ کوئی دم تم کو فکر سخن سے فرصت نہ ہوگی۔ یہ جو تم نے التزام کیا ہے ترصیع کی صنعت کا اور دو لخت شعر لکھنے کا، اس میں ضرور نشست معنی بھی ملحوظ رکھو، اور جو کچھ لکھو اس کو دوبارہ سہ بارہ دیکھا کرو'' 8

مذکورہ بالا اقتباس پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ غالب نے 'نشست معنی' کے ساتھ ساتھ 'جو لکھا اس کو دوبارہ، سہ بار دیکھا کرو' کی بھی تلقین ہے۔ یعنی شاعری صرف ہم وزن الفاظ کو کسی ایک بحر اور قافیے کے التزام کا نام نہیں ہے بلکہ اس کی خوبصورتی 'اچھے الفاظ میں اچھے مفہوم' کی ترسیل ہے۔ اور یہ خصوصیت ریچھنی کے اسی عمل کی متقاضی ہے۔ یعنی اچھی شاعری کے لوازمات میں موزونی طبع، وسعت مطالعہ اور تفحص الفاظ کو اول درجے کی اہمیت حاصل ہے۔ ایک اچھے شاعر کی طبعی افتاد اور لگن اس کے کلام پر آورد و اکتساب کے رنگ نہیں چڑھنے دیتی۔ مرزا حاتم علی مہر کے نام غالب کے خط کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''سنو صاحب! شعرا میں فردوسی اور فقرا میں حسن بصری اور عشاق میں مجنوں، یہ تین آدمی تین فن میں سر دفتر اور پیشوا ہیں، شاعر کا کمال یہ ہے کہ فردوسی ہو جائے، فقیر کی انتہا یہ ہے کہ حسن بصری سے ٹکر کھائے، عاشق کی نمود یہ ہے کہ مجنوں کی ہم طرحی نصیب ہو۔'' 9

یعنی جس کی شاعری میں فردوسی کی صفات در آگئیں اس کا کلام کسی کے داد و دہش کا محتاج نہیں ہوگا۔ بلکہ اس قسم کی شاعری بذات خود قاری و سامع سے آہ! اور واہ! کہلوانے کی متحمل ہوگی۔ غالب کی یہی وہ شعری فکر ہے جس کی بدولت وہ اپنے خیالات کو نت نئے پیراہن میں ملبوس کرتے ہیں اور لفظوں کی قلم سے جو نقاشی کرتے ہیں اس میں بہزاد اور معانی سے کہیں آگے ہو جاتے ہیں۔ شہید صفی پوری لکھتے ہیں:

'اگر ہم غالب کے تخلیقی ذہن کو ایک ایسی کٹھال سے تشبیہ دیں جس میں دو کم قیمت کی دھاتوں کو گلا کر ایک نئی قیمتی دھات تیار کی جا سکتی ہے تو بالکل درست ہوگا۔ کیمیا گر اپنی ہر کوشش میں سونا بنانے میں کامیاب نہیں ہوتا۔ وہ سونا بنانے میں اسی وقت کامیاب ہوتا ہے جب اسے دھاتوں کے تناسب امتزاج اور حرارت کے نقطہ توازن کا تجربات کے بعد اندازہ ہو جاتا ہے۔

غالب کا گنجینہ معنی لفظوں کا وہی طلسم ہے جس کی بدولت ہر وہ خیال پیدا کرنے پر قادر ہیں جو وہ پیش کرنا چاہتے ہیں۔ پیکر تراشی، مضمون آفرینی اور تخیلاتی سیر سب کچھ انھیں لفظوں کی بازی گری اور الٹ پھیر پر مبنی ہے جس کی بندش، نشست اور موزونیت الہامی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ معانی کی ترسیل کے لیے وہ مفرد الفاظ کے علاوہ ایسے ترکیب بند الفاظ خلق کرتے ہیں جن میں معنی آفرینی بھی ان کے تخیل پر مبنی ہوتی ہے۔

غالب کی گرمی فکر نے ان کے ذہن میں اردو اور فارسی دونوں زبانوں کو پگھلایا، ابتدا میں جو مرکب تیار ہوا وہ ادنی درجہ کا تھا اور اس کی کوئی قیمت نہیں تھی لیکن ان کی فکر نے ان کو پگھلا کر ایسا یکجان کر دیا کہ اس سے نئی تخلیقی زبان تیار ہو گئی جس نے اردو شاعری کو وسعت دی، زبان کو وسعت دی اور فکر کی جولاں گاہ کے لیے نئے میدان فراہم کر دیے۔' 10

لغات غالب کے حوالے سے شان الحق حقی لکھتے ہیں:

'لغات کلام غالب کا امتیازی عنصر وہ لفظی اختراعات اور پر تخیل تراکیب ہیں جو انھیں سے مخصوص ہیں، اور بعض کا اتباع بھی ہوا، یعنی جزو زبان بن گئیں یا کتابوں کے عنوانات کے طور پر مستعار لی گئیں۔" 11

مختصر یہ کہ 'غالب کا گنجینہ معنی لفظوں کا وہی طلسم ہے جس کی بدولت ہر وہ خیال پیدا کرنے پر قادر ہیں جو وہ پیش کرنا چاہتے ہیں۔ پیکر تراشی، مضمون آفرینی اور تخیلاتی سیر سب کچھ انھیں لفظوں کی بازی گری اور الٹ پھیر پر مبنی ہے جس کی بندش، نشست اور موزونیت الہامی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ معانی کی ترسیل کے لیے وہ مفرد الفاظ کے علاوہ ایسے ترکیب بند الفاظ خلق کرتے ہیں جن میں معنی آفرینی بھی ان کے تخیل پر مبنی ہوتی ہے۔ گویا کہ وہ لفظوں کے ابعاد سے کما حقہ واقف ہیں اور کسی بھی مفرد یا مرکب لفظ کے اسی بعد (Dimention) کو استعمال کرتے ہیں جو بے جوڑ ہو۔

حواشی

1 محاسن کلام غالب، عبدالرحمٰن بجنوری، ص 10-09، سن ندارد
2 شعر شور انگیز، شمس الرحمٰن فاروقی، ص 83، مطبوعہ قومی کونسل برے فروغ اردو زبان، دہلی
3 فاصلاتی تعلیم کا بنیاد گزار غالب، پروفیسر صادق حسین، ص 78-77، مطبوعہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی۔ 2023
4 اردوئے معلی: مجموعہ خطوط غالب، رفاہ عام اسٹیم پریس لاہور، 1930/ص 286
5 ایضاً، ص 286
6 ایضاً، ص 251
7 ایضاً، ص 284
8 ایضاً، ص 63
9 ایضاً، 202
10 غالب کی تخلیقی تخیل، ص 205-204، شہید صفی پوری، مطبوعہ ادارہ فروغ اردو لکھنؤ، 1969
11 آئینہ افکار غالب، شان الحق حقی، ص 87، مطبوعہ ادارہ یادگار غالب کراچی، 2001، پاکستان

■

Dr. Abdur Rahman
Assistant Professor
Rajendra College
Jai Prakash University
Chapra-831301 (Bihar)
Mob: 9990552498
Email: rahman11007@gmail.com

جموں وکشمیر میں اردو ڈراما

اشرف لون

جموں وکشمیر میں اردو ڈراما کی کمی یا دوسری اصناف کے مقابلے میں اس صنف کی پس ماندگی قابل فہم ہے، لیکن اس کمی کے باوجود جموں وکشمیر میں ڈراما کی روایت سے انکار کرنا بھی ممکن نہیں۔ جب بھی مجموعی حیثیت سے جموں وکشمیر میں اردو ڈراما کا ذکر آتا ہے تو یہاں کے بھانڈوں کا ذکر کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ ڈراما کے مشہور محقق عشرت رحمانی نے غنی کاشمیری کی مثنوی 'نیرنگ خیال' کے حوالے سے کشمیری بھانڈوں کا ذکر کیا ہے جو اورنگ زیب کے عہد میں گانے بجانے اور نقلیں کرنے اور سوانگ رچانے کا کام بطور پیشہ کرتے تھے اور بازاروں میں تماشائیوں کو جمع کرتے اور نقلیں دکھا کر روزی کماتے تھے۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر بھی یہ بھانڈ اپنا کرتب دکھاتے تھے۔ یہ کرتب مزاحیہ عناصر سے پُر ہوتے تھے اور عوام کو تفریح کے ساتھ ساتھ ایک پیغام بھی دیتے تھے۔

بھانڈ شاہی محفلوں میں اپنا فن دکھاتے تھے اور اس میں مرد زنانہ کردار ادا کرتے تھے۔ برج پریمی کے مطابق ڈرامے کی تشکیل وتہذیب میں ان محفلوں (یعنی بھانڈ جشنوں) کا اہم رول رہا ہے۔ مکالموں کی ادائیگی میں بھانڈوں کو خاص مہارت حاصل تھی۔ مکالموں میں برجستگی کا خاص خیال رکھتے تھے۔ برج پریمی فرماتے ہیں:

''بھانڈ بہروپ بدلنے میں بھی ماہر تھے اور بڑے حاضر جواب بھی تھے۔ ان کے خوبصورت لڑکے زنانہ کردار ادا کرتے تھے.. مکالموں کی ادائیگی میں ان کا عمل خاص طور پر قابل دید تھا.. نڈ پاتھر یا بھانڈ جشن جس کا اوپر ذکر ہوا، دراصل یہاں کا عوامی ڈراما تھا۔ جس طرح ہندی ڈرامے کا ذکر کرتے ہوئے جگہ جگہ گھومنے والی ناٹک منڈلیوں کا ذکر کرنا ناگزیر ہے، اسی طرح کشمیر میں ڈرامے کا ذکر کرتے ہوئے ان ناٹک منڈلیوں کا ذکر کرنا ضروری بنتا ہے۔ یہ فنکار جگہ جگہ اور گاؤں گاؤں گھوم کر زمانے کے تقاضوں کے مطابق:

لوگوں کی تفریح کا سامان مہیا کرتے تھے اور روح عصر کو رمز و علائم میں پیش کرتے تھے۔ اس کے علاوہ روزی روٹی کے مسئلے کو بھی حل کرتے تھے۔ یہاں یہ کہنا بیجا بھی نہ ہوگا کہ بھانڈ مسخرے کو کہتے ہیں اور پاتھر کے معنی ہیں کسی شخص کے حرکات کی نقالی کرنا۔ بھانڈ پاتھر کا بنیادی مقصد بھی سماجی طنز ہی تھا۔ طنز کے ساتھ مزاح کا بڑا تعلق ہے۔ اس لیے بھانڈ پاتھر تفریح کا بڑا ذریعہ تھا۔ یہ ایک چلتا پھرتا اسٹیج تھا اور جیسا کہ ذکر ہوا ناٹک منڈلی یا نوٹنکی دکھانے والی منڈلی کی طرح کا تھا اور اس کا یہی منصب تھا جو ابتدائی دور میں ہندوستان کے وعوامی تھیٹر کا تھا۔''

(جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نشو ونما، برج پریمی، ص99-98)

اس طرح برج پریمی کے مطابق بھانڈ جشن یا بھانڈ پاتھر جموں وکشمیر کا 'عوامی ڈراما' تھا جس میں عام تفریح کے ساتھ ساتھ مختلف مسائل کو اپنے الفاظ میں پیش کیا جاتا تھا اور حکمرانوں کی اس طرف توجہ دلائی جاتی تھی۔

انیسویں صدی کے اواخر میں ڈراما کو عوامی سرپرستی ملی اور جموں میں خاص طور پر رام لیلا نے اس میں اہم کردار ادا کیا۔ ڈوگرہ حکمراں مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے دور حکومت میں باہر سے یہاں متعدد راس لیلا پارٹیاں آنا شروع ہوئیں۔ ان راس لیلاؤں نے مذہب کے ساتھ ساتھ سماجی مسائل کو بھی اپنا موضوع بنایا۔ برج پریمی اپنی کتاب میں فرماتے ہیں:

''مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے دور حکومت میں ریاست کے باہر سے متعدد راس لیلا پارٹیاں ریاست میں آنا شروع ہوئیں۔ شروع شروع میں ایسے ڈراموں کا مقصد مذہبی قصہ کہانیوں کو ڈرامائی شکل میں پیش کرنا تھا۔ بعد میں آہستہ آہستہ سماجی مسائل شامل کیے جانے لگے اور ڈراما لیلاؤں اور نیلاؤں کے اثر سے باہر آنے لگے۔ جب راس لیلا پارٹیاں جموں اور سرینگر آ کر ڈرامے اسٹیج کرنے لگیں اور انھیں مقبولیت حاصل ہوئی تو ہمارے نوجوانوں نے بھی اس شعبے میں اپنی صلاحیتیں آزمانے کے مواقع تلاش کیے۔ اس سلسلے میں بنیادی کوششیں جموں میں ہوئی جہاں محمد عمر نورالٰہی صاحبان کی جوڑی نے اسٹیج اور ڈراما کے ساتھ اپنی بے پناہ دلچسپی کا اظہار کیا۔ انھوں نے نہ صرف خود ناٹک لکھے بلکہ اردو زبان میں ڈراما کی پہلی تاریخ وتنقید 'ناٹک ساگر' کے عنوان سے لکھی جو 1924 میں لاہور سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب آج تک اردو ڈرامائی ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔''

(جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نشو ونما، برج پریمی، ص100)

راس لیلا پارٹیوں کے سرینگر اور جموں میں آنے سے یہاں کے نوجوانوں میں بھی ڈراما کا شوق پیدا ہوا۔ ادھر پورے ملک میں آغا حشر کاشمیری کے ڈراموں کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ محمد عمر نورالٰہی صاحبان نے اس زمانے میں متعدد ڈرامے لکھے جن میں تین ٹوپیاں، بگڑے دل، ظفر کی موت، روح سیاست وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اس دوران کشمیر میں باہر سے کئی ڈراما کمپنیاں پہنچ چکی تھیں اور ان کمپنیوں نے یہاں کے لوگوں میں ڈراما کی تئیں دلچسپی پیدا کی۔ ایک پیشہ ور کمپنی بھی وجود میں آ گئی اور گاؤکدل سرینگر میں تھیٹر قائم کیا تھا۔

1947 کے بعد ریاست میں اردو ڈرامے نے خوب ترقی کی۔ جموں اور سرینگر میں اسٹیج ڈرامے کے ساتھ ساتھ ریڈیو ڈرامے بھی لکھے جانے لگے۔ ریڈیو ڈراما عوام میں بے حد مقبول ہوا اور اس نے ترقی کی نئی منزلیں طے کیں۔ موضوعات کے تنوع کے ساتھ ساتھ تکنیک کے نئے تجربے ہوئے، نمایاں لکھنے والوں میں پریم ناتھ پردیسی، اختر محی الدین، سوم ناتھ زتشی، رام کمار ابرول، ٹھاکر پونچھی، سکھ دیو سنگھ، علی محمد لون، نرہری رائے زادہ، پشکر ناتھ، زیڈ سیمی، وجے سمن، وجے سوری، بنسی نردوش، جتندر شرما، دینو بھائی پنڈت، ویدراہی، شبنم قیوم وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ 'جشن تمثیل' کے قیام کے ساتھ ہی ریڈیو پر ہر سال ڈرامے پیش کیے جاتے اور ڈرامائی ہفتہ انعقاد ہوتا تھا، جس نے فنکاروں کی حوصلہ افزائی میں اہم رول ادا کیا۔ اس دور کے ڈراموں میں زیڈ سیمی کا ڈراما 'جہانگیر کی موت'، دینو بھائی پنت کا 'سورگ کی کھوج' نرہری رائے زادہ کا 'پرانے دیپ نیا اجالا' وجے سمن کا 'انگ مان' رام کمار ابرول کے ڈرامے 'انسان جیت گیا، دھرتی اور ہم، چکی کے پاٹ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ریاستی کلچرل اکیڈمی نے نے بھی ڈرامے کے فروغ میں اہم رول ادا کیا۔ اس کے اہتمام سے کئی ڈراما کلب وجود میں آئے، جنھوں نے ڈرامہ نگاروں اور فنکاروں کو مالی امداد فراہم کر کے ڈرامے کے مزید امکانات روشن کیے۔

جموں و کشمیر میں اردو ادب کا ایک اہم نام پریم ناتھ پردیسی کا ہے۔ انھوں نے افسانوں کے ساتھ ساتھ ڈرامے بھی لکھے۔ پریم ناتھ پردیسی ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے۔ مجاہد شیروانی، قدہ گوجواری، سانکرات وغیرہ ان کے مشہور ڈرامے ہیں۔ پریم ناتھ پردیسی کے بعد سوم ناتھ زتشی، علی محمد لون، بنسی نردوش، ہری کرشن کول، ہردے کول بھارتی، آفاق احمد، شکیل الرحمٰن، حامدی کاشمیری، فاروق مسعودی وغیرہ کے ڈرامے بہت مقبول ہوئے۔ ان ڈراما نگاروں کے علاوہ وجے سمن سوسن، ویدراہی، دیانند کپور، گوپی ناتھ کوشک، شری رام شرما، دینو بھائی پنت، رام کمار ابرول، زیڈ سیمی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

علی محمد لون جموں و کشمیر کے ایک بڑے ڈراما نگار ہیں۔ ریڈیو میں ملازمت کے دوران ان کو اپنی صلاحیتوں کو نکھارنے کا موقع ملا۔ 'گھروندے' ان کا ایک مشہور ڈراما ہے جس نے اپنے زمانے میں تہلکہ مچایا۔ اس کے علاوہ لون کے ڈراموں میں دیوانے کا خواب، اور چٹان جیسے لازوال ڈرامے مشہور ہیں۔ ڈراما نگاروں میں ایک اہم نام پران کشور کا ہے۔ پران کشور ریڈیو میں ملازمت کرتے تھے جہاں وہ ڈرامے کی ہدایت کاری اور پروڈکشن پر کام کرتے تھے۔ انھوں نے کئی اچھے اور کامیاب ڈرامے لکھے۔

اگرچہ اکیسویں صدی کے شروع ہوتے ہی ہمارے ڈراما نگاروں کو بہت سے چیلنجوں کا سامنا کرنا پڑا جن میں کمی ہونے کے بجائے دن بہ دن اضافہ ہی ہوتا رہا تاہم اس دوران ہمارے ڈراما نگاروں نے اس صنف کی آبیاری بڑی خوش اسلوبی سے کی۔ مختلف کیبل، ٹی وی چینلوں اور سوشل میڈیا کے آتے ہی لوگوں کی تفریح کے مراکز بھی بدل گئے۔

اکیسویں صدی کی ابتدا میں جن ڈراما نگاروں نے دیگر اصناف کے ساتھ ڈراما نگاری میں طبع آزمائی کی ان میں سب سے پہلے نور شاہ کا نام قابل ذکر ہے جنھوں نے افسانے کے ساتھ ساتھ اُردو ڈرامے بھی لکھے۔ نور شاہ نے ریڈیو، ٹیلی ویژن اور تھیٹر تینوں کے لیے ڈرامے لکھے۔ ان میں متعدد ڈرامے شائع بھی ہوئے۔ 'سفر زندگی کا' ان کا ایک مشہور ڈراما ہے جس میں انھوں نے کشمیر کے بھائی چارے کی عکاسی کی ہے۔ ملاحظہ ہو ڈراما 'سفر زندگی کا' سے یہ مکالمے:

پاپا: دیکھا آمنہ کیا بول رہا ہے تمہارا بھائی

شکیل: جب سے میں یہاں آیا ہوں میں دیکھ رہا ہوں اور محسوس کر رہا ہوں کہ آپ مجھے استعمال کرنا چاہتے ہیں، اپنی انگلیوں پر نچانا چاہتے ہیں۔

پاپا: تم ایسی باتیں اس لیے کرتے ہو کہ تم ابھی جوان ہو، میری طرح بڑھاپے کی دہلیز تک نہیں آئے ہو، باتیں کرنا آسان ہے اور زندگی کے راستے تلاش کرنا ایک کٹھن کام ہے۔

(کشمیر کہانی: افسانے، ڈرامے، نور شاہ، ص135)

نور شاہ کے ریڈیائی ڈراموں میں میرے دکھ کی دوا کرے کوئی، امراؤ جان ادا اور میرا جی قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ میری دھرتی میری جنت، ویرانے کے پھول، دل کی بستی وھیل چنیر، اور چاند کے پھول، وادیاں خاموش ہیں وغیرہ ان کے مشہور ڈرامے ہیں۔ ان ڈراموں میں نور شاہ نے سماج کے مختلف مسائل اور پہلوؤں کی عکاسی بڑے ہی خوبصورت و فنکارانہ انداز میں کی ہے۔

نور شاہ کے بعد جن فنکاروں نے جموں و کشمیر میں ڈرامے کی صنف کی آبیاری کی ان میں ویریندر پٹواری ایک اہم نام ہے۔ ویریندر پٹواری نے 13 ریڈیائی ڈرامے، چھ اسٹیج ڈرامے، سات ٹیلی ویژن ڈرامے لکھے ہیں۔ بقول ڈاکٹر محی الدین زور کشمیری ان کا مشہور ڈراما 'گھر' ایپک تھیٹر کی تکنیک پر لکھا گیا ہے۔ اور ڈراما 'آخری دن' علامتی انداز میں لکھا گیا ہے۔ جس میں ملکی اور بین الاقوامی حالات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ 'انسان' بھی ان کا ایک مشہور ڈراما ہے۔ پٹواری ابسرڈ تھیٹر (Absurd Theatre) سے بھی متاثر نظر آتے ہیں جہاں زندگی کی لایعنیت ان کا خاص موضوع ہے۔

پروفیسر ظہور الدین نے تنقید و افسانہ کے ساتھ ساتھ ڈراما نگاری میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے ڈراموں میں موت کا جزیرہ، لندن، عبرت خیز، تیرا افسانہ، بریف کیس، نئی دنیا وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ظہور الدین دیومالائی اور ساطیری عناصر سے مدد لیتے ہیں اور انھیں بڑی خوبی کے ساتھ اپنے ڈراموں میں استعمال کرتے ہیں۔ ظہور الدین کا ڈراما 'بریف کیس' سماج میں پھیلی بد عنوانیوں اور اساتذہ کی یونینوں کے بارے میں ہے۔

جموں و کشمیر میں ڈرامے کا ایک اہم نام آنند لہر بھی ہے جنھوں بڑے کامیاب ڈرامے لکھے ہیں۔

انھوں نے فکشن پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ 'نروان' اور 'تپسوی کون' ان کے مشہور ڈرامے ہیں۔ 'تپسوی کون' کو سماجی موضوع پر ایک مکمل ڈراما کہا جاسکتا ہے۔ یہ ڈراما غلط طریقے سے دولت کمانے اور سماج میں اعلیٰ رتبہ پانے کے بارے میں ہے، جو قارئین کو چونکانے کے ساتھ ساتھ سوچنے پر مجبور بھی کرتا ہے۔ امن، دوستی اور یکجہتی پر لہر کا ایک مشہور ڈراما 'سرحد کے پیچھے' ہے۔

بلراج بخشی بنیادی طور پر ایک صحافی ہیں لیکن انھوں نے ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ سیاسی وسماجی موضوعات پر بڑی بے باکی سے لکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کا ڈراما 'قانون شکن' مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔

جموں وکشمیر میں ہم عصر اردو ڈرامے کی دنیا میں ایک اہم اور مشہور نام محمد امین بٹ کا ہے۔ ان کے ڈراموں میں روح کی آہٹ، 'سحر ہونے تک' کرن کرن اجالا، نئی صبح، تلاش، فیصلہ محفوظ ہے وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ محمد امین بٹ نہ صرف ڈرامے لکھتے ہیں بلکہ انھیں پرڈیوس بھی کرتے ہیں اور متعدد ڈراموں میں انھوں نے اپنی اداکاری کے بھی جوہر دکھائے ہیں۔ اپنے مشہور ڈرامے 'روح کی آہٹ' میں عربی روایت کو عصر حاضر کے ایک اہم مسئلے کے ساتھ ملایا ہے اور اس طرح اس ڈراما میں پیش کردہ پیغام آئینے کی طرح واضح ہوجاتا ہے۔ جاہلیت والے عرب میں بیٹیوں کو جنم دیتے ہی زندہ دفنایا جاتا تھا اور آج سائنس وٹکنالوجی کی مدد سے فیٹس(Foetus) کی جانچ کے ساتھ ہی ان کی زندگی کا خاتمہ جنم لینے سے پہلے ہی کیا جاتا ہے، جس نے انسان کے مکروہ چہرے کو بے نقاب کیا ہے:

''بچہ غلط فہمی تھی ان کی... مشینوں پر ایمان لائے ہیں... یہ فیصلے تو کہیں اور ہوتے ہیں مما... انسان کی بنائی ہوئی مشینوں میں نہیں...''

راجہ یوسف نہ صرف ایک اچھے افسانہ نگار ہیں بلکہ انھوں نے بڑے کامیاب ڈرامے بھی لکھے ہیں اور ایک اداکار کے طور پر انھوں نے اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ اپنی اداکاری اور تخلیق کاری پر ان کو متعدد انعامات واعزازات سے نوازا گیا ہے، جن میں انفوٹل ایوارڈ، یوتھ پاور ایوارڈ، ندائے کشمیر ایوارڈ قابل ذکر ہیں۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'کاغذی پیرہن' 1988 میں شائع ہوا۔ راجہ یوسف نے ریڈیو، ٹیلی ویژن اور تھیٹر کے لیے متعدد ڈرامے لکھے۔ ان ڈراموں میں زمانے کی ہوا، حساب ماسٹر، سنہرے ورق، آبشار، ست رنگ، رنگ بہ رنگ قابل ذکر ہیں۔ راجہ یوسف نے اپنے ٹیلی ویژن ڈراموں میں گھریلو مسائل کو اجاگر کیا ہے۔ بہو، بیٹیوں اور بزرگوں کے ساتھ ناروا سلوک ان کے ڈراموں بالخصوص ڈراما 'پرایا آنگن' کا خاص موضوع ہے۔

جموں وکشمیر میں ہم عصر ڈراما نگاروں میں اشرف عادل ایک اہم نام ہے جنھوں نے متعدد کامیاب اور مشہور ڈرامے لکھے ہیں۔ ان کے ڈرامے نشر بھی ہوتے ہیں اور کتابی صورت میں بھی شائع ہوئے ہیں۔ انھوں نے عالمی سطح کے مسائل کو اپنے ڈراموں کا موضوع بنایا ہے جیسے عالمی امن، بھوک، ایڈس وغیرہ جیسے مسائل۔ ساتھ ہی خالص تاریخی اور ادبی موضوعات پر بھی خامہ فرسائی کی ہے۔ حضرت محل، حکم حاکم، اور تمثیل داغ اس سلسلے میں ان کے اہم ڈرامے ہیں۔ ان کے ریڈیو اور ٹی وی ڈراموں کا مجموعہ 'چاند کا ہم شکل' (2014) میں منظر عام پر آچکا ہے جس میں شامل ڈرامے تکنیک اور موضوع کے حوالے سے نئے امکانات کا پتا دیتے ہیں۔ اشرف عادل کے ڈراما 'تمثیل داغ' کے حوالے سے ڈاکٹر محی الدین زور کشمیری لکھتے ہیں:

''تمثیل داغ' کے عنوان سے اشرف عادل کا ایک ریڈیائی ڈراما (2012) میں منظر عام پر آگیا ہے۔ یہ ڈراما بیشتر داغ دہلوی کے ہی کردار کے ارد گرد گھومتا ہے۔ مصنف نے اس ڈرامے میں راوی کے عمل دخل سے ایکشن کی رفتار کو تیز کرکے داغ کی زندگی کے اور بھی مختلف گوشوں کو اجاگر کیا ہے۔ اس میں ہمیں اس دور کی تہذیبی، تمدنی، سیاسی اور معاشرتی تصویر کی مختلف جھلکیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اس ڈرامے کا نقطۂ عروج بڑے فنکارانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔''

(جموں وکشمیر میں ہم عصر اردو ڈراما اور تھیٹر کی صورت حال، ڈاکٹر محی الدین زور کشمیری، اردو دنیا، فروری 2020)

اشرف عادل کے ریڈیو ڈراما 'آستین کا سانپ' سے یہ مکالمے ملاحظہ ہوں:

انسپکٹر: لیکن آپ کو یہ خنجر کس کے کمرے سے ملا۔

نوید: یہ خنجر مجھے ناصر کے کمرے سے ملا۔ کیونکہ مجھے پورا یقین تھا کہ خون اسی نے کیا ہوگا، ڈاکٹر ہاشم کے کہنے پر۔

ڈاکٹر ہاشم: ہاہاہا... ہاہاہا... ہاہاہا... انسپکٹر صاحب۔ آپ مجھے گرفتار نہیں کرسکتے۔

انسپکٹر: کیوں نہیں کرسکتا۔ آپ کیا ہم پر بھی کالا جادو کریں گے۔

ڈاکٹر ہاشم: کیونکہ... کیونکہ آپ کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے کہ قتل میں نے کیا۔

عادل اشرف کو زبان پر قدرت حاصل ہے اور کشمکش ان کے ڈراموں کی خاص خوبی ہے۔

جموں وکشمیر کے ایک اہم اور مشہور ڈراما نگار پدم شری موتی لال کیمو ہیں۔ کیمو اصل میں کشمیری زبان کے ڈراما نگار ہیں۔ دہلی کے NSD سے تربیت یافتہ ہے۔ کلچرل اکیڈمی کے ایڈیشنل سکریٹری رہ چکے ہیں اور ڈراما نگاری میں کئی انعامات حاصل کیے ہیں۔ موتی لال کیمو نے کشمیری میں ڈراما 'بھانڈ دہائی' کے عنوان سے ایک ڈراما لکھا جس کو انھوں نے بعد میں اُردو میں بھی منتقل کیا۔

ڈاکٹر مجید احمد محقق ونقاد ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے ڈراما نگار بھی ہیں۔ ان کا مشہور ریڈیو ڈراما 'ادھورے خواب' اب کتابی شکل میں بھی 2009 میں چھپ چکا ہے۔ کتاب کے آغاز میں ڈراما کے فن و تکنیک پر بھی روشنی ڈالی ہے اور ساتھ ہی اس ڈراما میں فن وتکنیک کا خاص خیال رکھا ہے۔

عصر حاضر میں منوج شیری کا شمار بھی اچھے ڈراما نگاروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے افسانے بھی لکھے ہیں۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اسٹیج کے لیے ڈرامے لکھتے ہیں۔ ان کے ڈراموں کا ایک مجموعہ 'بچھڑے بکھرے' (2016) میں چھپ چکا ہے۔ ان کے اس مجموعے کے ڈرامے، ٹیلی ویژن، ریڈیو اور اسٹیج پر پیش ہوچکے ہیں۔ اس مجموعے میں پانچ ڈرامے شامل ہیں: بکھرے بچھڑے، گھر، مشورہ، نور، پاسک ور۔ منوج شیری کے ڈراما کا خاص موضوع کشمیر کا بھائی چارہ اور یہاں کی خوبصورتی ہے۔ اساطیر اور دیومالا سے بھی مدد لیتے ہیں اور اپنے ڈراموں کے کردار ترتیب دیتے ہیں۔ سماج وثقافت کو بڑی خوبصورتی سے اپنے ڈراموں میں پیش کرتے ہیں۔ ڈراما 'گھر' میں گھر کی اہمیت اور بیمہ کمپنی کی بے رخی کو موضوع بنایا ہے جب ماسٹر جی کا گھر جل جاتا ہے تو بیمہ کمپنی معاوضہ ادا کرنے سے پہلے انکار کرتی ہے اور پھر ماسٹر جی کے دوست کی حکمت عملی سے مسئلہ سلجھ جاتا ہے اور یوں ماسٹر جی کو معاوضہ مل جاتا ہے۔ یوں اس ڈرامے کا موضوع آج کے حالات میں ایک عام موضوع لگتا ہے لیکن مادیت پرستی اور بیمہ کمپنی اور

دوسری تجارتی کمپنیوں کی چالاکیوں کو مدنظر یہ موضوع ایک اہم موضوع بن جاتا ہے اور آخر پر واضح ہوجاتا ہے کہ 'گھر' کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ ملاحظہ ہوں اس ڈرامے سے یہ اختتامی جملے:

منیجر: مجھے اب یقین ہوا کہ آپ صحیح بول رہے ہیں۔

ماسٹرجی: میرے خیال سے اب آپ کو ہمارا معاوضہ ادا کرنا چاہیے۔

منیجر: جی ضرور ہمیں اپنی غلطی کا اعتراف ہے اور کمپنی کو یہ معاوضہ دینے میں اب کوئی اعتراض نہیں، مگر میری علی محمد سے ایک گزارش ہے۔

علی محمد: جناب وہ کیا۔

منیجر: آپ کے گھر کا ماڈل ماپنے دفتر میں رکھنا چاہتے ہیں۔

علی محمد: جی ضرور رکھیں۔ مگر اس کے نیچے یہ ضرور لکھیں کہ گھر کی قیمت روپیوں سے ادا نہیں کی جاسکتی۔

منیجر: ایسا ہی ہوگا

(بکھرے بچھڑے: ڈرامے، منوج شیری۔ص82)

شوکت نسیم بھی ابھرتے ہوئے ایک اچھے ڈراما نگار ہیں۔ ان کے ڈرامے 'سچ کی جیت' کا انداز روایتی ہے، جس میں امیری وغریبی کے تصادم کو دکھایا گیا ہے۔ اس ڈرامے میں سماج کی عورت دبی ہوئی نہیں بلکہ وہ ظلم کے خلاف آواز اٹھاتی نظر آتی ہیں۔ شوکت نسیم کے ڈرامے نئے امکانات کا پتا دیتے ہیں۔ وہ نئے نئے تجربے کرنے میں یقین رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں نئے پن کا احساس ہوتا ہے۔

عارض ارشاد نے اپنے ریڈیائی ڈرامے 'آخری ثبوت' میں سائبر کرائم کے مسئلے کو اجاگر کیا ہے، جو آج انٹرنیٹ کے پھیلاؤ اور سوشل میڈیا کے ہوتے ہوئے دنیا کا ایک بڑا مسئلہ ہے۔

شوکت شہری بھی ڈراما کا ایک اہم نام ہے۔ شوکت شہری کو ڈراما نگاری کا فن اپنے والد تجو سیلانی سے ورثے میں ملا ہے۔ 2006 میں کلچرل اکیڈمی ڈراما فیسٹول کے تحت شوکت شہری کا ڈراما 'ایک پوٹلی ارمانوں کی' ٹیگور ہال سرینگر میں پیش کیا گیا۔ اس کے علاوہ 'ہم زندہ ہیں' اور 'منٹو کا فارمولہ' قابل ذکر ہیں۔ تقریباً پچھلے تیس سال سے ان کے ڈرامے ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اسٹیج کی زینت بنے ہوئے ہیں۔

مشتاق مہدی تقریباً پچھلے چالیس سال سے اردو ادب کی آبیاری کررہے ہیں۔ متعدد کامیاب افسانوں کے علاوہ انھوں نے کئی کامیاب ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ 'خواب' اور 'کالے لنگر' ان کے دو مشہور ڈرامے ہیں۔ اس کے علاوہ زاہد مختار نے بھی کئی اُردو ڈرامے لکھے ہیں۔

نذیر جہانگیر نے بھی کئی کامیاب ڈرامے لکھے ہیں۔ 'بہتے جسم' کے عنوان سے ان کا ٹیلی ویژن ڈراما 2005 میں شائع ہو چکا ہے۔ بہتے جسم ایک مزاحیہ ڈراما ہے لیکن بیچ بیچ میں اس میں سنجیدگی کا عنصر بھی پایا جاتا ہے۔ نذیر جہانگیر سماج میں مسائل کو بھی اجاگر کرتے ہیں اور ساتھ ہی ان کا حل بھی بتا دیتے ہیں۔

غلام نبی شاہد نے افسانوں کے ساتھ ساتھ کچھ ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ اردو اور کشمیری دونوں زبانوں میں ڈرامے لکھے ہیں۔ 'خواب سراب' اور 'زندگی' ان کے کامیاب ڈرامے ہیں۔

پرویز ملک نے کئی ڈرامے لکھے ہیں۔ راجوری سے تعلق رکھتے ہیں۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اسٹیج کے لیے کئی ڈرامے لکھے۔ ان کے ڈراموں میں فرصت کے رات دن، ایک چاند دوراتیں، اونچے دروازے، اور 'وہ دروازہ کھل جائے گا' قابل ذکر ہیں۔ 'وہ دروازہ کھل جائے گا' پر کلچرل اکیڈمی سے انعام بھی حاصل کیا ہے۔

ریاض معصوم قریشی ایک اچھے افسانہ نگار اور ناول نگار ہیں۔ 1984 میں ان کا ناول 'خیالوں کے قفس میں' شائع ہوا۔ اس ناول کا ریڈیو ڈراما روپ بھی نشر ہو چکا ہے۔ اردو میں تقریباً پچاس ریڈیو اور ٹیلی ویژن ڈرامے لکھے ہیں۔ ان کے ڈرامے نفسیات، طبقاتی کشمکش کے مسائل پر ہوتے ہیں۔ 'وہ اجنبی اور کتا' ان کا مشہور ڈراما ہے۔

اکبر جے پوری نہ صرف ایک بڑے شاعر گزرے ہیں بلکہ انھوں نے ایک مشہور اور کامیاب ڈراما 'ملاپ' بھی لکھا ہے۔

مشتاق کاک جموں وکشمیر کے ایک کامیاب ڈراما نگار ہیں۔ انھوں نے بڑے ڈراما فیسٹول میں اپنے ڈرامے پیش کیے اور انعامات سے نوازے گئے۔

ولی محمد خوشباش نے بھی کئی کامیاب ڈرامے لکھے ہیں۔

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ جموں وکشمیر میں اردو ڈراما کی صورت حال تسلی بخش ہے۔ حالانکہ ابھی اس میں مزید بہتری لانے کی ضرورت ہے۔ موضوعات کی سطح پر بھی اور تکنیکی سطح پر بھی۔ ہمارے ڈراما نگاروں کو مقامی موضوعات کے ساتھ ساتھ عالمی موضوعات پر بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے، جس سے ڈراما کے قارئین وسامعین کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو۔ ہمیں ڈراما کے فن کو سنجیدگی سے لینے کی ضرورت ہے اور کالج سے لے کر یونیورسٹی تک اس کے تعلیمی نصاب پر خاص توجہ دینی ہوگی۔ جہاں جدید تکنیک پر توجہ دینی کی ضرورت ہے وہاں ڈراما میں زبان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اس پر بھی توجہ دینی ہوگی۔ اس سلسلے میں کالج اور یونیورسٹی میں ورکشاپ منعقد کرنے ہوں گے۔ موجودہ دور میں ڈراما اور ڈرامے کی تکنیک کو سمجھانے کی ضرورت ہے۔ ڈراما اور تھیٹر کے مقاصد کو اجاگر کرنا ضروری ہے۔

حوالہ جات

1. جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نشوونما، برج پریمی، دیپ پبلی کیشنز، سرینگر کشمیر، 1992
2. اردو ڈراما کا ارتقا: عشرت رحمانی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1978
3. جموں وکشمیر میں ہم عصر اردو ڈراما اور تھیٹر کی صورت حال، ڈاکٹر محی الدین زور کشمیری، اردو دنیا، فروری 2020
4. ہمارا ادب، ہم عصر ڈراما نمبر، جموں وکشمیر کلچرل اکیڈمی لال منڈی سرینگر
5. ریاست جموں وکشمیر میں اردو ڈراما، پاکیزہ اختر، اودھ نامہ اخبار، 26 جولائی 2018
6. کشمیر کے فکشن نگار اور ڈراما نگار: جگن ناتھ ٹھاکر پونچھی، احمد سہیل، مکالمہ پورٹل
7. نورشاہ، الیس معشوق احمد، الاشتراک آن لائن پورٹل، ستمبر، 2021
8. ناٹک ترج، موتی لال کیمو، جموں وکشمیر کلچرل اکیڈمی سرینگر، 1980
9. بکھرے، بچھڑے،: ڈرامے، منوج شیری، گلوبل کمیونیکیشنز، سرینگر، 2016
10. کاغذی پیرہن، راجہ یوسف، 1988
11. کشمیر کہانی: افسانے، ڈرامے، نور شاہ، میزان پبلشرز، سرینگر، 2012
12. چاند کا ہم شکل: ریڈیو، ٹی وی ڈرامے، اشرف عادل، کاف پرنٹرس، سرینگر، 2013
13. شکر بابا، مشتاق مہدی، مہدی پبلیکشنز، سرینگر، 2019

■

Dr. Ashraf Lone
R/O: Wagub Sopore
Distt.: Baramulla- 193201 (J&K)
Mob.:9811112564
ashjnu.09@gmail.com

نوید جعفری دہلوی

فارسی شاعری میں دارا شکوہ کا ادبی و فکری مقام

فارسی شعر و ادب میں دارا شکوہ کی ادبی، فکری اور صوفیانہ حیثیت اب تک تحقیقی دنیا میں مکمل طور پر اجاگر نہیں ہو سکی تھی۔ خوش آئند امر یہ ہے کہ حال ہی میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (نئی دہلی) نے دارا شکوہ کا فارسی دیوان پہلی بار مرتبہ و ترجمہ کے ساتھ شائع کیا ہے، جو تحقیق و تنقید کے نئے در وا کرتا ہے۔ اس اہم علمی خدمت کو پروفیسر شاہد نوخیز صاحب نے نہایت محنت و دیانت کے ساتھ انجام دیا ہے۔ انھوں نے نہ صرف دیوان کے متن کی تصحیح کی، بلکہ فارسی اشعار کا اردو ترجمہ بھی مہیا کیا ہے، جس سے دارا شکوہ کے شعری اسلوب، فکری پس منظر اور صوفیانہ رجحانات کو سمجھنے میں آسانی پیدا ہوتی ہے۔ اس دیوان کی اشاعت نے دارا شکوہ کی شاعری کو نئے زاویوں سے پڑھنے، پرکھنے اور سمجھنے کا موقع فراہم کیا ہے، اور اسی تناظر میں یہ مقالہ ترتیب دیا گیا ہے تاکہ فارسی ادب میں دارا شکوہ کے مقام و مرتبہ کا تحقیقی جائزہ لیا جا سکے۔

قبل ازیں کہ دارا شکوہ کے فارسی دیوان اور اس کی شاعری پر کسی قسم کی کوئی گفتگو کی جائے۔ مختصر الفاظ میں اس کے حالات زندگی اور ادبی خدمات پر ایک سرسری نظر ڈالنی ضروری ہے، جس کی روشنی میں اس کے شاعرانہ افکار کی اور بہتر طرز پر ادراک و تفہیم ہو سکے۔

سوانح: مغل شہنشاہ شہاب الدین خرم ملقب بہ شاہ جہاں اور ملکۂ ہندوستان ممتاز محل کا فرزند ارجمند شہزادۂ بلند اقبال دارا شکوہ، 20 مارچ 1615 کو شہر اجمیر میں پیدا ہوا۔ اس کے بچپن کے حالات کے متعلق تفصیلی معلومات تو نہیں ملتیں البتہ اتنا ضرور پتہ ہے کہ جب اس کی عمر بارہ سال تھی تو اس کے والد شاہ جہاں نے اپنے باپ جہانگیر کے خلاف بغاوت کردی تھی مگر ناکام ہوگیا۔ جس کے نتیجہ میں اس کے دادا (جہانگیر) نے سزا کے طور پر اس کے تینوں بیٹوں کو جن میں وہ بھی شامل تھا، اپنی تحویل میں دینے کی شرط رکھی، پس چاروناچار شاہجہاں کو اپنے باپ کی یہ شرط ماننی پڑی۔ دارا شکوہ کو لاہور کے قلعہ میں نظر بند کر دیا گیا۔ وہاں اس کی دیکھ بھال اس کی دادی نور جہاں نے کی۔ مذکورہ قلعہ میں وہ دو سال تک نظر بند رہا اور جب شاہ جہان بادشاہ ہوا، تب وہ آگرہ واپس آیا اور اس کی تعلیم و تربیت کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس کے استادوں میں عبداللطیف سلطان پوری جو فقہ حنفی کے جید عالم دین تھے اور اور شیخ احمد دہلوی کے نام سر فہرست ہیں۔ مذکورہ شہزادے کو خطاطی و خوشنویسی سے غیر معمولی شغف تھا اور اس فن میں اس کے استاد ملا عبدالرشید خوشنویس تھے۔ جو اپنے زمانے کے ایک ماہر فن استاد تسلیم کیے جاتے تھے۔

دارا شکوہ کی شادی اس کی ماں ممتاز محل کی مرضی سے اس کے ماموں کی بیٹی 'نادرہ بیگم بنت سلطان پرویز' سے ہوئی تھی اور اس کے بطن سے چار لڑکے اور دو لڑکیاں ہوئیں۔

خوشنویسی کے علاوہ دارا شکوہ دیگر علوم و فنون مثلاً شعر و ادب، فلسفہ، مختلف زبانوں اور ہنروں سے بھی بے حد دلچسپی رکھتا تھا۔ وہ تعلیم کے علاوہ اپنا وقت علما و فضلا اور صوفیا وغیرہ کی صحبت میں گذارتا تھا۔ وہ 1055ھ مطابق/1646 میں 'ملا شاہ بدخشی' کا مرید ہوگیا اور پھر اس کے بعد ان دونوں کے درمیان ملاقاتوں اور تبادلہ خیال کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا۔ اور اس طرح وہ 'قادریہ سلسلہ' سے وابستہ ہوگیا۔

دارا شکوہ صوفیا اور دیگر مذاہب کے پیشواؤں مثلاً عیسائیوں، یہودیوں، ہندوؤں، برہمنوں اور جوگیوں وغیرہ سے مراسم رکھتا تھا اور اپنے زمانہ سے الگ خیالات رکھنے کی وجہ سے دارا شکوہ پر کفر و الحاد کا الزام لگایا گیا اور اس کے بھائیوں نے اس کی مخالفت شروع کر دی۔ ان کی یہ مخالفت، نفرت میں تبدیل ہونے لگی۔ تخت و تاراج کے لیے دارا شکوہ اور اورنگ زیب کے درمیان جو کشمکش تھی، بالآخر وہ ایک جنگ پر منتج ہوئی۔ 1069ھ مطابق/1659 میں جو جنگ اس کی اورنگ زیب کے ساتھ ہوئی، اس میں وہ ہار گیا۔ اس نے ایران میں پناہ لینے کا منصوبہ بنایا مگر بدقسمتی سے اس سے پہلے کہ وہ ایران پہنچتا، گرفتار کر لیا گیا اور اورنگ زیب کے حکم سے 30 اگست 1659 میں قتل کر دیا گیا۔

(دیوان دارا شکوہ، ص 25-19)

تصانیف و افکار: ملا شاہ کی صحبت میں دارا شکوہ کا رجحان تصوف و فلسفہ کی طرف زیادہ ہوگیا اور وہ اپنا زیادہ تر وقت ایسی فلسفیانہ کتابوں کے مطالعہ میں صرف کرنے لگا جن میں تصوف اسلامی اور ویدانت کے مختلف مسائل سے بحث ہوئی۔ اسی دوران مختلف خیالات کے درویشوں، صوفیوں اور رشیوں سے اس کی مسلسل اور طویل ملاقاتیں ہوتیں رہیں اور ان آزاد خیال لوگوں سے ان مسائل پر گفتگو ہوئی۔ اس زمانے کے بڑے بڑے آزاد صوفیا مثلاً 'سرمد'، 'شیخ صوفی'، 'شاہ محب اللہ الہ آبادی' اور 'بابا لال' وغیرہ نے شہزادے کے مذہبی خیالات پر گہرا اثر ڈالا۔ چنانچہ اس کے بعد کی تصانیف مثلاً 'رسالۂ حق نما'، 'حسنات العارفین' اور 'مجمع البحرین' میں وہ اپنے متضاد بیانات کو نبھانے کی کوشش کرتا ہے اور اپنے دلائل کی تائید میں زمانہ گذشتہ کے دوسرے مشہور صوفیا سے منسوب اپنے عقائد کی تائید میں قوال پیش کرتا ہے۔ اسی طرح 'مجمع البحرین' کی تصنیف کا مقصد اس بات کی تلقین کرنا ہے کہ ہندو فقراء سے مل کر اور ان سے مذکورہ مضامین پر بحث و مباحثہ کر کے اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ اسلام اور ہندو مذہب میں محض فروعی مسائل کا فرق ہے ورنہ حقیقت میں دونوں مذاہب کی روح اور ان کا منشا ایک ہی ہے۔ چنانچہ اس کتاب کے ذریعہ دارا شکوہ، تصوف اسلامی اور ویدانت کو قریب لانے کی

کوشش کرتا ہے۔ شہزادے کے 'میر منشی چندر بھان برہمن' نے اس سلسلہ کی مشہور کتاب 'سوال و جواب داراشکوہ و بابا لال' مرتب کی۔ داراشکوہ نے خود بعض پنڈتوں کی مدد سے 'اپنشد' کا فارسی میں ترجمہ کیا اور اس کو 'سر اکبر' یا 'سرالاسرار' کے نام سے موسوم کیا۔

(دیوان داراشکوہ ص 34-42)

شعرا کی سرپرستی: مغل بادشاہوں اور شہزادوں کی طرح داراشکوہ نے بھی شعرا کی سرپرستی کے فرائض انجام دیے۔ ان شاعروں کی صحیح تعداد بتا پانا تو مشکل ہے جن کی وہ سرپرستی کیا کرتا تھا۔ البتہ 'مراۃ الخیال' کے مصنف نے لکھا ہے کہ ان تمام شعرا میں 'مرزا دانش' (المتوفی 1076ھ/ 1665) اس کا پسندیدہ ترین شاعر تھا۔ داراشکوہ نے اس کو مندرجہ ذیل غزل کے عوض ایک لاکھ روپیہ کی رقم انعام میں دی تھی۔

موسم آن شد کہ ابری تر چمن پرور شود
نکہت گل مایۂ شور جنون در سر شود
تاک را سیراب سازد ابر نیسان در بہار
قطرۂ تامیٔ تواند شد چرا گوہر شود
نالہ بلبل نہان در پردۂ برگ گل است
بید ماخم کاش از این یک پردہ نازک ترشود
ما بہ ذوق گریۂ ہستی در این بزم آمدیم
میٔ بدہ ساقی بقدری آن کہ چشم تر شود
راز پوشیدن نیامد دانش از بیتاب عشق
درمیان انجمن پروانہ خاکستر شود

ترجمہ:

''اب وہ موسم آ گیا ہے کہ نم دار بادل چمن کو نمو بخشے، اور گل کی خوشبو، جنون انگیز جوش و خروش کا سبب بن جائے۔

بہار میں نیسان کا بادل اگر تاک کو سیراب کر دے، تو وہ قطرہ شراب بن سکتا ہے، پھر گوہر کیوں بنے؟

بلبل کا نالہ گل کی پتی کے پردے میں چھپا ہوا ہے، کاش ہماری شاخ بید اس نازک پردے سے بھی زیادہ نرم ہو جائے۔

ہم اس محفل میں زندگی کے گریہ کے ذوق کے ساتھ آئے ہیں، اے ساقی! شراب اتنی دے کہ آنکھیں نمناک ہو جائیں۔

عشق کی بے تابی نے دانش کو راز چھپانا سکھایا ہی نہیں، کہ وہ پروانہ جو محفل میں آتا ہے، راکھ بن کر رہ جاتا ہے۔''

مذکورہ بالا شاعر کے علاوہ اس کا دوسرا منظور نظر شاعر شاہجہاں کے دربار کا ایک امیر 'چندر بھان برہمن' تھا۔ صاحب مراۃ الخیال کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ شہزادے نے شاہجہاں کی موجودگی میں مندرجہ ذیل شعر پڑھنے کو کہا، جس کو وہ خود بہت پسند کرتا تھا۔

مرادلیست بکفر آشنا کہ چندین بار
بہ کعبہ بردم و بازش برہمن آوردم

ترجمہ: ''میں اُس کفر آشنا سے راضی نہیں: کہ کئی بار کعبہ گیا اور پھر اُسے برہمن لا کر دیا۔''

بادشاہ شاعر کی اس جرأت پر برہم ہوا لیکن افضل خان نے سعدی شیرازی کے مذکورہ ذیل شعر کا حوالہ دے کر، اس کو مطمئن کر دیا، بیت۔

خر عیسٰی اگر بہ مکہ رود
چون بیاید ہنوز خر باشد

(مراۃ الخیال، ص 214)

ترجمہ: ''اگر حضرت عیسٰی کا گدھا مکہ بھی چلا جائے، جب واپس آئے گا، تب بھی وہ گدھا ہی رہے گا۔''

داراشکوہ ہندو علما و شعرا اور منشیوں سے بہت انس رکھتا تھا اور وہ ان کی حوصلہ افزائی سے کبھی دریغ نہ کرتا تھا۔ (ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ، ص 49)

داراشکوہ تذکرہ نگاروں کی نظر میں: شعرائے فارسی کے تذکروں میں ہمیں صرف مندرجہ تین تذکروں میں داراشکوہ کا ذکر بحیثیت فارسی گو شاعر ملتا ہے۔

مقالات الشعرا تالیف میر علی شیر قانع تتوی (متوفی سنہ 1203ھ) میں ان کا ذکر ہے جس کا اردو ترجمہ یوں ہے:

''داراشکوہ، جو شاہ جہاں بادشاہ کے فرزند تھے، 'قادری' تخلص رکھتے تھے۔ وہ عمدہ اخلاق اور کشادہ نظری کے ساتھ مشہور تھے۔ وہ توحید اور تصوف میں یگانہ وقت تھے اور سرمد کے عقیدت مندوں میں شمار ہوتے تھے۔ ان کی صحبت اکثر اہل سلوک کے ساتھ رہتی تھی۔

انھوں نے توحید کے لطائف پر کئی رسالے لکھے، جن میں سکینۃ الاولیاء، رسالہ حق نما اور 'حسنات العارفین' شامل ہیں۔

جب وہ اپنے والد (شاہ جہاں) سے ناراض ہو کر سندھ کی طرف روانہ ہوئے، تو خیال کیا کہ شاید ٹھٹھہ ان کے قیام کے لائق ہو۔ جب وہ ٹھٹھہ پہنچے اور دیکھا کہ ان کی شان و شوکت کے مطابق اس شہر کے مکانات مناسب نہیں ہیں، تو ایک جانب سے شہر میں داخل ہوئے اور دوسری جانب سے رنجیدہ دل کے ساتھ نکل گئے۔

غصے کی حالت میں، قاضی ابراہیم تتوی کو جو ان کے ہمراہ تھا، حکم دیا کہ شہر کو آگ لگا دی جائے۔ لہٰذا چند بوسیدہ محلوں کو آگ لگا دی گئی، ابھی تک وہ 'سوختہ گھاٹ' کے لقب سے مشہور ہے۔ الغرض، سن 1070 ہجری میں اس فانی دنیا کو الوداع کہا۔ ''صاحب بہشت برین''۔ ان کا ایک دیوانِ شعری بھی موجود ہے۔

ایک بار جب میر رضی 'دانش' نے یہ شعر کہا۔

تاک را سیراب کن ای ابر نیسان در بہار
قطرہ تا می می تواند شد، چرا گوہر شود؟

''اے نیسان کے بادل! بہار میں تاک کو سیراب کر، کیونکہ اگر قطرہ شراب بن سکتا ہے، تو پھر وہ گوہر کیوں بنے؟''

تو ہر ایک نے اپنے اپنے طور پر شعر کا جواب دینے کی کوشش کی، اور داراشکوہ نے اس کے جواب میں یہ شعر کہا۔

سلطنت سہل ست خود را آشنایِ فقر کن
قطرہ تا دریا تواند شد چرا گوہر شود

''سلطنت آسان ہے، خود کو فقر سے آشنا کر: قطرہ اگر دریا بن سکتا ہے، تو گوہر کیوں بنے؟''

کلمات الشعراء تالیف محمد افضل سرخوش میں بھی ذکر ہے، فارسی اقتباس کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

''وہ (داراشکوہ) جو 'شاہ بلند اقبال' کے لقب سے مشہور تھا، شاہ جہاں کا ولی عہد، ایک ایسا بادشاہ زادہ تھا جو خوش اخلاق، خوش فکر، خوش رو، بردبار، صوفی مشرب، فقیروں کا دوست، موحد اور محقق تھا۔ وہ بلند ہمت اور تیز ذہن رکھتا تھا، اور صوفیہ کے مطالب کو رباعی اور غزل میں منظوم کیا کرتا تھا۔ اپنے اس عقیدے کی بنا پر کہ وہ سلسلہ عالیہ قادریہ سے وابستہ ہے، وہ 'قادری' تخلص اختیار کرتا تھا۔

اس نے ملا شاہ، جو میاں شاہ میر لاہوری کے خلیفہ تھے، کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ وہ اس درجہ کا تحمل اور وقار رکھتا تھا کہ... علم تصوف میں اس کی بلند پایہ تصانیف موجود ہیں، اور اس نے نہایت باریک سوالات بھی تحریر کیے۔ اس نے ایک مختصر دیوان بھی مرتب کیا ہے۔''

خزینۃ الاصفیاء تالیف غلام سرور:

نوٹ: اس تذکرے کا فارسی متن بہت تلاش کرنے پر بھی نہیں ملا، ایک اردو ترجمہ دستیاب ہوا، جس کا اقتباس پیش خدمت ہے:

''شہزادہ محمد دارا شکوہ بن شہاب الدین محمد شاہ جہاں بادشاہ قدس سرہ: حضرت ملا شاہ بدخشانی کے نامور مرید و خلیفہ، ظاہر و باطنی اوصاف کے جامع، بادشاہ صورت اور درویش سیرت تھے۔ مسائل تصوف اور سلوک و عرفان سے بڑی وابستگی تھی۔ حضرت شیخ محمد میاں میرؒ کی خدمت میں بھی حاضر رہ کر اخذ فیض کیا تھا۔ اپنے مرشد کی طرح نظریۂ وحدۃ الوجود (ہمہ اوست) کے زبردست حامی و مبلغ تھے۔ متعدد کتب کے مولف و مصنف ہیں۔ نظم و نثر پر مہارت کامل رکھتے تھے اور اپنے خیالات کو بڑی خوبی و آزادی کے ساتھ بیان کرتے۔ 1070ھ میں عالمگیر کے حکم سے قتل ہوئے۔

سفینۃ الاولیاء، سکینۃ الاولیاء، رسالۂ حق نما، حسنات العارفین یا شطحیات، مجمع البحرین، سر اکبر، دیوان اکسیر اعظم ان کی مشہور تصانیف ہیں۔''

(خزینۃ الاصفیاء، اردو ترجمہ، ص 262)

دیوان فارسی دارا شکوہ قادری: ایک مدت دراز تک عام رائے یہی بنی ہوئی تھی کہ دارا شکوہ کا فارسی دیوان اب ناپید ہو گیا ہے مذکورہ شہزادے کے دیوان کے جو قلمی نسخے خود اس کی زندگی میں تیار ہوئے ہوں گے، وہ دستبرد زمانہ کی نذر ہو گئے۔ دیوان کی عدم موجودگی کے متعلق یہ خیال ظاہر کیا گیا کہ سیاسی اختلافات اور علما کے مذہبی تعصب کی وجہ سے دارا شکوہ کا دیوان باقی نہ رہ سکا۔ یہ بات سراسر غلط ہے کیوں کہ مذکورہ شہزادے کی دیگر تصانیف جو قابل اعتراض سمجھی جاتی تھیں، ان کے قلمی نسخے اکثر و بیشتر ہندوستان اور بیرون ممالک میں دستیاب ہیں۔ دارا شکوہ کے دیوان کی ندرت کے بارے میں آئندہ صفحات میں تفصیل سے گفتگو کی جائے گی۔ دارا شکوہ کے فارسی دیوان کے قلمی نسخوں کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

دیوان دارا شکوہ کے قلمی نسخے :

نسخۂ نیشنل میوزیم آف پاک: خان بہادر مولوی ظفر حسن نے 1939 میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے مجلہ میں دارا شکوہ کے دیوان پر ایک مضمون لکھا اور اس بات کا انکشاف کیا کہ ان کے ذاتی کتب خانے میں مذکورہ دیوان کا ایک ناقص نسخہ موجود ہے۔ یہی نسخہ 1950 میں نیشنل میوزیم آف پاک کی تحویل میں آیا۔ مذکورہ نسخہ انتہائی بوسیدہ حالت میں تھا۔ جس میں محض 48 اوراق ہی تھے۔ اس کے ہر ورق پر 13 سطریں بہ خط شکستہ ہیں۔ کامل و ناقص غزلیات کی تعداد 133 اور رباعیات کی تعداد 28 ہے۔ مذکورہ دیوان کے سرورق پر یہ عبارت لکھی ہے۔

دیوان شاہزادہ دارا شکوہ قادری

اور آخری صفحے پر لکھا ہے۔

تمت دیوان داراشکوہ

اس مخطوطے کے کئی اوراق غائب بھی ہیں۔

پنجاب پبلک لائبریری لاہور: یہ خیال کیا جاتا تھا کہ دارا شکوہ کے دیوان کا یہی واحد مخطوطہ موجود ہے۔ لیکن بعد میں ایک اور قلمی نسخے کا پتہ چلا۔ اس نسخے کی موجودگی کا علم پنجاب پبلک لائبریری لاہور میں ہوا۔ اس مخطوطے میں اول تا آخر کہیں بھی دارا شکوہ کا نام تو نہیں لکھا مگر غزلوں کے مقطعوں میں قادری تخلص ضرور ملتا ہے۔ چنانچہ لائبریری کی فہرست مخطوطات میں لکھا ہے:

''موصوف کے پورے نام اور حالات کی تعیین و تحقیق نہیں ہو سکی۔ قادری کی رباعیات و غزلیات (جو حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب دی گئی ہیں) ایک مکمل مجموعہ کی شکل میں ہیں۔ اشعار سادہ اور خیالات سطحی پر مشتمل ہیں۔ اکثر ابیات اور بالخصوص کچھ مقطعوں میں نظریہ ہمہ اوست کی حمایت ہے۔ ملا عبدالقادر بدایونی (المتوفی 1004ھ) کا تخلص بھی قادری تھا لیکن ان کا کوئی دیوان معلوم نہیں۔ ایک کمزور قیاس یہ ہے کہ یہ انہی کا دیوان ہوگا۔''

جب نیشنل میوزیم آف پاک کے قلمی نسخے سے مذکورہ نسخے کا مقابلہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اصل میں دیوان دارا شکوہ کا ہی دوسرا نسخہ ہے۔ پنجاب پبلک لائبریری والا نسخہ بہت عمدہ کاغذ پر خوشخط نستعلیق میں ہے۔ یہ نسخہ کامل ہے اور اسی کے 70 صفحات ہیں۔ ہر ورق پر 14 سطریں ہیں۔ غزلوں کی کل تعداد 210 اور 141 رباعیاں ہیں۔

مطبوعہ نسخہ ریسرچ سوسائٹی: دیوان دارا شکوہ کو سب سے پہلے احمد نبی خان نے ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان سے 1969 میں شائع کیا تھا۔ مرتب نے مذکورہ بالا نسخوں کی بنیاد پر دیوان کو مرتب کرنے کا فریضہ انجام دیا اور اس کے ساتھ انھوں نے ایک بے حد اہم کام اور انجام دیا کہ دارا شکوہ کے اشعار کی ایک اچھی خاصی تعداد، کو بھی جمع کر دیا جو اس کی دیگر تصانیف مثلاً سکینۃ الاولیا، رسالۂ حق نما، حسنات العارفین، مجمع البحرین وغیرہ میں موجود تھی۔ ان میں سے بعض اشعار اور رباعیات تو ایسی ہیں کہ دیوان کے دونوں مخطوطوں میں نہیں ملتیں۔ اس لیے انھوں نے مذکورہ دیوان کا متن مرتب کرتے وقت ان تمام رباعیات اور منفرد اشعار کو مناسب جگہوں پر نقل کر دیا۔ اس طرح دونوں مخطوطات کا موازنہ کرنے اور دیگر ذرائع سے اشعار کے اضافہ کے بعد، اب مطبوعہ نسخہ 215 غزلیات اور 145 رباعیات پر مشتمل ہے۔ (دیوان داراشکوہ، ص 42-19)

نسخہ قومی کونسل: اس نسخے کو دوسری مرتبہ پروفیسر شاہد نوخیز صاحب نے از سر نو مرتب کر کے، ایک عالمانہ مقدمہ کے ساتھ ترتیب و تدوین دیا اور مذکورہ دیوان میں موجود تمام فارسی اشعار کا اردو میں ترجمہ بھی کیا۔ اس نسخہ کو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی نے 2021 میں زیور طبع سے آراستہ کیا۔ اس ادبی خدمت کی وجہ سے ہی آج دارا شکوہ کا دیوان ہر خاص و عام کی دسترس میں ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس نسخہ کو مذکورہ بالا نسخے پر فوقیت حاصل ہے۔

شاعری: دارا شکوہ کی شاعری پر، اس کے مذکورہ بالا افکار و نظریات کی چھاپ ہے۔ اگرچہ اس کی نثر کی کتابوں کی طرح اس کی شاعری کے مختلف ادوار کا تعین نہیں کیا جا سکتا لیکن پھر بھی اس کے مطالعے سے اس کے صوفیانہ غور و فکر کے تدریجی ارتقا کا پتہ چلتا ہے۔

موضوعات: دارا شکوہ کی ابتدائی غزلیات میں جن کو اس کا ابتدائی کلام خیال کیا جاتا ہے، اسلام سے سچی وابستگی، خدا کی وحدانیت، رسولؐ اور خلفائے راشدینؓ سے گہری محبت اور عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔

دارا شکوہ صوفیا اور درویشوں سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ خاص طور سے شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، شیخ بہاء الدین زکریاؒ، حضرت میاں میر صاحبؒ اور اپنے پیر و مرشد ملا شاہ بدخشیؒ سے اسے گہری عقیدت تھی۔ ان میں سے اکثر بزرگ صوفیا کی تعریف میں وہ متعدد جگہ رطب اللسان نظر آتا ہے۔ جیسا کہ ذیل کے اشعار سے ظاہر ہے۔

حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کی تعریف یوں کی ہے۔

قطب دنیا و دین بہاء الدین
نقشبند یقین بہاء الدین

قادری ہر کہ دامنش بگرفت
دار خلد بریں بہاء الدین

(دیوان دارا کونسل،ص24-133)

ترجمہ:'' دنیا و دین کے قطب بہاء الدین ہیں،نقشبند یقینی، بہاءالدین۔

جو بھی قادری ہو اور ان کا دامن تھام لے، اس کے لیے جنتِ بریں ہے بہاءالدین۔''

ملاشاہ بدخشیؒ کی تعریف میں یہ اشعار ملاحظہ کیجیے۔

حضرت ملا شہ آن شاہ ما
کو مرید خاص میان میر ہست
ہرمسی را زر کند ارشاد او
طالبان را فقر او اکسیر ہست

(دیوان دارا،قومی اردو کونسل،ص27)

ترجمہ:''حضرت ملا شاہ، وہی ہمارے بادشاہ ہیں، جو میر (داراشکوہ) کے خاص مرید ہیں۔

ان کی رہنمائی ہر تانبے کو سونا بنا دیتی ہے، اور طالبوں کے لیے ان کا فقر اکسیر ہے۔

داراشکوہ نے اپنے اشعار میں ان جگہوں کی بھی تعریف کی ہے جن سے اس کے مرشد ملا شاہؒ اور حضرت میاں میرؒ تعلق رکھتے تھے،اس ضمن میں کشمیر، پنجاب اور لاہور قابل ذکر ہیں۔

داراشکوہ نے اپنی شاعری میں اخلاقی موضوعات پر بھی خامہ فرسائی کی ہے۔اس کے اشعار میں اخلاقیات کے مختلف موضوعات بھی نظر آتے ہیں جن کا شمار زندگی کی ہمہ گیر اقدار میں ہوتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہو۔

تو بھی اس دنیا میں ایک مسافر ہے،
یقین رکھ،اگر زندہ ہے تو ہوشیار رہ۔
اپنا راز کسی غیر دل والے سے نہ کہہ،
کیونکہ رازداری غیر دل والوں میں نہیں ہوتی۔

اسلوب شعری: داراشکوہ کی شاعری کے مضامین پر گفتگو کے بعد ضروری ہو جاتا ہے کہ اس کی شاعری کے اسلوب شعری پر بھی گفتگو کی جائے۔ اس سلسلہ میں جناب وکراما جیت حسرت جو ایک ممتاز ہندوستانی مورخ،محقق اور ادیب گزرے ہیں،جنھیں مغلیہ عہد کے مطالعات میں ان کی گراں قدر خدمات کے لیے جانا جاتا ہے۔موصوف نے اپنی مشہور انگریزی کتاب 'داراشکوہ: حیات و خدمات' میں داراشکوہ کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے،اردو میں اس کی تلخیص مندرجہ ذیل ہے:

''داراشکوہ کی شاعری کے مطالعہ سے واضح ہے کہ اسے تصوف و فلسفہ نیز مختلف مذاہب کے تقابلی مطالعہ کا بہت شوق تھا۔ان موضوعات کے علاوہ ادب و اخلاق کا ذکر بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر ضمناً آ گیا ہے لیکن تصوف کی جس منزل پر وہ پہنچا ہے وہ کسی اکتساب یا غور و فکر کا نتیجہ نہیں بلکہ محض اس کی ذکاوت ذہن کی پیداوار ہے۔ جو تقلید یا تدریس کی محتاج نہیں۔ وہ ہر جگہ ہمہ اوست کا دم بھرتا نظر آتا ہے۔اس کی اکثر رباعیاں متعدد صوفیانہ اقوال کی تشریح و توضیح ہیں۔ مختلف مذاہب کے نظریات کو یکساں ثابت کرنے کی کوشش میں جو ذہنی انتشار پیدا ہوا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے فکر و نظر میں کوئی انفرادیت اور ارتباط قائم نہ رہ سکا اور یہی وجہ ہے کہ اس کی غزلوں میں تفکر کا فقدان ہے۔ خالص ادبی نقطۂ نظر سے بھی اس کی شاعری عام شاعرانہ خوبیوں سے عاری ہے اور مشکل ہی سے اس کی غزلوں میں ایک دو شعر ایسے ملیں گے جن میں واقعی شاعرانہ تخیل کی جھلک موجود ہو اور یہ کہنا تو بالکل بے جا نہ ہوگا کہ اس کی شاعری تغزل سے بالکل ناآشنا ہے''

(Dara Shikuh: Life & Works, P 135-36)

بہرحال داراشکوہ کے دیوان کے مطالعے کے بعد اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شہزادے کو فارسی شعر و ادب پر مکمل دسترس حاصل تھی، اس نے کلاسیکی فارسی شعرا کے کلام کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا تھا۔ اس بات کی دلیل یہ ہے کہ اس نے اپنی تصانیف میں حسب ضرورت سنائی، نظامی، عطار، خسرو، حافظ، سعدی، جامی، عراقی اور ابوالخیر وغیرہ کے اشعار نقل کیے ہیں۔ چونکہ اس کی شاعری کا موضوع تصوف تھا۔اس لیے تصوف اور عرفان سے متعلق مضامین ہی پیش کیے ہیں۔

فارسی شاعری میں داراشکوہ کا مقام: اگر ہم فارسی شاعری میں داراشکوہ کے مقام کا تعین کریں تو وکرما جیت حسرت کی رائے درست معلوم ہوتی ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اس کی شاعری شاعرانہ جذبات اور لطافت کے اعتبار سے بالکل بے جان ہے۔اسی وجہ سے اس کو بحیثیت شاعر ہمعصر یا متاخر شعرا کی صف میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔اس زمانہ میں عرفی، نظیری، طالب آملی، کلیم، قدسی، فیضی وغیرہ کے تغزل و آہنگ کا شہرہ تھا اور مذکورہ شاعروں کے کلام کا رنگ خاص و عوام کے دل و ذہن پر طاری تھا۔ غیر دلچسپ اسلوب کی وجہ سے داراشکوہ کی شاعری کو مقبولیت حاصل نہ ہو سکی۔ اس بات کا اندازہ اس کو خود بھی تھا۔

ہزار بیت و غزل گفت قادری در عشق
ولی چہ سود کسی متنبہ نمی گردد

(ایضاً،ص74)

ترجمہ:''قادری نے عشق میں ہزار بار بات کی،لیکن کیا فائدہ، کوئی ہوشیار نہیں ہوتا۔''

دیوان کے قلمی نسخوں کے فقدان کے پس پشت بھی یہ عنصر کارفرما ہے۔اس زمانہ میں مذکورہ دیوان کا علم بہت کم لوگوں کو تھا۔ تذکرہ نویس بھی اس سے بے خبر تھے۔اس لیے انھوں نے بھی داراشکوہ کو بحیثیت فارسی گو اپنے تذکروں میں شامل نہیں کیا۔ چنانچہ اس کی تصانیف کے قلمی نسخے دستیاب ہیں لیکن دیوان نایاب ہی رہا۔ شاید اس کی وجہ یہی رہی ہو کہ خاص و عام میں سے کسی کو بھی اس کے اسلوب بیان اور موضوع سے دلچسپی نہ تھی۔ اسی وجہ سے کسی نے اس کے دیوان کا مطالعہ بھی نہ کیا ہو اور دیوان کی زیادہ نقول تیار نہ ہوئی ہوں۔

ماخذ و مصادر

1. دیوان داراشکوہ (ترتیب و تدوین مع مقدمہ) مترجم: پروفیسر شاہد نوخیز،قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو،نئی دہلی، 2021
2. دیوان داراشکوہ (اکسیر اعظم)،مرتبہ احمد نبی خان، ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان، 1969
3. تذکرۂ مقالات الشعراء، میر علی شیر 'قانع' تتوی، مرتبہ سید حسام الدین راشدی، سندی ادبی بورڈ کراچی، 1957
4. کلمات الشعراء، محمد افضل سرخوش، تصحیح علی رضا قزوہ، کتابخانہ موزہ و مرکز اسناد مجلس شورای اسلامی تہران 1389ق
5. خزینۃ الاصفیاء (اردو)، مفتی غلام سرور، مترجم علامہ اقبال احمد فاروقی، مکتبہ نبویہ۔ لاہور
6. مراۃ الخیال، مرزا سلطان احمد، مطبع صفدری بمبئی، 1882
7. مجمع البحرین، داراشکوہ، مرتبہ و ترجمہ عادل اسیر دہلوی، ملک بک ڈپو، 2013
8. رباعیات داراشکوہ، مرتبہ و ترجمہ عادل اسیر دہلوی، ملک بک ڈپو، 2011
9. ملاشاہ بدخشی: آثار و افکار، دکتر ظہور الدین احمد، مترجم فضل الرحمٰن فاضل، سفارت جمہوری اسلامی افغانستان دہلی نو
10. ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ، ڈاکٹر سید عبداللہ، انجمن ترقی ہند، نئی دہلی

■

Dr. Sayed Naved Jafri Dehlvi
Dept. of Persian
Jamia Millia Islamia
New Delhi- 110025
Mob.:9990479614
nj.delhi1309@gmail.com

محمد شہباز

داراشکوہ کی فارسی شاعری

مغل شہزادہ داراشکوہ نہ صرف صوفیائے کرام سے عقیدت رکھتا تھا بلکہ وہ خود بھی ایک شاعر، محقق اور صوفی تھا۔ وہ اہل علم، یوگیوں اور درویشوں کی صحبت کو عزیز رکھتا تھا اور ان سے اکتساب فیض بھی کرتا تھا۔ داراشکوہ ایک باذوق شاعر تھا اور شاعری میں قادری تخلص کرتا تھا۔

داراشکوہ کا موجودہ دیوان 'اکسیر اعظم' یا 'دیوان قادری' کے نام سے جانا جاتا ہے جو تقریباً 216 غزلوں اور 148 رباعیات پر مشتمل ہے۔ یہ پورا کا پورا منظوم کلام صوفیانہ رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ ان کی بیشتر غزلیں دین اسلام سے گہری وابستگی، کا مظہر ہیں۔ ان کے کلام میں عرفان وتصوف کے مضامین کے ساتھ ساتھ اخلاقیات کے عناصر بھی نمایاں نظر آتے ہیں۔ داراشکوہ کی پوری شاعری تصوف اور فلسفے کے اردگرد گردش کرتی ہوئی نظر آتی ہے، چونکہ عام لوگوں کے لیے تصوف اور فلسفے جیسے خشک مضامین میں لطافت پیدا کرنا ایک دشوار کن عمل ہے۔ اسی وجہ سے داراشکوہ کی شاعری کو عام مقبولیت حاصل نہ ہوسکی جس پر خود دارا نے افسوس کا اظہار کچھ اس طرح کیا ہے۔

ہزار بیت وغزل گفت قادری در عشق
ولی چہ سود کسی متنبہ نمی گردد

یعنی ہزاروں شعر اور غزلیں قادری نے عشق میں کہیں ہیں لیکن کیا فائدہ کوئی اس پر دھیان ہی نہیں دیتا۔

دارا کی شاعری کا اگر بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے تو اس کی پوری شاعری وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے محور پر گردش کرتی ہے۔ یہ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کیا ہے۔ وحدت الوجود اور وحدت الشہود تصوف کا ایک فلسفیانہ اور نظریاتی مسئلہ ہے۔

اسی طرح داراشکوہ قادری نے ہندوستان کی تہذیب وثقافت، تنوع، مذاہب اور فرقوں کی بنیاد پر ہندوستان کو پوری دنیا میں متعارف کرانے کے لیے ہندو مذہب اور اسلام کے بنیادی عقائد ونظریات کو یکجا کرنے کی کوششیں کیں جو اس وقت کے لوگوں کو عموماً برداشت نہیں ہوئیں۔ اسی تناظر میں داراشکوہ کو قتل کر دیا گیا۔ یہ حقیقت بھی سب پر عیاں ہے کہ شاہ جہاں کا سب سے پیارا ولی عہد چونکہ سیاست سے کوئی سروکار نہیں رکھتا تھا اور مذاہب، فلسفہ، ہندومت اور اسلام کے مشترکات میں زیادہ دلچسپی رکھتا تھا اور وقت کے ہاتھوں بے بس اور مجبور تھا۔ اسی بے بسی اور مجبوری کا اظہار اور لوگوں کے طعن وتشنیع کا اقرار داراشکوہ نے اپنی شاعری میں بھی کیا ہے۔

تو نہ پرسی بیش ز بدنامی فارغ از طعن خاص وعام منم
ای تو در ریش و دستاری جستہ از بند ھای دام منم
تا جہان است باد میخانہ کہ دعا گوی صبح وشام منم

یعنی تم میری بدنامی کے بارے میں زیادہ مت پوچھو، میں خاص وعام کے طعن وتشنیع سے بیگانہ ہو چکا ہوں، اے میرے خلاف بولنے والے انسان تو ریش اور دستار کی بندش میں جکڑا ہوا ہے، میرے جال کی بندشوں سے چھٹکارا پا چا۔ جب تک دنیا باقی ہے، میرا میخانہ اسی طرح آباد رہے، کیونکہ صبح وشام میری یہی دعا ہے۔

اسی درد وکرب کا اظہار ان کے دوسرے اشعار میں بھی ملتا ہے۔

پیر میخانہ داد حکم سماع زاہدان را گریز ماست وداع
مومن وکافرم نہ کرد قبول شد بکفر حقیقتم اجماع

یعنی جیسے ہی میخانہ کے پیر نے سماع کا حکم دیا، سارے زاہد حضرات مجھ سے دور ہو گئے۔ مجھے (میری باتوں کو) کافر اور مومن کسی نے بھی قبول نہیں کیا اور میری حقیقت پر کفر کا اجماع ہو گیا۔

داراشکوہ نے بنارس میں سنسکرت سیکھی اور اس زبان کو سیکھ کر ہندو مذہب، ہندو فلسفہ کو سمجھنے کی کوشش کی اور اس کا اسلامی فکر، اسلامی فلسفہ اور اسلامی تصوف سے موازنہ کرکے سنسکرت کی بہترین کتابوں کو سمجھا تاکہ یہ ثابت کیا جاسکے کہ ہندو مذہب اور اسلام اتنے متضاد نہیں ہیں کہ دونوں کے ماننے والے ایک دوسرے کو دشمن سمجھیں۔

داراشکوہ کا رجحان تصوف اور عرفان کی طرف بہت زیادہ تھا لیکن داراشکوہ کا تصوف اس لحاظ سے منفرد تھا کہ وہ ایک بہت ہی عالم اور دانشور ہونے کے ساتھ ساتھ ہندومت کی مقدس کتابوں کے مطالعہ میں بھی مگن تھا۔ اس نے دونوں مذاہب کے تقابلی مطالعہ کے ذریعے ان دونوں مذاہب کے درمیان اشتراکات نکالنے کی کوششیں کیں تاکہ ہندو اور مسلم سماج کے درمیان نفرتیں اور باہمی اختلافات اور تنازعات ختم ہو جائیں۔ اس کے نتیجہ میں داراشکوہ نے اپنی عزیز واقارب کی طرف سے بھی بہت سے ظلم وستم برداشت کیے، جن کا شکوہ اپنی ایک غزل میں کچھ اس طرح کیا ہے۔

ندیدم از جہان از کس وفائی
وفا کردم بدل دیدم جفائی

یعنی میں نے دنیا میں کسی سے وفا نہیں دیکھی، اگر وفا کی بھی تو اس کے بدلے میں جفا ہی ملی۔

شدم بیمار جز حق کس نہ پرسید
سوای حق ندارم آشنائی

یعنی میں بیمار ہوا تو حق تعالی کے علاوہ کسی نے بھی حال نہیں پوچھا، میں حق تعالی کے علاوہ کسی سے آشنائی بھی نہیں رکھتا۔

مرا این اقربا مارند و عقرب
بود لطف تو زخم را دوائی

یعنی میرے یہ عزیز و اقارب سانپ اور بچھو کی طرح ہیں۔ اے خدا تیرے ہی لطف و کرم میرے زخموں کی دوا ہیں۔

ندیدم من ز غیر تو توقع
نگیرم بہ اگر جویم سوائی

یعنی میں نے تیرے علاوہ کسی سے امید اور توقع نہیں رکھی، اگر میں تلاش بھی کروں تو تجھ سے بہتر نہیں پاؤں گا۔

شفای دل اگر خواہی ز حق خواہ
تو ہم ای قادری داری خدائی

یعنی اگر دل کی شفا چاہتے ہو تو حق تعالی سے طلب کرو، کیونکہ اے قادری تم بھی خدا پر یقین رکھتے ہو۔

داراشکوہ اپنے پیر و مرشد ملا شاہ بدخشی سے والہانہ عقیدت اور صوفیائے کرام سے سچی محبت رکھتے تھے جس کی جھلکیاں ان کی شاعری میں جابجا نظر آتی ہیں۔ اپنی ایک غزل میں خواجہ خواجگان حضرت بہاؤالدین نقشبندی کا، جو سلسلہ نقشبندیہ کے بانی تھے، کچھ اس طرح ذکر کرتے ہیں۔

قطب دین و دنیا بہاؤالدین
نقشبند یقین بہاؤالدین

یعنی بہاؤالدین دین اور دنیا کے قطب ہیں اور بہاؤالدین نقشبندیہ میں یقین رکھے تھے۔

قادری ہر کہ دامنش بگرفت
داو خلد برین بہاؤالدین

یعنی قادری جس کسی نے بھی ان کے دامن کو پکڑ لیا، بہاؤالدین کے ساتھ وہ خلد بریں میں چلا گیا۔

اسی طرح اپنے پیر و مرشد ملا شاہ بدخشی کے بارے میں کہتے ہیں۔

چون خدا وصاحب پیر ہست
کعبہ من حضرت کشمیر ہست

یعنی جب خدا اور خدا والے یعنی ملا شاہ بدخشی میرے پیر و مرشد ہیں تو میرا کعبہ حضرت کشمیر ہے۔

شاہ را چون قادری محکم گرفت
ہر کہ را دیدار حق تقدیر ہست

یعنی ملا شاہ کو جب قادری نے مضبوطی سے تھام لیا تو دیدار حق اس کی تقدیر کا جز بن گیا۔

دارا شکوہ ایک قادر الکلام شاعر، بلند پایہ مصنف اور صوفی مزاج انسان ہے۔ دارا شکوہ اپنے نام کی طرح دارای شکوہ یعنی عظمت و افتخار رکھنے والی ایک منفرد اور جداگانہ شخصیت کا حامل تھا۔

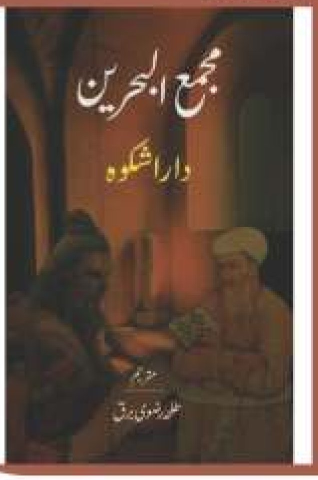

رہی بات داراشکوہ کی فارسی رباعیات کی تو ان کی رباعیات میں زیادہ تر وہی مضامین و مطالب ہیں جو ان کی غزلوں میں ملتے ہیں جیسے: وحدت الوجود، معرفت الہی، عشق حقیقی، جام، پیمانہ، میخانہ، صراحی اور ساقی وغیرہ۔ بقول پروفیسر عراق رضا زیدی:

''دارہ شکوہ کی رباعیات میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو روایت میں ابوسعید ابوالخیر، عمر خیام، سعدی، عطار اور مولانا روم سے اس تک پہنچی تھیں''

داراشکوہ کی رباعیات کے چند نمونے درج ذیل ہیں۔

جز یار ندید چشم مست عارف
اغیار بہ سرو جان الست عارف
در حرف زدن اگرچہ گوید من و تو
توحید کجا رود ز دست عارف

یعنی عارف کی مست نگاہوں نے محبوب کے علاوہ کسی کو نہیں دیکھا، اغیار پورے انہماک کے ساتھ عارف کے الست کے تعاقب میں لگے پڑے ہیں۔

بولنے میں اگرچہ وہ 'من و تو' کے الفاظ استعمال کرتا ہے، لیکن حقیقت میں توحید عارف کے ہاتھ سے کہاں چھوٹتی ہے۔

در عین فنای خود بقا را دیدم
بیمار شدم تا دوا را دیدم
از ما چو خدا جدا نبودہ ہرگز
در آئینہ خویش خدا را دیدم

یعنی میں نے عین فنا کے عالم میں بقا کو دیکھا، اس سے پہلے کہ دوا دیکھوں بیمار ہو گیا۔ جس طرح سے خدا کی ذات ہم سے ہرگز جدا نہیں ہو سکتی، اسی طرح میں نے اپنے آئینے میں خدا کو دیکھا۔

مجنون کہ روان شدی ز چشمش میلی
غیر از لیلی بکس نبودش میلی
پرسید از و کسی کہ شب بہ یا روز
گفتا ز ہزار روز بہتر لیلی

یعنی مجنوں جو اپنی اشکبار آنکھوں کی وجہ سے (لیلیٰ کے فراق میں) دیوانہ ہو گیا تھا۔ لیلی کے علاوہ اور کوئی اس کی دیوانگی کا سبب نہ تھا۔ کسی نے اس (مجنون) سے پوچھا کہ رات بہتر ہے یا دن، تو اس نے کہا: ہزار دنوں سے بہتر ایک رات ہے۔

بہر حال دارہ شکوہ ایک قادر الکلام شاعر، بلند پایہ مصنف اور صوفی مزاج انسان ہے۔ داراشکوہ اپنے نام کی طرح دارای شکوہ یعنی عظمت و افتخار رکھنے والی ایک منفرد اور جداگانہ شخصیت کا حامل تھا۔ اس کے کلام میں لطافت، حلاوت اور شیرینی کے ساتھ ساتھ ذکاوت اور ذہانت کے نمونے بھی بدرجہ اتم نظر آتے ہیں۔ عرفان و تصوف میں مستغرق ہونے کی وجہ سے ان کی شاعری میں صوفیانہ رنگ جابجا دکھائی پڑتا ہے۔ اسی طرح ان کی تصانیف سفینۃ الاولیا، سکینۃ الاولیا، حسنات العارفین، رسالہ حق نما، سر اکبر اور مجمع البحرین صوفیانہ مضامین کا سرچشمہ، صلح کل اور گنگا جمنی تہذیب کی علمبردار نظر آتی ہیں۔

■

Dr. Mohd Shahbaz
Gali Meer Afzal, Lal Kuan
Delhi-110006
Mob.: 9389830542
shahbazmisbahi11@gmail.com

مقیم احمد

سیماب اکبرآبادی کی شعری کائنات

سیماب اکبرآبادی کا شمار اردو کے ممتاز اساتذۂ سخن میں ہوتا ہے۔ داغ دہلوی کے شاگردوں میں اقبال کے بعد سب سے زیادہ شہرت سیماب اکبرآبادی کو حاصل ہوئی۔ ظاہر ہے سیماب شاعر کی حیثیت سے تو معروف ہیں لیکن انھوں نے ادب کی دیگر اصناف میں بھی طبع آزمائی کی ہے جس کی طرف عام طور سے لوگوں نے توجہ نہیں دی۔ سیماب نے اردو شاعری کی بہت خدمت کی۔ وہ نہ صرف فن عروض میں مہارت رکھتے تھے بلکہ انھوں نے متعدد شعرا کی اصلاح وتربیت کا فریضہ بھی انجام دیا۔ البتہ یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہے کہ سیماب نے افسانہ، ناول، ڈرامہ، سیرت اور سوانح کے علاوہ کئی اہم منظوم تراجم بھی کیے اور تحقیق وتنقید کے میدان میں بھی قابل ذکر تحریریں یادگار چھوڑی ہیں۔ سیماب اکبرآبادی نے اردو دنیا میں 'آگرہ اسکول' کا تصور پیش کیا۔ انھوں نے نشرواشاعت کے فروغ کے لیے 'قصرالادب' نامی ادارہ قائم کیا، جس کے تحت متعدد کتابیں شائع کیں اور کئی رسائل واخبارات جاری کیے، جن میں رسالہ 'شاعر' قابل ذکر ہے، جو آج بھی جاری ہے۔

سیماب کا زمانہ وہ ہے جب ہمارے یہاں کلاسکی غزل کی روایت اختتام کو پہنچ رہی تھی اور جدید غزل کی روایت شروع ہورہی تھی۔ چنانچہ سیماب اکبرآبادی اس دور کے ان شعرا میں شامل ہیں جنھوں نے کلاسیکی غزل کے تسلسل کو قائم رکھا اور اس میں نئے افکار وموضوعات شامل کیے۔ سیماب کے تقریباً تین ہزار شاگرد ہوئے۔ تلامذہ کی اتنی بڑی تعداد شاید اردو شاعری میں کسی استادِ فن کو نصیب نہیں ہوئی۔ سیماب کے تلامذہ میں جہاں بہت سے شعرا خود استادی کے منصب پر فائز ہوئے وہیں تلامذۂ سیماب میں بھی کئی شاگرد آج اردو ادب کے اہم ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں۔ لوگوں نے شاید یہ سمجھ کر ان کو نظرانداز کیا کہ وہ بس روایتی قسم کے شاعر ہیں۔ جب کہ ان کی شاعری اور ان کی ادبی خدمات کا سرمایہ اس قابل ہے کہ اس کا بھرپور جائزہ لیا جائے۔ سیماب اکبرآبادی کے معاصر شعرا میں علامہ اقبال، فانی بدایونی، چکبست، حسرت موہانی، شاد عظیم آبادی، جوش ملیح آبادی اور یاس یگانہ چنگیزی وغیرہ بہت اہم ہیں۔ ان ادیبوں کے نام سے ہی اندازہ ہوتا ہے کہ اردو شاعری خصوصاً اردو غزل اس عہد میں کس قدر توانا رہی ہوگی۔

سیماب نے بہت کم عمری میں اپنی شاعری کا آغاز کیا۔ یہ وہ دور تھا جب عموماً اردو غزل وقتی تفریح کا ذریعہ سمجھی جاتی تھی۔ غزل کے اکثر مضامین گل وبلبل، شمع وپروانہ، شراب وشباب، عاشق ومعشوق اور شانہ وزلف جیسے روایتی تلازمات تک محدود تھے۔ اردو غزل، قدیم فارسی غزل کی روایات وخصوصیات سے باہر نہیں نکل سکی تھی اور انھی روایتی موضوعات کو نئے زاویے دے کر، زبان وبیان کے کمالات دکھا کر غزل کہنا کمال فن سمجھا جاتا تھا۔ تخیل پر تغزل کو فوقیت تھی۔ تصوف کے موضوعات کو برتا جانے لگا تھا لیکن اس میں بھی عمومیت تھی۔ ایسے ماحول میں سیماب نے شعرگوئی کی ابتدا کی۔ سیماب نے استادی وشاگردی کے ادارے کو وسعت دی اور نئی ادبی تہذیب یا شعری تہذیب کو مستحکم اور قائم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ لیکن لوگوں نے ان کی طرف توجہ اس لیے نہیں دی کہ ان کو لوگوں نے جدید شاعر کے طور پر نہیں قبول کیا۔ سیماب چاہے مخصوص معنی میں جدید شاعر نہ ہوں، جس معنی میں فراق، حسرت اور شاد وغیرہ تھے لیکن نئے زمانے میں اپنی کلاسکی روایت کو آگے بڑھانے والوں میں اور اس سلسلے کو قائم کرنے والوں میں سیماب کا بہت اہم کردار ہے۔

سیماب اکبرآبادی نے غزل گوئی کے ساتھ ساتھ نظم کو بھی اپنے تخلیقی اظہار کا ذریعہ بنایا۔ وہ اپنی کتاب 'خطبات کلیم عجم' میں لکھتے ہیں:

''نظم غزل گوئی سے زیادہ ضروری اور بہتر صنف کلام ہے۔''[1]

نیستاں(1925)، کارامروز(1935)، ساز و آہنگ (1941) اور شعر انقلاب(1947) سیماب اکبرآبادی کی نظموں کے مجموعے ہیں، جن میں انھوں نے نت نئی علامتوں کو زندگی کی بدلتی ہوئی قدروں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے۔ نیستاں ان کی شاعری کے پہلے دور کا ترجمان ہے۔ اس میں مختلف النوع موضوعات پر 57 نظمیں شامل ہیں۔ ترانۂ وحدت، خورشید رسالت، گھٹا مدینے سے، گنبد سبز رسول اللہ، عید قرباں اور فریاد وغیرہ یہ سب مذہبی نظموں کے ذیل میں آتی ہیں۔ سیماب ان نظموں میں اللہ اور اس کے رسول کی محبت اور حمد و نعت میں غرق نظر آتے ہیں تو وہیں دوسری طرف بادۂ عرفاں کا پہلا دور، عرفان نفس، ہمہ اوست، تو ہی تو ہے

وغیرہ نظمیں فلسفیانہ اور تصوف کے اعلیٰ وارفع جذبات وخیالات سے معمور ہیں۔

اس مجموعہ کے بالکل آخری حصے میں جنت کے خطوط والی چھ نظموں کا حصہ بالکل منفرد اور بے مثال ہے۔ اس میں سیماب نے انسانی فطرت کے نشیب وفراز سے اپنی گہری واقفیت کا ثبوت دیا ہے۔ موضوع بھی بالکل نیا اور انداز بیان بھی انوکھا ہے۔ جس میں پہلا خط صغیرسن بچے کی طرف سے اپنے باپ کے نام، دوسرا خط ایک معصوم بچی کی طرف سے ماں کے نام، تیسرا ماں کی طرف سے بچوں کے نام، چوتھا خط باپ کی طرف سے بچوں کے نام، پانچواں بیوی کی طرف سے شوہر کے نام اور چھٹا خط شوہر کی طرف سے بیوی کے نام لکھا گیا ہے۔ یہ تمام خطوط انسانی جذبات واحساسات کے اظہار سے لبریز ہیں۔ ان میں مختلف لوگوں کے انتقال سے ان کے قریب ترین متعلقین پر جو کچھ گزرتی ہے، اس کا احساس کرتے ہوئے انھیں بہت خوبصورت اور اثر انگیز انداز میں صبر کی تلقین کی گئی ہے۔ جنت سے چوتھا خط باپ کی طرف سے بچوں کے نام سے درج ذیل اشعار ملاحظہ کیجیے۔

تمھارے ساتھ کیا ہم نے ساری عمر نباہ
ہوئے تمھاری ترقی کے وسوسوں میں تباہ
ملا کیا تمھیں آرام ہم سے خاطرخواہ
ہمیں یہ اس کا نتیجہ ملا، یا اللہ
ستم ہے، شمع تمنا کو ہاتھ تم نے دیا
اندھیری گور میں بجھو، نہ ساتھ تم نے دیا
تعلقات ہی انسان کے یاد آتے ہیں
تعلقات ہی بعد فنا رلاتے ہیں
مرے سلوک مجھے یاد اب دلاتے ہیں
فریب صاف یہ دنیا کے رشتے ناتے ہیں
تعلقات کا گر آدمی میں روگ نہ ہو
تو اس کے بعد زمانے میں اس کا سوگ نہ ہو

ان کی نظموں کا دوسرا مجموعہ 'کارامروز' ہے، جس میں سیاسی، قومی ووطنی اور اہم شخصیات پر نظمیں شامل ہیں۔ سیاسی نظموں میں طلوع سیاست، جذب وسلوک، آزادی، بلراج کو ہمارا مشورہ وغیرہ شامل ہیں۔ رسول کائنات، گاندھی، نظیرا کبرآبادی، غالب، داغ، محمد علی، میر ناصر علی وغیرہ نظموں میں مختلف شخصیات سے سیماب کے تعلق و عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔ نظیر وغالب میں شاعرانہ عظمت کے علاوہ وطنی نسبت پر بھی فخریہ جذبات حاوی ہیں۔

سیماب نے سری کرشن اور گوتم بدھ سے متعلق نظموں میں تاریخی واقعات کو شعر کے لباس میں بیان کیا ہے۔ وہ سری کرشن کی عظمت اور ان کے صداقت ومحبت کے پیغام کا تذکرہ جوش وعقیدت سے کرتے ہیں۔ اس قسم کی تمام نظموں سے ان کی بے تعصبی ظاہر ہوتی ہے۔ زیر مطالعہ نظم کے علاوہ دوسرے مجموعوں کی نظموں 'وہ بانسری کہاں ہے'، 'میرا خطاب سری کرشن کی قوم سے' میں بھی ان کا یہ رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ ان کی شخصی نظموں کے متعلق نیاز فتح پوری لکھتے ہیں:

"شخصی نظموں میں میرے نزدیک سب سے زیادہ بہتر نظم سری کرشن کے متعلق ہے اور اس کا سبب یہی ہے کہ مذہب میں سری کرشن ہی کی زندگی ایسی زندگی ہے جو شاعر کے احساسات حسن کو بیدار کرسکتی ہے۔ انھوں نے کائنات پر بھی نظمیں لکھی ہیں، لیکن ان میں وہ بات پیدا نہ ہوسکی۔"2

سیماب نے سری کرشن اور گوتم بدھ سے متعلق نظموں میں تاریخی واقعات کو شعر کے لباس میں بیان کیا ہے۔ وہ سری کرشن کی عظمت اور ان کے صداقت ومحبت کے پیغام کا تذکرہ جوش وعقیدت سے کرتے ہیں۔ اس قسم کی تمام نظموں سے ان کی بے تعصبی ظاہر ہوتی ہے۔

صبح محبت، نزول انسان اور انسانیت، اساس کائنات، امتحان شیخ وبرہمن، بھولے ہوئے فسانے اور اس طرح کی متعدد نظموں میں سیماب نے آپسی اتحاد وبھائی چارگی اور اخوت ومحبت کا پیغام دیا ہے۔ طلوع سیاست، ایک پیغام اہل عالم کے نام، بساط سیاست، انقلاب روس، اے سرمایہ دارو، مشرق سے مغرب کو، اعلان جنگ، دعوت انقلاب ۔

وطن پیارے وطن تیری محبت جزو ایماں ہے
تو جیسا ہے جو کچھ ہے سکون دل کا ساماں ہے
وطن میں مجھ کو جینا ہے وطن میں مجھ کو مرنا ہے
وطن پر زندگی کو ایک دن قربان کرنا ہے
وطن کی خاک سے اٹھا ہوں رنگیں پیرہن ہو کر
وطن کی خاک میں مل جاؤں گا خاک وطن ہو کر

اس کے علاوہ اس حصے کی متعدد نظمیں حسن وعشق اور محبت کے جذبات سے مملو ہیں تو بعض متفرق موضوعات پر خلق کی گئی ہیں۔ اس مجموعہ کا آخری حصہ سیماب نے اپنے وطن اکبرآباد (آگرہ) کی تاریخی حیثیت وعظمت اور سلاطین مغلیہ کی عمارتوں اور یادگاروں پر اظہار عقیدت ومحبت کے لیے وقف کیا ہے۔ اس حصہ کا عنوان 'ارض تاج' ہے۔ اس کے تحت درج ذیل نظمیں شامل کی گئی ہیں۔ تاج محل، قلعہ معلی، مسجد جامع، اعتمادالدولہ، چینی کا روضہ، آرام باغ، جمنا، سکندرہ، فتح پور سیکری، مزار اکبر، درۃ التاج، دیال باغ، جودھ بائی کا مندر، روضۂ ممتاز اور مقبرۂ نور جہاں، مولد غالب اور قصرالادب یعنی مولد سیماب اکبرآبادی۔ ان مقامات سے متعلق شاعر نے انتہائی محبت بھرے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ یہ سبھی آثار بجائے خود بہت بلند وبالا حیثیت کے حامل ہیں اور ان میں اپنے حسن بیان سے سیماب نے جو شیرینی اور چاشنی پیدا کی ہے اس نے پڑھنے والوں کے لیے ان کے جمالیاتی حظ وکیفیت کو دوبالا کردیا ہے، اپنے مکان قصرالادب پر سیماب کی نظم بڑی معنی خیز اور پُرکیف ہے۔ اس میں سیماب نے آگرہ کی تاریخی وادبی حیثیت کے پس منظر میں اردو کے شعرا میر وغالب کے بعد خود اپنے وجود پر فخر کیا ہے۔

تیسرے مجموعے 'سازوآہنگ' کو سیماب نے پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصہ میں نوائے عصر کے تحت قومیت، سیاست، وطنیت پر نظمیں لکھی ہیں۔ سیماب نظم 'قدم بڑھائے چلو' میں اہل وطن کو اس طرح

آگے بڑھنے کی تلقین کرتے ہیں۔

ہوں لاکھ مشکلیں پیدا قدم بڑھانے میں
فلک رہے تمھیں مصروف آزمانے میں
بلا سے برق کا مسکن ہو آشیانے میں
بلا سے زلزلے آتے رہیں زمانے میں
مگر ثبات میں لغزش نہ آنے پائے چلو
قدم بڑھائے چلو

حصہ دوم میں صلائے تہذیب کے تحت مذہب، اخلاق و معاشرت پر نظمیں ہیں۔ اس کے علاوہ اذان ہمالہ، صبح آزادی کا گیت، ایشیا، ہندوستانی نوجوان، قومی ترانہ، دعوت انقلاب، نوحۂ وطن، ہندوستان وغیرہ سیماب کی سیاسی بصیرت اور نظریات کے ساتھ ساتھ قادرالکلامی کی مثالیں ہیں۔ اس باب کی بیشتر نظمیں اپنے موضوعات کے اعتبار سے آج کا آئینہ لگتی ہیں مثلاً فرقہ پرست ایڈیٹر، عید اور بسنت، شب برأت، منزل، مزدور کا پیغام مشرقی مزدور کے نام وغیرہ۔ حصہ سوم میں حدیث ادب کے تحت شعر و حکمت پر نظمیں شامل ہیں۔ ان نظموں میں سیماب نے اپنے اعلیٰ وارفع خیالات کو فن کارانہ کمال کے ساتھ پیش کیا ہے اور یہ ان کے تخلیقی ذہن و مزاج کی بھرپور ترجمانی کرتی ہیں۔ اس باب کی نظمیں سیماب کی قادرالکلامی اور شاعرانہ عظمت کی غماز ہیں۔ مثلاً صبح بہار، اندیشہ، تصور، فرشتۂ محبت، نیلا ناگنی، کمسن راہبہ سے وغیرہ۔ سیماب نے حصہ چہارم میں سرودِ روح اور معتقدات جیسے عناوین کے تحت نظموں میں مذہبی شخصیات کا تذکرہ کیا ہے جس میں 'ابن آذر'، 'ابن عمران' اور 'ابن مریم' وغیرہ نظمیں شامل ہیں۔ سیماب نے ان نظموں میں مذکور شخصیات کے کردار اور مکارم اخلاق کو شاعرانہ انداز میں بہت خوبی سے پیش کیا ہے اور ان کے توسط سے شرک و بدعت جیسی برائیوں کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس حصہ کی دیگر اہم نظموں میں معراج النبی اور ایک لمحۂ فکریہ، صبح حرم، شام کلیسا، میرا خطاب، سری کرشن، وہ بانسری کہاں ہے اور گرونانک وغیرہ ہیں۔ حصہ پنجم میں سیماب نے بچوں سے متعلق نظمیں پیش کی ہیں۔ یہ نظمیں بچوں کی ذہنی نشو و نما کے لیے ان کی نفسیات کو مدنظر رکھ کر لکھی گئی ہیں۔ بچوں کی لیے نظمیں لکھتے ہوئے سیماب نے ان کے تصور، تخیل اور نفسیات کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔ ان کی نظمیں ترنم، موسیقی اور غنائی کیفیات کی بھرپور ترجمانی

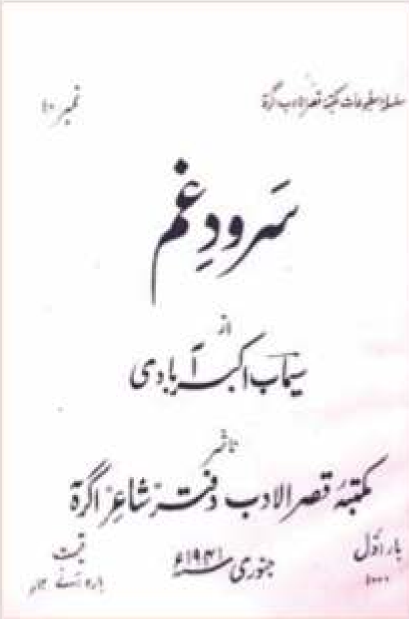

کرتی ہیں۔ اس حصہ میں شامل دعا، خدا، بچوں کی دعا، خدا کا شکر کرو، جگنو اور بچہ، بلبل اور گلاب، برسات، سلیمہ کی بلی، وطن کی لگن، ماں کی لوری وغیرہ نظمیں قابل ذکر ہیں۔

سیماب کی نظموں کا چوتھا مجموعہ 'شعر انقلاب' ہے۔ اس کی اشاعت ہندوستان کی آزادی کے سال یعنی 1947 میں ہوئی۔ سیماب کے کلام میں اس کی خاص اہمیت و انفرادیت ہے۔ اس میں ان کے فکر و فن کے متعلق ارتقائی بلندیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ 'شعر انقلاب' میں شاعر کی فکر میں مزید بلندی اور شدت پیدا ہوگئی ہے۔ اس میں اس عہد کے مسائل پر سنجیدہ توجہ دیتے ہوئے سیماب نے سماج کی کمزوریوں پر سخت تنقید کی ہے۔ اہل وطن کی منفرد فکر کو ترک کرنے کی ترغیب دی ہے۔ دوسروں پر تنقید کے بجائے اپنی ذات و معاشرے کی اصلاح کی ضروریات پر زور دیا ہے۔ مزید برآں سماج و سیاست کی خرابیوں و خامیوں کی نشان دہی کرتے ہوئے ان کی اصلاح و بہتری کی تجاویز بھی پیش کی ہیں۔ یہ پورا مجموعہ سیاسی اور انقلابی نظموں پر مشتمل ہے۔ اس مجموعہ کی کچھ نظمیں عالمگیر موضوعات پر ہیں، مثلاً دنیا کی حیات نو، کارواں کی پکار، ارض تاج سے ایک ضروری پیغام، ایک انتباہ، تم سے کہنا ہے، پھوٹ کا گیت، اے حجرہ نشینو، وحدت جشن عید، نماز عید، جاگ اے ہندوستاں، امیدیں اور ابھی قدم نہ روک وغیرہ۔

سیماب کی غزلوں کے مجموعے 'کلیم عجم' (1936)، 'سدرۃ المنتہیٰ' (1946) اور 'لوح محفوظ' (1979) ہیں۔ 'کلیم عجم' کو ادبی حلقوں میں خاطر خواہ سراہا گیا۔ سیماب کا یہ مجموعہ ادبی منظرنامے پر تازہ ہوا کے خوش گوار جھونکے کی طرح سامنے آیا۔ اس جلد میں غزلیات کے تین حصے 'صہبائے کہن'، 'بادۂ دوشیں' اور 'نشید نو' شامل ہیں۔ مجموعی طور پر سیماب نے اپنی غزلوں میں روایتی موضوعات کے ساتھ ساتھ سیاسی اور سماجی مسائل و موضوعات کو بھی داخل کیا، بہت سی جگہ روایت سے انحراف بھی کیا اور اس صنف کو غیر ضروری جکڑبندیوں سے آزاد کر کے نئی تحریکوں اور بدلتے ہوئے نظام سے متعلق موضوعات سے آشنا کیا۔ سیماب نے ندرتِ خیال، جدتِ بیان اور شگفتہ طرزِ ادا سے اپنی غزلوں کو نئی آب و تاب بخشی۔

'کلیم عجم' کے ابتدائی صفحات میں 'میرے شعری معتقدات' کے تحت خود سیماب نے اپنی شاعری کے بارے میں واضح اشارہ کیا ہے:

''... میں اب شاعری میں بلند خیالات اور بلند انسانی جذبات کی ترجمانی کا حامی ہوں۔ میں ایسی شاعری میں فلسفہ، حقائق اور معارف کے نکات پسند کرتا ہوں۔ میں اس شاعری کا منکر ہوں جس کا موضوع صرف عورت یا اس کے متعلقات ہوں، یا جو امرد پرستی کی نفسیات پر مشتمل ہو۔ میری شاعری کا موضوع حسن محض اور عشق محض ہے اور تمام ضمائر کا مرجع وہ ذات ہے جو حاصل حسن اور مرکز محبت ہو۔ جس طرح علم شاعری کے لیے ضروری اور لازمی ہے اسی طرح محبت اور شاعری کو بھی میں لازم و ملزوم سمجھتا ہوں اور خیالات میں تصنع یا بناوٹ کا حامی نہیں۔ میں خیالات کو صداقت اور محبت پر مبنی دیکھنا چاہتا ہوں اور حقیقی واردات قلب کی ترجمانی میرا مسلک بیان ہے۔ گو مجھے تمام اصناف سخن پر فطرت نے قدرت دی ہے مگر میں نظم، غزل اور رباعی کو اظہار خیال کا بہترین ذریعہ سمجھتا ہوں۔ شعر کی الہامی حیثیت پر میرا ایمان ہے۔ میں شعر میں بلند خیال کے ساتھ بلند الفاظ کا موید ہوں، ایسے الفاظ جن میں غرابت نہ ہو اور جنھیں تعلیم یافتہ اصحاب بہ آسانی سمجھ سکیں۔''[3]

سیماب اکبرآبادی کی غزلوں میں حسن و عشق، تصوف سے معمور خیالات، روحانی کیفیات، عصری حقائق، عصری پس منظر اور انفرادی کیفیت میں ڈوبے ہوئے ایسے اثرانگیز اشعار بھی موجود ہیں جو جذبے کی صداقت سے ہم آہنگ ہو کر آفاقی حیثیت کے حامل بن گئے ہیں۔ سیماب کی غزلیہ شاعری میں بیان کی دل

نشینی، اسلوب کی دل آویزی اور استعارے کے حسن وندرت کی مثالیں بھی موجود ہیں۔ سیماب کے یہاں سیاسی فضا کا عکس بھی نمایاں ہے۔ سدرۃ المنتہیٰ (1946) اس کی واضح مثال ہے۔ صیاد، زنداں، سلاسل، آزادی، انقلاب اور ایسے ہی کئی موضوعات ان کے اس دیوان میں نمایاں ہیں۔ سیماب نے جہاں اپنی غزلیہ شاعری میں حسن وعشق کے نکھرے ہوئے تصور کو پیش کرنے میں دلچسپی دکھائی تو وہیں دوسری طرف ان کی عشقیہ شاعری کی پاکیزگی اور فکروخیال کی ندرت کا اظہار بھی دکھائی دیتا ہے۔ زبان کے تخلیقی استعمال میں بھی انھوں نے نئی راہ نکالنے کی کوشش کی ہے۔ اس ضمن میں ان کے درج ذیل اشعار ملاحظہ کیجیے، جن میں اسلوب کی توانائی اور شعری نزاکتوں کا حسن نمایاں ہے۔

محبت میں اک ایسا وقت بھی آتا ہے انساں پر
ستاروں کی چمک سے چوٹ لگتی ہے رگِ جاں پر
کہانی میری روداد جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سنتا ہے اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے
کہانی ہے تو اتنی ہے فریب خواب ہستی کی
کہ آنکھیں بند ہوں اور آدمی افسانہ ہوجائے
ادب آموز تھی پاکیزگی نیت عشق
بے وضو میں نے کبھی ذکر تمہارا نہ کیا
تسکین ومحبت کے یہ دو ہی طریقے تھے
یا تم نہ بنے ہوتے یا دل نہ بنا ہوتا
قطرہ دریا ہے اگر شامل دریا ہوجائے
ذرہ اس بھید کو پاجائے تو صحرا ہوجائے

سیماب اکبرآبادی نے گرچہ بہت طویل زندگی نہیں پائی لیکن سفرحیات میں جہاں انھیں سکون کے لمحات میسر آئے تو وہیں مصائب ومشکلات کے شعلوں نے ہر لمحہ انھیں آزمائشوں میں بھی مبتلا رکھا۔ تقسیم ہند کے بعد کی اذیتوں کا انھوں نے براہ راست مشاہدہ کیا، جوان کے دیوان 'لوح محفوظ' میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس مجموعے میں 1945 سے 1951 تک کی غزلیں شامل ہیں۔ 'لوح محفوظ' کی غزلوں میں جہاں پختگی، شائستگی اور سلیقہ کا اظہار ملتا ہے تو وہیں دوسری طرف زبان اور تراکیب کے تجربات بھی ملتے ہیں۔ ان میں ایک طرف تقسیم ہند کا غم جھلکتا ہے تو دوسری طرف ہجرت کا کرب۔ بہر حال ان کی ہنرمندانہ پیش کش سیماب کی انفرادیت ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔

جب ہم رباعیات سیماب کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ جہاں ایک طرف سیماب نے اپنی رباعیوں میں عصری زندگی کی پیچیدگیوں، ناہمواریوں اور پریشانیوں کو بیان کیا ہے تو دوسری طرف سیماب نے اپنی رباعیوں میں مذہب، سیاست، جمہوریت، جنگ کی صورت حال، وطن پرستی، ہندوستان پر غیروں کے ظلم وجبر، مغربی تہذیب کی تباہ کاریوں، مسلکی اختلافات کبھی پر اظہار خیال کیا ہے۔ خصوصاً دوسری عالمی جنگ کے سبب جس طرح کا انتشار، بدامنی اور غیرمحفوظ زندگی کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی، وہ ان کی رباعیات میں نمایاں ہیں۔ سیماب کی رباعیات کا مجموعہ 'عالم آشوب' فنی بلندی کے مقابلے میں تاریخی حیثیت زیادہ رکھتا ہے۔ اس مجموعہ میں انھوں نے مئی 1940 سے دسمبر 1943 تک کے سارے حالات بالترتیب قلم بند کیے ہیں۔ اس مجموعہ میں انھوں نے دوسری جنگ عظیم کے وقت کے سیاسی حالات پر اپنے ردعمل کا اظہار کیا ہے۔ عالمی جنگ کے زمانے میں سیماب اکبرآبادی کی نظر محض جنگ کے حالات پر ہی مرکوز نہیں تھی بلکہ ان کی دوربیں نگاہ حالات کے دیگر پہلوؤں پر بھی تھی۔ اس زوال آمادہ دور میں انھیں سیاست، مذہب سب مجہول دکھائی دیتے ہیں۔ انھیں مغرب کے حکمرانوں کی دورنگی چالوں کا بھی ادراک ہے جو ظاہرداری کے لیے امن وصلح کی باتیں کرتے ہیں اور پھر انھیں کی سازش کے تحت عالمی جنگ برپا ہوئی جس کے نتیجے میں غریب اور محکوم اقوام وممالک کو سنگین خمیازہ بھگتنا پڑا۔ بطور مثال سیماب کی دو رباعیاں ملاحظہ ہوں۔

> سیماب اکبرآبادی کی غزلوں میں حسن وعشق، تصوف سے معمور خیالات، روحانی کیفیات، عصری حقائق، عصری پس منظر اور انفرادی کیفیت میں ڈوبے ہوئے ایسے اثرانگیز اشعار بھی موجود ہیں جو جذبے کی صداقت سے ہم آہنگ ہوکر آفاقی حیثیت کے حامل بن گئے ہیں۔ سیماب کی غزلیہ شاعری میں بیان کی دل نشینی، اسلوب کی دل آویزی اور استعارے کے حسن وندرت کی مثالیں بھی موجود ہیں۔

تہذیب و سکوں کا ہو وہ منظر پیدا
انسان دل انساں میں کرے گھر پیدا
کر دو انسانیت کو اس درجہ بلند
پھر نہ ہو سکے جہاں میں ہٹلر پیدا

معموروں کو ویران کیے جاتے ہیں
تخریب کے سامان کیے جاتے ہیں
اوروں کے زیاں کی دھن میں افراد وطن
خود اپنا ہی نقصان کیے جاتے ہیں

سیماب کی رباعیوں کے سلسلے میں مخمور اکبرآبادی لکھتے ہیں:

''سیماب صاحب کی رباعیوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس مجموعہ میں انھوں نے فلسفے کے بجائے سیاست حاضرہ کو موضوع بنایا۔ جوش کی رباعیوں میں مذہب اور سماج پر طنز ہے تو سیماب نے اس پیکر میں حوادث کے دوش بدوش اکثر کرداروں کی جھلک بھی دکھائی ہے۔ یہ ایک خوش آئند انحراف اور ایک مفید اضافہ ہے۔ سیماب کی رباعیات بلندیٔ فکر اور عمیق نظری کا اعلیٰ نمونہ ہیں ...ماہ بہ ماہ ترتیب کے التزام سے اس مجموعہ میں ایک تاریخی تسلسل بھی پیدا ہوگیا ہے''4

نظم جدید کے آغاز کے بعد جدید تقاضوں کے تحت اردو کی جن دوسری شعری اصناف میں تبدیلیاں واقع ہوئی تھیں، ان میں مراثی اور سلام بھی شامل تھے۔ سیماب نے مرثیوں اور سلاموں کو عہد حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرکے ان کے موضوعات واسالیب میں بھی تنوع پیدا کیا اور اپنی شاعرانہ مہارت اور فنی پختگی

سیماب نے قرآن پاک کا منظوم ترجمہ کیا ہے اور ہر آیت کو انھوں نے شعر کے قالب میں ڈھال دیا ہے، جس سے واضح طور پر ان کی عربی دانی اور قرآن پاک سے شغف کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ علامہ سیماب نے 'وحی منظوم' میں جہاں ترجمے کے تمام اصول وضوابط کو ملحوظ رکھا ہے، وہیں ترجمہ کرتے وقت شاعری کے رموز و نکات سے بھی انحراف نہیں کیا ہے۔

کا ثبوت دیتے ہوئے عزائی شاعری پر مشتمل دو مجموعے 'سرودِ غم' اور 'نفیرِ غم' 1943 میں شائع کیے۔ ان مجموعوں میں مذہبی عقیدت مندی اور جذباتیت کے اظہار کے ساتھ ساتھ فن کو کہیں بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ یہ مرثیے اور سلام سیماب کے مجموعوں کی اشاعت کے بعد کے بھی شعرا کے لیے رہنما ثابت ہوئے اور بعد کا کوئی شاعر ان کے اثرات سے دست برداری کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ اس لحاظ سے سیماب کی عزائی شاعری اردو ادب میں بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔

سیماب کے منظوم تراجم 'وحی منظوم' اور 'الہامِ منظوم' پر مشتمل ہیں۔ اول الذکر میں سیماب نے قرآن پاک کا منظوم ترجمہ کیا ہے اور ہر آیت کو انھوں نے شعر کے قالب میں ڈھال دیا ہے، جس سے واضح طور پر ان کی عربی دانی اور قرآن پاک سے شغف کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ علامہ سیماب نے 'وحی منظوم' میں جہاں ترجمے کے تمام اصول وضوابط کو ملحوظ رکھا ہے، وہیں ترجمہ کرتے وقت شاعری کے رموز و نکات سے بھی انحراف نہیں کیا ہے۔ انھوں نے یہ ترجمہ اس احتیاط اور ذمہ داری کے ساتھ کیا ہے کہ قرآنی متن کے تمام تقاضے پورے ہوں اور ساتھ ہی یہ بات بھی یقینی بنائی کہ شعریت میں کوئی کمی محسوس نہ ہو۔ انھوں نے پورے 30 پاروں کا ترجمہ ایک ہی بحر میں کیا ہے۔ ترجمہ کی خاطر زائد الفاظ کو قوسین میں جگہ دی اور جہاں کہیں ضرورت پڑی پورے مصرعے کو قوسین میں درج کیا ہے۔ سیماب کے اس ترجمے کی ایک بڑی خصوصیت، سلاست، روانی اور اختصار وجامعیت ہے۔ یہ صفات قرآن پاک کے دیگر منظوم تراجم میں عموماً کم دیکھنے میں آتی ہیں۔

قرآن پاک کے ترجمہ 'وحی منظوم' کے علاوہ سیماب نے مشہور مفکر اور فارسی کے عظیم شاعر مولانا جلال الدین رومی کی معرکۃ الآرا تخلیق 'مثنوی معنوی' یا 'مثنوی مولانا روم' کے چھ حصوں کا منظوم ترجمہ بڑی فن کارانہ مہارت کے ساتھ کیا۔ سیماب کی اس کاوش سے متعلق مولانا محی الدین قائد رقم طراز ہیں:

''لاہور کے زمانۂ قیام میں سیماب نے ایک ایسا کارِ عظیم انجام دیا ہے جسے اب تک عہد حاضر کا کوئی شاعر مکمل نہ کرسکا تھا۔ وہ کارِ عظیم مثنوی مولانا روم کا منظوم اردو ترجمہ ہے۔ سیماب نے اپنی زندگی میں جہاں اور بہت سے کارِ نمایاں کیے ہیں ان میں سب سے افضل کارنامہ یہی ہے جسے قیامت تک دنیا فراموش نہ کرسکے گی۔''[5]

سیماب نے ترجمہ 'الہام منظوم' نہایت متانت اور سنجیدگی کے ساتھ کیا اور الہامی افکار کو اس خوبی سے اردو نظم کے قالب میں ڈھالا ہے کہ کلام میں فنی نادرہ

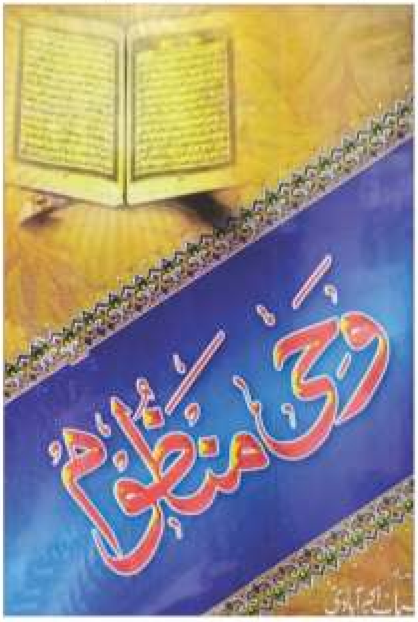

کاری کا اپنا الگ امتیاز قائم ہوگیا ہے۔ اردو میں صحت زبان کے ساتھ ساتھ صحت مفہوم کو واضح طور پر ادا کرنے کی کوشش سیماب نے نہایت کامیابی کے ساتھ کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ منظوم ترجمہ محض ترجمہ نہیں رہ جاتا بلکہ ایک ایسی شاہکار تخلیق کے روپ میں ڈھل جاتا ہے، جس میں بلا کی شعریت، معنویت اور کشش نظر آتی ہے۔ یہی باتیں سیماب کے ترجمے کو دیگر تراجم کے مقابلے ممتاز بناتی ہیں۔ یہ شعری کارنامہ ان کی شاعرانہ عظمت اور کلاسیکی فارسی ادب پر گہری نظر اور فارسی زبان پر مہارت کا واضح ثبوت ہے۔

مجموعی اعتبار سے ان کے شعری سروکار کا جائزہ لینے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ سیماب کو زبان و بیان میں پوری قدرت حاصل ہے سیماب اکبرآبادی کا کلام سوز وگداز کا حامل ہے۔ ان کے یہاں بیشتر اشعار متوازن اور صحت مندانہ روایات کے آئینہ دار ہیں، ان میں سوقیانہ پن اور ابتذال نہیں۔ سیماب نے جہاں اپنی نظموں میں اخلاقی مضامین پیش کیے ہیں جن کے مطالعے سے انسانی تہذیب، جذبۂ ایثار، حب الوطنی، نیک خیالی، حصول آزادی کے نعرے، ملک کو بہتر بنانے کا احساس، مزدوروں کی حالت پر تاسف اور ان کی اصلاح مختلف سیاسی تحریکوں کا ارتقا، قوم کو سنوارنے کی تمنا وغیرہ دیکھنے کو ملتے ہیں تو وہیں سیماب نے متفرق عنوانات زندگی کو اپنی غزلوں کے ذریعہ عوام تک سلجھے ہوئے انداز میں پہنچانے کی کامیاب سعی کی ہے۔

حواشی

1. خطبات کلیم عجم، سیماب اکبرآبادی، سیماب اکادمی، کراچی پاکستان، 1985 ص 128
2. سیماب کی نظمیہ شاعری، ڈاکٹر زرینہ ثانی، سیماب اکادمی، 1978 ص 73-74
3. خطبات کلیم عجم، سیماب اکبرآبادی، سیماب اکادمی، کراچی پاکستان، 1985 ص 161
4. عالم آشوب، سیماب اکبرآبادی (پیش لفظ، مخمور اکبر آبادی) مکتبہ قصر الادب، آگرہ ص۔س
5. شاعر، آگرہ، اسکول نمبر، 1937، ص 90

■

Dr. Muqeem Ahmad
I-23, Abul Fazal Enclave
Jamia Nagar, Okhla
New Delhi- 110025
Mob.:9999555676
moqeemjnu@gmail.com

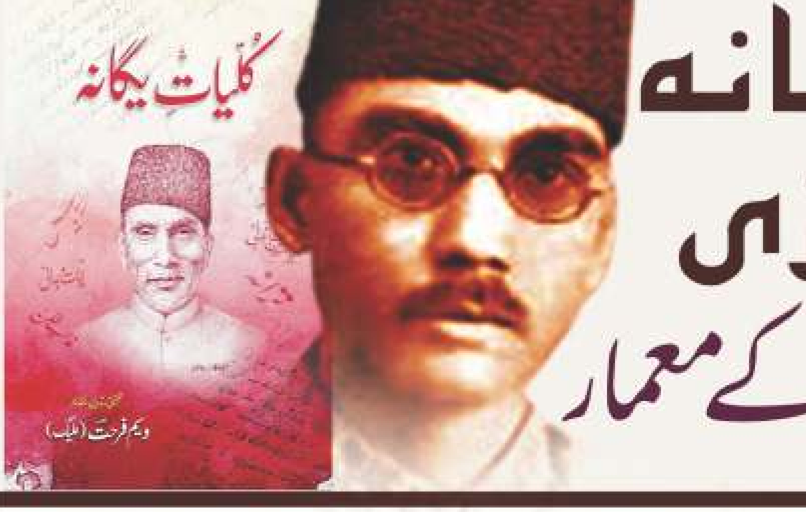

یاس یگانہ چنگیزی
جدید اردو غزل کے معمار

محمد شہاب الدین

یاس یگانہ چنگیزی کا شمار جدید اردو غزل کے معماروں میں ہوتا ہے۔ ان کا تعلق عظیم آباد سے تھا۔ آباواجداد کے پاس کافی جاگیریں تھیں۔ مرزا واجد حسین یاس یگانہ چنگیزی عظیم آبادی ثم لکھنوی ابن مرزا پیارے صاحب ابن مرزا آغا جان.. کے آبا واجداد ہزارستان غزنی سے ہندوستان آئے اور سلطنت مغلیہ کے دربار سے وابستہ ہوگئے۔ پرگنہ حویلی عظیم آباد میں جاگیریں ملیں اور وہیں سکونت پزیر ہوئے۔ یاس یگانہ اپنی کتاب 'آیات وجدانی' کے صفحہ4 میں لکھتے ہیں:

''میرے مورث اعلیٰ مرزا حسن بیگ چغتائی نے کوئی نمایاں خدمت کی ہوگی جس کے صلے میں وہ جاگیر ملی جو نسل بعد نسل عظیم آباد میں ان کی اولاد پر منتقل ہوتی رہی۔ جس کا بچا کھچا حصہ میرے والد کو بھی ملا تھا۔'' (آیات وجدانی، ص4)

یاس یگانہ چنگیزی کا اصل نام مرزا واجد حسین اور تاریخی نام مرزا افضل علی بیگ تھا۔ انھوں نے شروع میں یاس اور بعد میں یگانہ تخلص اختیار کیا اس لیے یاس اور یگانہ دونوں سے مشہور ہوئے اور چونکہ چنگیز خاں سے ان کے اجداد کا تعلق تھا اس لیے اپنے تخلص کے ساتھ چنگیزی منسلک کرلیا۔ یاس یگانہ کی پیدائش 17 اکتوبر 1884 کو محلہ مغل پورہ پٹنہ جسے زمانہ قدیم میں عظیم آباد کہتے تھے، جمعہ کے دن ہوئی۔ عظیم آباد کا یہ محلہ تیموریوں، چغتائیوں اور قزلباشوں کا مسکن تھا۔ عام بچوں کی طرح ابتدائی تعلیم مکتب میں حاصل کی۔ وہیں انھوں نے فارسی کی بھی چند کتابیں پڑھیں۔ اس کے بعد پٹنہ کے محمڈن اینگلو عربک اسکول میں داخلہ لیا۔ چونکہ پڑھنے میں اچھے تھے اس لیے انھیں ہر سال وظیفہ ملا کرتا تھا۔ سنہ 1903 میں کلکتہ یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور اس کے بعد معاش کی جستجو میں مصروف ہو گئے۔ حالات نے ساتھ نہ دیا جس کے نتیجے میں انھیں خاک چھاننی پڑی۔ 1904 میں مٹیا برج، کلکتہ میں شہزادہ مرزا مقیم بہادر کے فرزندوں کو انگریزی کی تعلیم دینے کے لیے اتالیق مقرر ہوئے۔ لیکن اتفاق سے کلکتہ کی آب وہوا ان کو راس نہ آئی۔ خرابی صحت کی وجہ سے کچھ دنوں بعد پٹنہ واپس آگئے۔ یہاں بھی صحت نے ساتھ نہیں دیا۔ 1905 میں بغرض علاج لکھنؤ گئے، یہاں کی فضا انھیں راس آگئی۔ نوابوں کے شہر کی آب و ہوا اور رنگا رنگ دلچسپیوں نے ان پر ایسا اثر کیا کہ انھوں نے لکھنؤ ہی میں رہنے کا فیصلہ کیا۔ چند برسوں بعد لکھنؤ ہی میں 1913 میں ان کی شادی جناب حکیم مرزا محمد شفیع صاحب کی دختر نیک اختر 'کنیز حسین' سے ہوئی۔ ان سے سات بچے ہوئے۔ سسرالی رشتہ ہونے کی وجہ سے انھوں نے لکھنؤ کو اپنا وطن بنالیا اور وہیں کے ہوکر رہ گئے۔

شادی کے بعد ذمے داری مزید بڑھی تو وہ روزگار کے سلسلے میں بھاگ دوڑ کرتے نظر آئے۔ ان کی ملازمت کا سلسلہ ہمیشہ ناہمواریوں کا شکار رہا۔ ایک عرصے تک وہ 'اودھ اخبار' سے وابستہ رہے۔ 1924 میں یگانہ اٹاوہ کے اسلامیہ ہائی اسکول چلے آئے۔ 1925 میں وہ اٹاوہ چھوڑ کر علی گڑھ میں ایک پریس سے منسلک ہوگئے۔ لیکن بہت جلد اگلے ہی سال 1926 میں 'اردو مرکز' لاہور سے وابستہ ہوگئے۔ یہاں کے ادیبوں سے ان کے مراسم اچھے تھے۔ شاعر مشرق علامہ اقبال کے یہاں آنا جانا رہا۔ اقبال بھی یگانہ کے بڑے قائل تھے۔ دو سال کے اندر ہی 1928 میں یگانہ نے 'اردو مرکز' چھوڑ دیا۔ اس کے بعد حیدرآباد دکن کا رخ کیا۔ یہاں کے قیام نے ان کے رزق میں کشادگی پیدا کی۔ حالانکہ یہاں ان کا تقرر محکمہ رجسٹریشن میں بحیثیت 'نقل نویس' عارضی ہوا تھا۔ لیکن جلد ہی 1931 میں یگانہ یہاں کے باقاعدہ ملازم ہوگئے۔ یہ جگہ سب رجسٹرار کی تھی۔ 1942 تک وہ اس عہدے پر فائز رہے، تقریباً 55 برس تک ملازمت کی۔

یگانہ اسکول کے زمانے سے ہی شاعری کرنے لگے تھے۔ ابتدائی دور میں بیتاب عظیم آبادی سے انھوں نے اصلاح لی۔ جب یگانہ لکھنؤ آئے تو وہاں کی ادبی محفلوں اور مشاعروں کو قریب سے دیکھا۔ لکھنؤ کا اپنا انداز تھا۔ شعرا کی اپنی شناخت تھی۔ شروع شروع میں تو انھوں نے وہاں کے ماحول میں ڈھلنے کی کوشش کی لیکن یگانہ وہاں کے ادبی مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ نہیں ہو پائے۔ لکھنؤ کا قیام ہنگامہ خیز رہا۔ جس کا اثر ان کے فن پر بھی پڑا جبکہ ابتدا میں اہل لکھنؤ نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور لیتے بھی کیوں نہیں؟ وہ تو اپنی شاعری میں یگانہ تھے۔ انھوں نے اپنا راستہ خود بنایا، ان راستوں کو ترک کردیا جو دوسروں کے بنائے ہوئے تھے۔ اس لیے لکھنؤ اسکول میں آتش کے بعد یگانہ ہی سب سے منفرد شاعر کہلائے۔ چونکہ لکھنؤ والے خود ہی اہل زبان

تھے اس لیے ان کو یہ بات کیسے ہضم ہوتی کہ کوئی غیر لکھنوی اپنا سکہ جمائے۔ اس لیے لکھنوی شعرا سے ان کی چشمک ہونے لگی۔ بات بگڑنے لگی اور نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ تحریری شکل میں مخالفت شروع ہوگئی۔ یہ الگ بات ہے کہ اس تحریری جنگ کا آغاز خود یگانہ نے کیا تھا جس کا خمیازہ انھیں بھگتنا پڑا لیکن وہ یگانہ تھے کہاں چپ بیٹھ سکتے تھے۔ انھوں نے 'شہرت کاذبہ' نام سے ایک کتاب لکھ ڈالی۔ اس کے بعد ایک دوسرے کے خلاف لکھنے کا سلسلہ چل پڑا۔ ہر عمل کا ردعمل ہوتا ہے۔ یگانہ کے ساتھ جب بار ہا مشاعروں میں یہی سلوک روا رکھا گیا تو انھوں نے بھی جوابی حملوں کی ٹھانی اور آہستہ آہستہ مرزا واجد حسین یاس عظیم آبادی سے یگانہ چنگیزی ہوگئے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

''جواباً یگانہ نے لکھنؤ کے ساتھ ساتھ ملک کے دیگر اہم شعرا پر سخت ترین الفاظ میں تنقید کا آغاز کر دیا، یگانہ کی نرگسیت کو تسکین کے لیے شایان شان ہدف کی تلاش تھی جو غالب کی صورت میں مل گیا۔ یوں وہ غالب شکن بن گیا، لیکن یگانہ نے محض تبرہ بازی نہ کی بلکہ کلام کی پختگی اور الفاظ کے استعمال کے تخلیقی شعور سے خود کو اہم اور صاحب اسلوب شاعر بھی تسلیم کیا''۔

(اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ: سلیم اختر، ص نمبر 409)

غالب کے تئیں اہل لکھنؤ بالخصوص وہاں کے ادبی حلقوں میں خاص عزت و احترام تھا۔ وہ غالب کے فن اور ان کی تخلیقی عظمت کے قائل تھے۔ خود یاس یگانہ چنگیزی بھی غالب کی اہمیت اور اردو ادب میں ان کی ازلی حیثیت و مرتبہ کے معترف تھے اور ان کو عظیم شاعر تسلیم کرتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

''یہ کس نے آپ کو بہکایا کہ میں غالب کا مخالف ہوں، وہ یقیناً بہت بڑا شاعر ہے۔ صاحب! غالب کی صحیح قدر و منزلت مجھ سے زیادہ کون سمجھے گا۔ مجھے غصہ اس بات پر آتا ہے کہ لوگ اس کے جائز مقام سے زیادہ اسے دینا چاہتے ہیں۔ اور پھر ستم یہ ہے کہ یہ بھی وہ لوگ نہیں، جو اس کا صحیح مقام سمجھتے ہوں، بلکہ وہ جو تقلیداً اسے بڑا سمجھتے ہیں...... تو صاحب! میں غالب کے خلاف نہیں تھا، اور نہ ہوں لیکن میں اس کی جائز جگہ سے زیادہ اس کے حوالے کر دینے پر تیار نہیں۔''

(مضمون از مالک رام، مشمولہ مرزا یگانہ: شخصیت اور فن، ص نمبر 19)

دراصل لکھنؤ کے شعرا غالب کو بڑی شد و مد سے

یگانہ اسکول کے زمانے سے ہی شاعری کرنے لگے تھے۔ ابتدائی دور میں بیتاب عظیم آبادی سے انھوں نے اصلاح لی۔ جب یگانہ لکھنؤ آئے تو وہاں کی ادبی محفلوں اور مشاعروں کو قریب سے دیکھا۔ لکھنؤ کا اپنا انداز تھا۔ شعرا کی اپنی شناخت تھی۔ شروع شروع میں تو انھوں نے وہاں کے ماحول میں ڈھلنے کی کوشش کی لیکن یگانہ وہاں کے ادبی مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ نہیں ہو پائے۔

چاہتے تھے۔ وہ لوگ ان کو جائز مقام دینے میں غلو کر بیٹھے تھے اسی لیے یگانہ نے ان کو جائز مقام دلانے کی کوشش کی جو ایک حقیقت پسند ادیب و ناقد کا فرض بھی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ غالب کو ان کے معیار اور مرتبے سے زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی کیونکہ یہ مناسب نہیں ہے۔ جیسا کہ مذکورہ بالا اقتباس سے واضح ہو جاتا ہے۔ جہاں پر ان کو غالب کی صفت پسند آئی انھوں نے اس کا ذکر اپنی رباعی میں کیا ہے۔ ایک رباعی کہتے ہیں۔

دونوں دیوانے ہیں علی کے طالب
جاں ایک ہے گو جدا ہیں قالب
مذہب میں شاعری میں قومیت میں
غالب ہیں یگانہ اور یگانہ غالب

یاس یگانہ نے 1934 میں 'غالب شکن' کے نام سے رسالہ شائع کیا۔ اس رسالے کو دوبارہ اضافوں کے ساتھ 1935 میں چھاپا۔ یگانہ نے جہاں بھی غالب کی مخالفت کی، دلیل کے ساتھ کی۔ وہ کئی پہلوؤں سے غالب کے مخالف تھے۔ انھوں نے ان کی فنی خامیوں کا بھی ذکر کیا۔ غالب کی فارسی آمیز شاعری سے بھی خفا تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ غالب نے اپنے فارسی کے اساتذہ سے اپنے کلام کو چرایا ہے۔ وہ مرزا غالب جیسے مشہور شاعر کو کٹ گھرے میں کھڑا کرتے رہے ہیں اور ان پر اپنے اعتراضات کا اظہار کرتے رہے ہیں۔ یگانہ کا شعر دیکھیے۔

غالب اور مرزا یگانہ کیا
آج کیا فیصلہ کرے کوئی

یہ بات بھی مبنی بر حقیقت ہے کہ غالب کی مخالفت میں انھوں نے جتنی بدنامی اور سبکی کا سامنا کیا وہ کسی اور کے حصے میں نہیں آئی۔ اس کا خمیازہ ان کو یہاں تک اٹھانا پڑا کہ ان کی ادبی خدمات اور شعر گوئی کو نئے رنگ سے آشنا کرنے اور اردو زبان کو نکھارنے، سنوارنے کی کوششیں سب ماند پڑ گئی اور بدلے میں ان کو غالب شکن کا تمغہ ملا۔ یاس یگانہ چنگیزی کی شناخت محض غالب شکن کے طور پر اردو ادب میں رہ گئی ہے۔ جبکہ وہ خود ایک قادر الکلام شاعر تھے اور ان کا امتیاز بھی یہی تھا کہ روایتی شاعری سے ہٹ کر انھوں نے جدید غزل کے لیے راستہ ہموار کیا۔ یاس یگانہ چنگیزی نے نئی غزل کا لب و لہجہ نکھارا۔ نئی غزل کی راہ ہموار کرنے میں ان کے کردار کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ باقر مہدی نے اردو غزل کے اہم ترین ناموں میں میر و غالب کے بعد تیسرا نام یاس یگانہ چنگیزی کا ہی لیا ہے:

''اردو غزل میں میر اور غالب کے بعد تیسرا نام جو سب سے زیادہ قابل احترام اور اہمیت کا مالک ہے، وہ یگانہ کا ہے۔'' (ماہنامہ آج کل، دہلی، مئی 1956، ص نمبر 15)

اسی لیے مجنوں گورکھپوری نے یاس یگانہ کی شاعری کے متعلق کہا ہے کہ ان کی شاعری سے ہمارے اندر ایک جبروتی طاقت اور ولولہ پیدا ہوتا ہے۔ یگانہ نے روایتی شاعری سے ہٹ کر ایک جبروتی رخ دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''یگانہ پہلے شاعر ہیں جو ہم کو زندگی کا جبروتی رخ دکھاتے ہیں اور ہمارے اندر سعی و پیکار کا ولولہ پیدا کرتے ہیں۔''

(مضمون 'غزل اور عصر جدید'، رسالہ نگار لکھنؤ، جنوری 1942، ص 50)

> یاس یگانہ چنگیزی پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن جتنا لکھا گیا ہے وہ ان کے قد سے کم ہے۔ عام طور پر ان کی شناخت ایک غالب شکن ادیب تک محدود رہ گئی ہے جب کہ ان کی شاعری کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی سوچ اعلیٰ و ارفع تھی۔

یگانہ نے لکھنوی شاعری اور اردو غزل کو نہ صرف طاقت و توانائی عطا کی بلکہ اس کے موضوعات میں بھی تنوع پیدا کیا۔ رونے دھونے کی روایت کو اردو غزل سے خارج کرنے کی کوشش کی جیسا کہ نیاز فتح پوری کے اقتباس سے اندازہ ہوگا۔ جس طرح کی ترجمانی یگانہ نے کی یہ اس وقت کی اردو غزل میں ایک نئے رخ، نئی سمت اور نئی منزل کی طرف لے جانے والا تھا۔ اس لیے اردو کے تمام معتبر ناقدین نے یگانہ چنگیزی کو جدید اردو غزل کا نقطہ آغاز کہا ہے۔ نیاز فتح پوری لکھتے ہیں:

''یگانہ پہلا شخص تھا جس نے لکھنؤ کے روتے اور بسورتے رنگ تغزل پر کاری ضرب لگائی اور یہ کہنا غالبا غلط نہ ہوگا کہ یگانہ ہی نے سب سے پہلے اپنے زمانے کی لکھنوی شاعری کے اس رنگ تغزل کو بدلا، جو اپنا اصلی رنگ چھوڑ کر، بے تمیزی کے ساتھ غالب کی تقلید پر آمادہ ہوگئے تھے''

(نیاز فتح پوری بزم نگار نمبر، ماہنامہ نگار لکھنؤ جنوری 1931 ص نمبر 222)

سید سلیمان ندوی نے انھیں ایک کامل شاعر تسلیم کیا ہے۔ ان کے خیالات بلند و اعلیٰ، زبان صاف ستھری، کلام حشو و زوائد سے پاک اور ترکیبیں بے مثال ہوتی ہیں۔ ان کی شاعری سے لکھنؤ میں ایک مفید انقلاب برپا ہوا۔ وہ لکھتے ہیں:

''میرزا یاس عظیم آبادی اردو کے مشہور شعرا میں سے ہیں۔ یہ بات بلا خوف و تردید کہی جا سکتی ہے کہ یگانہ اپنے وقت کے ایک کامل شاعر ہیں، ان کے خیالات بلند ہیں، زبان صاف ستھری، ترکیبیں چست اور کلام حشو و زوائد سے پاک ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ لکھنو کے طرز شاعری میں ان کے ہنگاموں کے باعث مفید انقلاب پیدا ہوا ہے، ان کے رباعیات کے مضامین نہ صرف فلسفہ خودی کی تشریح پر مشتمل ہیں بلکہ انفس کے بعد آفاق کا فلسفہ بھی ان میں جا بجا بیان کیا گیا ہے، کہتے ہیں اور کیا خوب کہتے ہیں۔''

(ترانہ، مشمولہ معارف، شمارہ نمبر 4، جلد نمبر 33، ص نمبر 314)

وہ میر و غالب اور اقبال و حالی جیسے شعرا سے مختلف سوچ رکھتے تھے۔ اپنے ہم عصروں سے الگ شناخت بنانا جانتے تھے اور انھوں نے اپنی منفرد پہچان بنائی تھی۔ جیسا کہ آل احمد سرور نے یگانہ کی انفرادیت، ان کے تیور اور ان کی آن بان شان کے بارے میں لکھا ہے:

''یگانہ واقعی بہت اچھے شاعر تھے۔ ان میں ایک انفرادیت تھی۔ ان کا رنگ ہم عصروں سے الگ تھا۔ اس میں ایک مردانگی، ایک تیور، ایک ولولہ، ایک آن بان نظر آتی ہے۔'' (خواب باقی ہیں، ص 222)

یاس یگانہ چنگیزی پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن جتنا لکھا گیا ہے وہ ان کے قد سے کم ہے۔ عام طور پر ان کی شناخت ایک غالب شکن ادیب تک محدود رہ گئی ہے جب کہ ان کی شاعری کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی سوچ اعلیٰ و ارفع تھی جو اصلاح معاشرہ کے لیے تھی۔ مثلاً ان کا یہ شعر ہر اس شخص کے لیے ہے جو دنیاوی مال و دولت کے نشے میں چور ہو کر اپنے آپ کو ہی خدا سمجھ بیٹھتا ہے، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اس کے بس میں کچھ نہیں ہوتا۔ ان کا یہ شعر ہر اس مغرور و متکبر انسان کے لیے چیلنج ہے کہ انسان خدا نہیں بن سکتا۔

خودی کا نشہ چڑھا آپ میں رہا نہ گیا
خدا بنے تھے یگانہ مگر بنا نہ گیا

یگانہ نے غزل کو مصنوعی اور گنجلک و پیچیدہ زبان سے نکال کر سادہ اور آسان زبان کے ساتھ پر اثر انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ غزل کو مبالغہ اور مصنوعی جذبات سے پاک دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ مانتے تھے کہ غزل کی بنیاد جھوٹی عشقیہ شاعری پر ہے۔ اسی لیے انھوں نے اپنی شاعری میں صاف گوئی کو جگہ دی اور اردو غزل کو سچائی کا آئینہ دکھایا۔ انھوں نے اردو غزل کے پرانے اصولوں کو چیلنج کیا اور اس سے ہٹ کر غزل کو نئی راہ دکھائی۔ ان کی اس خوبی کو دیکھتے ہوئے نرلیش کمار شاد نے یاس یگانہ چنگیزی کو عظیم غزل گو شعرا میں شمار کیا ہے۔ ان کے نزدیک یگانہ کی شعری عظمت پر شک کرنا ایک ادبی خیانت کے مترادف ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''یگانہ بلا شبہ اس دور کے نہایت عظیم غزل گو شعرا میں سے ہیں اور ان کی عظمت میں شک کرنا، ادبی خیانت کے مترادف ہے۔''

('یاس کی خود پرستی'، رسالہ نیا دور، لکھنؤ، جولائی 1961، ص 32)

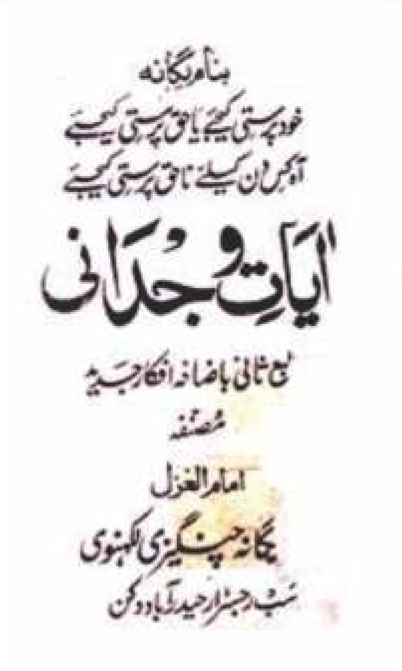

ان کی شاعری میں خودی، انانیت، چیلنج، انصاف، ولولہ، انقلابی جذبات، تنقید ذات، سماجی منافقت، سچائی، خودداری، وقت کی بے رحمی اور فلسفیانہ کلام کی جھلک نظر آتی ہے۔ اسی لیے یہ وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی شاعری میں وہ گہرائی ہے کہ جس میں جس قدر غواصی کی جائے گی اس سے ہمیشہ نئے مفاہیم اور نئی بصیرتیں روشن ہوں گی۔

■

Md. Shahabuddin
Assistant Prof & Head Dept of Urdu
Marwari College
Bhagalpur- 812007 (Bihar)
Mob.:8826080282
shahab.qasmi1@gmail.com

سماجی روایت کا نوحہ گر

علی عباس حسینی

گلاب سنگھ

علی عباس حسینی (1897-1969) اردو ادب کے ایک ممتاز افسانہ نگار، نقاد، ڈراما نویس، اور مترجم تھے جنھوں نے اپنے قلم سے سماجی روایات، انسانی نفسیات اور معاشرتی مسائل کو نہایت گہرائی اور فنکارانہ انداز میں پیش کیا۔ ان کا ادبی سفر اردو افسانہ نگاری کی ترقی پسند تحریک کے عہد میں شروع ہوا، اور انھوں نے اپنے تخلیقی کاموں کے ذریعے معاشرے کے زخموں کو نوحہ گری کے انداز میں بیان کیا۔ وہ سماجی ناہمواریوں، طبقاتی کشمکش، اور انسانی رشتوں کی نزاکتوں کے عکاس بنے، اور ان کی تحریریں آج بھی اردو ادب میں اہم مقام رکھتی ہیں۔ علی عباس حسینی 3 فروری 1897 کو اتر پردیش کے ضلع غازی پور کے ایک گاؤں پارہ میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق ایک متوسط گھرانے سے تھا، اور بچپن سے ہی انھیں کہانیوں اور قصوں سے گہرا لگاؤ تھا۔ دس گیارہ برس کی عمر میں ہی انھوں نے 'الف لیلیٰ'، 'شاہنامہ فردوسی'، اور 'طلسم ہوش ربا' جیسے ادبی شاہکاروں کا مطالعہ کر لیا تھا، جو ان کے ادبی ذوق کی ابتدائی تربیت کا حصہ بنے۔ انھوں نے مشن ہائی اسکول الہ آباد سے میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کی تعلیم حاصل کی، پھر کیننگ کالج لکھنؤ سے بی اے اور الہ آباد یونیورسٹی سے تاریخ میں ایم اے کیا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ گورنمنٹ جوبلی کالج لکھنؤ میں استاد مقرر ہوئے اور 1954 میں پرنسپل کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ ان کے یہ سوانحی کوائف ان کے علمی و ادبی کارناموں پر پوری طرح اثر انداز ہوئے ہیں۔

علی عباس حسینی نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز 1917 میں اپنے پہلے افسانے 'غنچہ ناشگفتہ' سے کیا۔ اس کے بعد 1920 میں انھوں نے 'سر سید احمد پاشا' کے قلمی نام سے اپنا پہلا رومانوی ناول 'قاف کی پری' لکھا۔ ان کا دوسرا ناول 'شاید کہ بہار آئی' ان کی رومانوی تحریروں کا آخری نمونہ تھا۔ تاہم ان کی شہرت کا اصل سبب ان کے افسانے اور تنقیدی مضامین ہیں۔ ان کے افسانوں کے مجموعوں میں 'رفیق تنہائی'، 'باسی پھول'، 'کانٹوں میں پھول'، 'میلہ گھومنی'، 'ندیا کنارے'، 'آئی سی ایس اور دوسرے افسانے'، 'یہ کچھ ہنسی نہیں ہے'، 'الجھے دھاگے'، 'ایک حمام میں'، اور 'سیلاب کی راتیں' شامل ہیں۔ ان کے ڈراموں کا مجموعہ 'ایک ایکٹ کے ڈرامے' کے نام سے شائع ہوا۔ ان کی تنقیدی کتاب 'عروس ادب' اردو فکشن کی تنقید و تاریخ کے حوالے سے ایک مستند حوالہ سمجھی جاتی ہے۔ پریم چند اسکول کے ارتقائی مراحل کو فروغ دینے والوں میں علی عباس حسینی کا نام اہم ہے۔ جس عہد میں انھوں نے ادبی دنیا میں قدم رکھا اس وقت پریم چند، سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری، سلطان حیدر جوش، سدرشن، اعظم کریوی، سہیل عظیم آبادی وغیرہ افسانوی ادب میں روح پھونک چکے تھے۔ لیکن علی عباس حسینی کی انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے وسیع اور عمیق مطالعہ اور گہری علمی بصیرت کے ذریعے اسے اور بھی روشن کیا۔ بقول مظہر امام:

''علی عباس حسینی نے اپنے وسیع مطالعے، حسن ذوق، صلاحیت داستان گوئی اور فنی بصیرت سے کام لے کر اپنے فن کی شمع اس طرح جلائی کہ نہ صرف اپنے معاصرین کے درمیان ان کا اپنا چہرہ تابناک اور روشن رہا، بلکہ اپنے بعد کی نسل میں بھی وہ غیریت اور اجنبیت کی نگاہ سے نہ دیکھے گئے۔''

(ڈاکٹر تہمینہ اختر، علی عباس حسینی، حیات اور ادبی خدمات، جواہر آفسیٹ پرنٹرس، دہلی، سنہ 1992، ص: 69)

علی عباس حسینی کو 'سماجی روایت کا نوحہ گر' کہنا اس لیے مناسب ہے کہ انھوں نے اپنے افسانوں میں معاشرے کے دکھوں، تضادات، اور ناانصافیوں کو ایک نوحہ کی شکل میں بیان کیا۔ ان کی تحریروں میں سماجی ہم آہنگی، طبقاتی تفاوت، اور انسانی رشتوں کی پیچیدگیوں کو نہایت حساسیت سے پیش کیا گیا ہے۔ ان کا مشہور افسانہ 'میلہ گھومنی' اس کی واضح مثال ہے، جس میں انھوں نے دیہی زندگی کے مسائل اور روایات کو بیان کرتے ہوئے معاشرتی ناہمواریوں پر نوحہ خوانی کی۔ ان کے افسانوں میں کردار اکثر سماج کے مظلوم طبقات سے تعلق رکھتے ہیں، جو اپنی زندگی کی تلخیوں اور مجبوریوں سے لڑتے نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر، ان کے ایک افسانے میں شیخ سعید نامی کردار فرقہ وارانہ فسادات کے دوران اپنے نواسے کے لیے دودھ لینے نکلتا ہے، لیکن اسے ایک ہندو شخص اغوا کر لیتا ہے۔ کہانی کے اختتام پر دونوں کرداروں کے درمیان انسانی ہمدردی کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے، جو سماجی ہم آہنگی کی ایک خوبصورت تصویر پیش کرتا ہے۔ اس طرح حسینی نے نفرت اور تعصب کے خلاف محبت اور انسانیت کا نوحہ

پڑھا۔اسی طرح ان کا افسانہ 'ندیا کنارے' دیہی زندگی کی سادگی اور غربت کے دکھوں کو بیان کرتا ہے۔ان کی کہانیوں میں عورتوں کے مسائل، خاندانی رشتوں کی نزاکتیں، اور معاشی استحصال جیسے موضوعات بار بار سامنے آتے ہیں۔ وہ معاشرے کے ان زخموں کو نوحہ گری کے انداز میں پیش کرتے ہیں، لیکن ساتھ ہی امید اور انسانیت کی روشنی بھی دکھاتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں ترقی پسند فکر کی جھلک نمایاں ہے، لیکن وہ محض نعرہ بازی سے بالاتر ہوکر انسانی نفسیات اور سماجی حقائق کو گہرائی سے دیکھتے ہیں۔

جیسا کہ ظاہر ہے ابتدائی دور کی کہانیوں میں داستانی رنگ اور رومانیت کا عکس نمایاں ہے، جس سے حقیقت پسندی کے بادشاہ یعنی پریم چند بھی نہ بچ سکے۔ چنانچہ علی عباس حسینی کے ہاں بھی ابتدا میں یہ رنگ موجود ہے۔اس دور کے افسانوں میں عورت ان کی کہانیوں کا مخصوص موضوع رہا۔لیکن کہانی کے بغور مطالعہ سے اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ حسینی کے نزدیک عورت کی دلکشی اور رعنائی محض وقتی قرب ولذت و آشنائی کے لیے نہیں بلکہ وہ اتھاہ سمندر ہے، جس کا کنارہ تلاش کرنا ناممکن ہے۔ یعنی اس عورت کے حسن میں ماں، بہو، بیٹی، بیوی، بہن کے پاک اوتار کے ساتھ ایک ایسا مضبوط رشتہ قائم ہے، جس میں قربانی وایثار، حیا اور وفاداری کا سچا جذبہ بھی موجود ہے۔گویا حسینی کی رومانیت کروٹ لیتی ہے اور حقیقت پسندی کا عکس ظاہر ہونے لگتا ہے۔البتہ یہ درست ہے کہ حسینی کی ابتدائی کہانیوں پر رومانیت اور شاعرانہ انداز نگارش غالب ہے۔ تاہم ان کا نقطۂ نظر خالص رومانوی نہیں بلکہ معاشرتی اصلاح اور حقیقت پسندی کے نقطۂ نظر سے عبارت ہے۔ بقول ڈاکٹر تہمینہ اختر:

''عورت کا صرف یہ تصور ہی حسینی کے ہاں موجود نہیں بلکہ عورت کا درجہ حسینی کے یہاں بہت بلند ہے۔ ماں، بہن، بیٹی اور بیوی کسی بھی روپ میں آئے اکثر قربانی وایثار کی بیٹی، وفا کی دیوی بن کر آتی ہے۔ جو خاردار کو گلزار بنا سکتی ہے۔ جو صحرا میں گلاب کھلا سکتی ہے۔ جو بھٹکوں کو راستہ دکھاتی ہے، نورونار اور بیوی میں اس کا روپ نکھر کر سامنے آتا ہے۔ بے باک، ہرجائی اور بے وفا عورت بھی ان کی کہانیوں میں آتی ہے۔ مگر فن کار اسے ناانصافی کا شکار ہونے سے بچا لیتا ہے۔

علی عباس حسینی نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز 1917 میں اپنے پہلے افسانے 'غنچہ ناشگفتہ' سے کیا۔اس کے بعد 1920 میں انھوں نے 'سر سید احمد پاشا' کے قلمی نام سے اپنا پہلا رومانوی ناول 'قاف کی پری' لکھا۔ان کا دوسرا ناول 'شاید کہ بہار آئی' ان کی رومانوی تحریروں کا آخری نمونہ تھا۔تاہم ان کی شہرت کا اصل سبب ان کے افسانے اور تنقیدی مضامین ہیں۔

یا بتولن اور اس قسم کی چند کہانیوں میں انھوں نے عام روش سے ہٹ کر عورت کا ایک روپ دکھایا ہے، جو محبوب کی خاطر ہر بدنامی کو برداشت کر لیتی ہے۔ جو آوارہ ہوتے ہوئے بھی محبت کا شدید جذبہ دل میں رکھتی ہے۔''

(علی عباس حسینی ،افسانہ باسی پھول ، مجموعہ (باسی پھول) ، مکتبہ اردو، لاہور، س 1939، ص:45)

حسینی کے رومانوی اور عشقیہ موضوع کے بطن سے جو اصلاحی وحقیقی افسانے جنم لیتے ہیں، ان میں باسی پھول، کیے کا بھوگ، عدالت، رفیق تنہائی، مقابلہ، بندوں کی جوڑی، انتقام، نئی ہمسائی، بہو کی ہنسی، سکھی اور باغی کی بیوی وغیرہ اہم ہیں۔ان میں افسانہ 'باسی پھول' بے حد اہم قرار پاتا ہے۔افسانہ کا مرکزی کردار رشید اور صابرہ ہیں۔ دونوں ایک دوسرے سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔لیکن صابرہ کی شادی دوسرے شخص سے طے ہو جاتی ہے اور اس طرح دونوں ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں۔ شادی کے سات سال بعد صابرہ بیوہ ہو جاتی ہے۔ صابرہ کی بیوہ زندگی رشید دیکھ نہیں پاتا ہے۔ اس کا عشق جوش مارتا ہے، وہ صابرہ سے شادی کی درخواست کرتا ہے مگر بیوہ صابرہ رشیدہ سے بے پناہ عشق کے باوجود دوسری شادی کو معیوب سمجھتی ہے اور رشید سے کہتی ہے:

''...اس کے معنی یہ تو نہیں کہ آپ دین وایمان سب بھول کر جہنم وجنت سب سے انکار کر کے کفر بکنے لگیں۔'' (ایضاً،ص:47)

صابرہ رشید کے پیغام کو کفر اور دین وایمان کے خلاف سمجھتی ہے، کیونکہ بیوہ کی شادی آج بھی ہمارے ملک میں سماجی نقطۂ نظر سے پوری طرح قابل قبول نہیں۔حسینی اس بندھن کے خلاف آواز اٹھاتے ہوئے رشید کی زبانی لکھتے ہیں:

''... کیا خدا نے بیوہ سے عقد کا حکم نہیں دیا ہے۔ کیا رسول اللہ نے خود اس پر عمل کر کے نہیں دکھایا۔لیکن آپ نے اسے گالی کے مترادف سمجھا۔ سوائے ہندوستان کے کسی ملک میں اسے نہ معیوب سمجھتے ہیں نہ خلاف عقل وشرع...''

(پروفیسر صغیر افراہیم ،ترقی پسند تحریک سے قبل ،اردو افسانہ (افسانہ شہید معاشرت)،ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ،سنہ 2009، ص:99)

علی عباس حسینی نے افسانہ 'شہید معاشرت' میں بیوہ کی حالت زار کو بے حد کربناک جملے میں بیان کیا ہے:

''پانچ برس کے سن میں بیاہی گئی اور بارہ برس کی عمر میں بیوہ ہوئی۔عنفوان شباب میں شوہر کے پیار ومحبت کی جگہ ساس کی جوتیاں تھیں اور نندوں کی قینچی کی طرح چلتی ہوئی زبانیں۔''

افسانہ کی ہیروئن اپنے عاشق موہن سے بیوگی کی حالت زار بیان کرتے ہوئے کہتی ہے:

''میں بد نہ سہی مگر بدنام ہوں، اس لیے میں کسی شریف کی بیوی بننے کے قابل نہیں رہی۔ اب میں صرف نفس پرستوں کا شکار بن سکتی ہوں اور محض اسی کے لائق ہوں...موہن! دیکھو اپنی اور میری سچی محبت میں داغ نہ لگاؤ۔ ہندو عورت گر کر نہیں ابھرتی اور نہ میں تمھاری دشمن ہوں کہ اپنے ساتھ تمھیں بھی لے ڈوبوں۔'' (ایضاً،ص:100)

اس کٹھن بھری زندگی کی آخری سانس وہ ودھوا آشرم میں لیتی ہے اور مرتے وقت موہن کو نصیحت

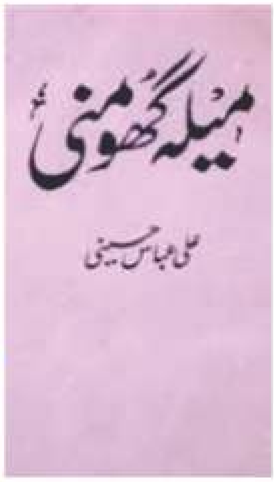

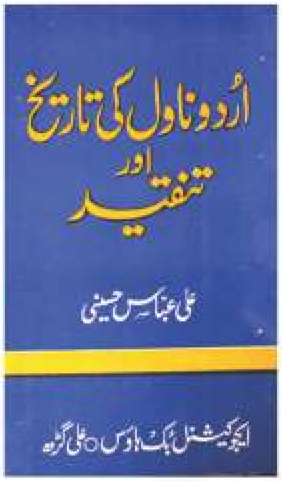

کر جاتی ہے کہ

''وعدہ کرو کہ تم اپنی طرف سے حتی الامکان کوشش کرو گے کہ تم بدھوا بواہ ''عقد بیوگان' کے رائج کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دو گے۔ ہندو ذات میں اس سے زیادہ برا عیب کوئی نہیں۔'' (ایضاً،ص:100)

حسینی دیہی زندگی کے بندھنوں اور محنت کش طبقہ کی روداد سے پوری طرح واقف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے دیہی طرز و معاشرہ کو اپنے اندر جذب کر لینے میں کامیاب رہے۔ انھوں نے سرمایہ دارانہ طبقے کے جبر واستحصال اور محنت کش طبقے کی کسمپرسی اور مذہبی بندھنوں کی بھی بھرپور عکاسی کی ہے۔ بقول وقار عظیم:

''علی عباس حسینی کے دردمند دل نے دیہات کی زندگی میں درد وغم کے ان گنت موقع تلاش کر لیے اور اس میں اپنے دل کی تڑپ و کسک اور درد وغم کے تاثر کو شامل کر کے دوسروں کو بھی اپنا شریک غم بنایا ہے۔ حسینی نے پریم چند کی ڈگر پر چل کر دیہاتوں کی گلی کوچوں میں پہنچنا سیکھا اور اپنی باریک بین نظروں سے وہ مناظر دیکھے جو پریم چند کی نظر سے بھی پوشیدہ تھے۔ ان مناظر کو حسینی نے فن کے رس میں بھر کر سب کے سامنے پیش کیا۔ اس طرح حسینی نے بھی زیادہ تر دیہات کے متعلق ہی افسانے لکھے ہیں اور پھر حسینی تو ایک حساس ماحول کی پیداوار تھے۔ انھوں نے اپنے ماحول کی دھڑکن صرف سنی ہی نہیں بلکہ محسوس بھی کی ہے۔ اسی لیے تو ان کے دائرہ قلم کا مرکز شعوری یا تحت الشعوری طور پر متعین ہو چکا تھا۔ زمیندار کا ظلم اور رعایا کی مصیبت۔''

(وقار عظیم، نیا افسانہ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، سن 1987، ص:25)

دیہاتی زندگی پر مشتمل افسانہ کفن، بیگار، میلہ گھومنی، خوش قسمت لڑکا، انتقام، سکھی، پاگل، کھیت وغیرہ ہیں۔ جن میں دیہات کی معصوم اور فطری زندگی کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ اس ضمن میں افسانہ 'انتقام' ہے، جو جاگیردانہ طبقے کے جبر واستحصال کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے۔ افسانہ 'بیگار' میں کسانوں کی روداد چھمن کی زبانی ملاحظہ ہو:

''چنادادا یہ تو بتاؤ کہ جنھیں پرمیشور نے جمیندار کو جنم دیا، اس نے ہم پرجا کو بھی بنایا کہ کوئی اور ہے؟''

چھمن اپنے ساجی بندھنوں کے تجربات کو کچھ یوں بیان کرتا ہے یا جواب دیتا ہے:

''پنڈت جی کہتے تھے ہجاروں، لاکھوں دیوی دیوتا میں ایسا جان پڑتا ہے کہ جمیندار کو کسی بڑے دیوتا نے بنایا اور پرجا کو کسی بالکل چھوٹے دیوتا نے۔''

(علی عباس حسینی، افسانہ بیگار، مجموعہ (میلہ گھومنی) بی۔ آر۔ بی ایس پریس، لاہور، سنہ 1947، ص:259-258)

علی عباس حسینی نے اس افسانے کے ذریعے ساجی استحصال کو بے نقاب کیا ہے۔ چھمن کا مندرجہ بالا مکالمہ واضح کرتا ہے کہ مظلوم طبقات پنڈتوں اور ساہوکاروں کے فریب میں اس طرح جکڑ چکے تھے کہ بڑے دیوتا ان برہموں کو سمجھنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ سدرشن کے افسانوں میں ساجی حقیقت کی بہترین مثال افسانہ 'بیوی' ہے۔ افسانہ کا مرکزی کردار یورپ میں تعلیم یافتہ دولت مند منور ہے۔ جس کی نظر میں عورت وقتی پھول ہے، جسے گلے کا ہار بنانا ٹھیک نہیں۔ منور کا نکاح اس کے والد مرحوم طالب علمی کے زمانے میں کر چکے تھے۔ جسے منور تسلیم کرنے سے انکار کر دیتا ہے بلکہ ہر طرح سے لعن طعن عورت سے متعلق کرتا ہے اور عیش پرستی کے جال میں ملوث ہو جاتا ہے۔ مگر ایک وقت ایسا آ پڑتا ہے کہ چیچک کے مرض کا شکار ہو جاتا ہے۔ جب اس کی خبر اس کی بیوی سلمٰی کو ملتی ہے تو وہ تڑپ اٹھتی ہے اور وہ اس کی تیمارداری کے لیے والدین کی اجازت چاہتی ہے، کیوں کہ اس کی نظر میں منور اس کا شوہر ہے۔ حسینی سلمٰی کی زبانی بیان کرتے ہیں:

''وہ جانتی تھی کہ عقد نے اسے منور کی بیوی بنا دیا ہے اور وہ اس کا سرتاج اور شوہر ہو چکا ہے، بیاہ محض ہندوستانی رسم کی پابندی عرف عام کی پیروی ہے۔''

(علی عباس حسینی، افسانہ بیوی، مجموعہ (باسی پھول) مکتبہ اردو، لاہور، سنہ 1939، ص:82-81)

سلمٰی جو حسین و نوجوان منور کا خواب صدیوں سے سجائے بیٹھی تھی اس کی بگڑی صورت میں تلاش کر رہی تھی۔ سلمٰی کی تیمارداری رنگ لائی اور منور رفتہ رفتہ ٹھیک ہو گیا لیکن اپنی عیش پرست آنکھوں کو نہ بچا سکا اور وہ سلمٰی کے ساتھ کی گئی حرکتوں پر بے حد شرمندہ ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ:

''ہائے! تمھیں اب میں دیکھ نہیں سکتا!''

اور کانپتے ہوئے لب سے بولا۔

''سلمٰی تم کو مجھ سے طلاق لے لینا چاہیے۔ میں پہلے روحانی طور پر اندھا تھا، اب جسمانی حیثیت سے بھی ہوں، میں تمھیں اپنی لکڑی نہ بناؤں گا۔'' (ایضاً، ص:87)

سلمٰی جواب دیتی ہے:

''آپ اس طرح کی باتیں نہ کریں، مجھے رنج ہوتا ہے۔ بیوی شوہر سے علاحدہ نہیں ہو سکتی! دونوں ایک دوسرے کے سہارے۔۔۔'' (ایضاً، ص:88-87)

ان چند جملوں کے ذریعے حسینی نے مغربی اور مشرقی امتزاج کو واضح کر دیا ہے، ساتھ ہی مشرقی عورت کی معصوم ذہنیت کی عکاسی بھی۔ ڈاکٹر تہمینہ حسینی کے افسانوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''تاہم سینہ زنی اور قنوطیت کی حد تک حسینی کے افسانے نہیں پہنچے ہیں اور نہ ہی ان میں مایوسی یا ناامیدی ملتی ہے بلکہ ان کے افسانوں کی فضا تو کسی حد تک امید افزا ہوتی ہے۔ ان کے افسانوں کو پڑھ کر غم کے آنسو بھی نکلتے ہیں تو کہیں خوشی کے آنسو بھی۔ اپنے افسانوں کو حسینی صاحب نے اپنی زندگی کے فلسفہ یعنی محبت، ایثار، قربانی، خدمت گزاری، جاں نثاری اور گہری دردمندی سے تشکیل کیا ہے۔ اس لیے تو یہ سب چیزیں حقیقت بن کر ان کے افسانوں میں نظر آتی

ہیں۔ جو دل و دماغ پر اثر کیے بغیر نہیں رہتی اور جو حسینی کے دردمندانہ دل کی کیفیتوں کا اظہار بھی کرتے ہیں۔''

(ڈاکٹر تہمینہ اختر، علی عباس حسینی، حیات اور ادبی خدمات، جواہر آفیسٹ پرنٹرس، دہلی، سنہ 1992، ص:115-114)

حسینی نے گاؤں کے کسانوں کی معصوم اور فطری زندگی اور جبر و استحصال کے ساتھ شہری زندگی کو بھی موضوع قلم بنایا۔ اس نوع کے افسانوں میں نئی ہمسائی، زود پشیماں، شہیدت معاشرت، صفیر قفس، مغالطہ کی قیمت، باغی کی بیوی وغیرہ اہم ہیں۔ ان میں 'نئی ہمسائی' طوائف کے کردار پر مشتمل افسانہ ہے۔ حقیقتاً یہ ایک اصلاحی نوعیت کا افسانہ ہے، جس میں حسینی نے اس جانب اشارہ کیا ہے کہ ہر مذہب اور ہر طبقہ کے دل میں انسانیت کا جذبہ موجود ہوتا ہے، اس لیے ہمیں کوئی حق نہیں کہ ایک دوسرے کو اس کے مذہب، فرقہ یا پیشہ سے متعلق آواز اٹھائیں اور ذلیل و خوار کریں۔ طوائف کے درد کو حسینی اس کی زبانی بیان کرتے ہوئے سماج پر طنز کرتے ہیں:

''میں بیسوا کے گھر میں پیدا ہوئی۔ بیسوا ہی بن کر رہ سکتی ہوں۔ شریف نہیں بن سکتی! خدا توبہ قبول کر سکتا ہے مگر انسان نہیں بخش سکتا ہے، وہ اور اس کے قانون خدائی قانون سے بھی زیادہ سخت ہیں۔''

(علی عباس حسینی، افسانہ نئی ہمائی، مجموعہ (باسی پھول) مکتبہ اردو لاہور، سنہ 1939، ص:92)

حسینی نے بھی پریم چند کی طرح وطن کی محبت اور آزاد ہندوستان کے خواب پر مشتمل افسانے تخلیق کیے اور ساتھ ہی ہندو مسلمانوں کی انسان دوستی اور اتحاد کو بھی موضوع بنایا جو فرنگی حکومت نے اپنی شاطرانہ چال کے ذریعے ہندوؤں اور مسلمانوں کو مذہب کے نام پر جنگ کا شعلہ بھڑکایا تھا۔ مثلاً ماں کی پکار، وطن کی پاک مٹی، ہمارا گاؤں، میخانہ، ندیا کنارے اہم ہیں۔ ایک ماں کے دو بچے، ہندو مسلم فسادات کی تصویر کشی کی بہترین مثال ہے۔ یہ افسانہ نفرت اور انتقام سے شروع ہو کر محبت، بھائی چارگی اور اخیر میں حب الوطنی کے درس پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔ اس کا موضوع کلکتہ میں ہندو مسلم فساد ہے، جس میں ایک مسلم اپنے یتیم نواسہ کے لیے دکان سے کچھ خرید کر ٹیکسی پر سوار ہوتا ہے تو ایک ہندو اس کی گردن پر چاقو رکھ دیتا ہے۔ مسلمان ہندو سے جب اس انتقام کی وجہ دریافت کرتا ہے تو وہ کہتا ہے:

''اس کا بیٹا اپنے چھ ماہ کے بچے کے لیے غذا لینے کو نکلا ہی تھا کہ مسلمانوں نے اسے مار ڈالا۔ اب اس ظلم کے بعد تم کیسے امید رکھتے ہو کہ میں اپنے بس میں لانے کے بعد کسی مسلمان کو زندہ چھوڑوں گا۔''

(ڈاکٹر تہمینہ اختر، علی عباس حسینی، حیات اور ادبی خدمات، جواہر آفیسٹ پرنٹرس، دہلی، سنہ 1992، ص:81)

ہندو کے درد و کرب کا انتقامی جذبہ دیکھ کر مسلمان اس سے یہ التجا کرتا ہے کہ مجھے قتل کرنے کے بعد زکریا

علی عباس حسینی کی کہانیاں سماجی مسائل کی آئینہ دار ہیں اور ان کی تنقید ادبی معیار کو بلند کرنے میں معاون ثابت ہوئی۔ وہ ایک ایسے نوحہ گر تھے جنہوں نے معاشرے کے دکھوں کو اپنی تحریروں میں سمو کر انھیں ابدی بنا دیا۔

اسٹریٹ کے مسلم ہوٹل میں نمبر 28 کے کمرے تک جانا جہاں دو لاشیں موجود ہیں۔ ایک نوجوان بیٹے کی اور دوسری میری سال بھر کی بیاہی بیٹی کی۔ ہوٹل والے کو میرا بٹوا دے دینا، تاکہ تجہیز و تکفین کر سکے اور بیٹی کی گود میں تین دن کا نونہال سسکتا ملے گا، اسے یہ فلن فوڈ پھر کھلا دینا اس کے بعد اسے بھی قتل کر دینا۔ مسلمان کی خواہش سن کر ہندو جسونت رائے کا دل بھر آیا اور نفرت محبت میں تبدیل ہو گئی اور دونوں نواسے تک پہنچے اور جسونت رائے شیخ سعید سے ان کا نواسا لے کر اپنی بدھوا بہو کی گود میں دیتے ہوئے بولتا ہے:

''بہو'' ایک مسلمان نے تیری مانگ کا سندور چھینا اور تو نے بڑے جیتے ہوئے دل پر پھاہا رکھا اور اپنے لخت جگر سے تیری بھری گود اور بھری۔ یہ دوسرا بچہ ہے تیرا۔ جس کے دو بچے ہوں، اس کا شوہر کا غم کیوں...؟'' (ایضاً، ص:81)

افسانے کا اختتام حب الوطنی اور قومی و ملی اتحاد کا درس دیتا ہے:

''دیکھو یہ بھارت ماتا کی گود میں دو بچے ہیں۔ ایک ہندو اور ایک مسلمان... یہ میری داہنی اور بائیں آنکھیں ہیں۔ جب ان میں سے ایک پھوٹی تو میں کانی ٹھہری اور جب دونوں تو بالکل اندھی۔'' (ایضاً، ص:82)

علی عباس حسینی کی کہانیوں کے مکالمے سے واضح ہوتا ہے کہ ان کا طرز تحریر پریم چند اسکول کو آگے بڑھانے میں معاون ثابت ہوا۔ انھوں نے اردو فکشن کو حقیقت کے نئے آہنگ سے روشناس کیا اور اپنی ذہین اور جدت پسند طبیعت کے سبب کسانوں کی غربت و مظلومیت کا حقیقی نقشہ کھینچا اور ساتھ ہی شہری زندگی، فرقہ واریت، تقسیم ہند کی جانب بھی اپنے قلم کو جنبش دے کر اصلاحی اور حقیقی افسانے اور ناول خلق کیے۔

حسینی کا اسلوب سادہ لیکن گہرا ہے۔ وہ پیچیدہ الفاظ کے بجائے روزمرہ کی زبان استعمال کرتے ہیں، جو ان کی کہانیوں کو عام قاری تک پہنچاتی ہے۔ ان کی تحریروں میں مشاہدے کی گہرائی، کردار نگاری کی نزاکت، اور سماجی مسائل کی عکاسی انھیں منفرد بناتی ہے۔ وہ روایت اور جدت کے درمیان ایک پل کا کردار ادا کرتے ہیں، کیونکہ ان کے افسانوں میں دیہی روایات کے ساتھ ساتھ جدید سماجی شعور بھی جھلکتا ہے۔ علی عباس حسینی کا ادب آج بھی اردو افسانہ نگاری میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ ان کی کہانیاں سماجی مسائل کی آئینہ دار ہیں اور ان کی تنقید ادبی معیار کو بلند کرنے میں معاون ثابت ہوئی۔ وہ ایک ایسے نوحہ گر تھے جنہوں نے معاشرے کے دکھوں کو اپنی تحریروں میں سمو کر انھیں ابدی بنا دیا۔ ان کی وفات 27 ستمبر 1969 کو ہوئی، لیکن ان کا ادبی ورثہ آج بھی زندہ ہے۔ علی عباس حسینی سماجی روایت کے ایک سچے نوحہ گر تھے جنہوں نے اپنے فن کے ذریعے معاشرے کی تلخیوں، تنوع، اور تضادات کو بیان کیا ہے۔ ان کی تحریریں نہ صرف ادبی شاہکار ہیں بلکہ ایک سماجی دستاویز بھی ہیں جو ہمیں اپنے ماضی اور حال کو سمجھنے میں مدد دیتی ہیں۔ ان کا کام اردو ادب کے طلبا اور قارئین کے لیے ایک علمی اثاثہ ہے، جو ہمیں بہت سی معاشرتی سچائیوں، ان کے اسباب و عوامل اور مختلف پہلوؤں سے ان کے حل کی تجویز سے متعلق سنجیدہ غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔

■

Dr. Gulab Singh
R/O Beoli Doda (J&K)
Mob:7006847561
Email: gulabsingh2035@gmail.com

مجروح کا شعری آفاق

محمد دانش

مجروح نے اردو غزل کو جدید لب و لہجہ، جدید تیور اور جدید طرز و آہنگ عطا کر کے غزل کے شیدائیوں کو مخمور کر دیا اور غزل کی لطافت، حلاوت اور حسیت کو قائم رکھا۔ مجروح نے یہ ثابت کیا کہ غزل دنیا کے کسی بھی مسئلے، کسی بھی کیفیت اور کسی بھی موضوع کو بیان کرنے کی قابلیت رکھتی ہے۔ خواہ مسئلہ چھوٹا ہو یا بڑا، غزل کے دو مصرعوں میں پوری داستان سما سکتی ہے۔ غزل کے دو مصرعے سامع اور قاری کو بغیر وقت ضائع کیے جو لطف اور نتیجہ عطا کر سکتے ہیں۔ کوئی دوسری صنف نہیں عطا کر سکتی۔

مجروح کے شعری خزانوں میں غزلوں کی تعداد مختصر ہی سہی لیکن ان کے غزلیہ کارناموں نے ہر قسم کے طبقہ کو متاثر کیا۔ ان کے مخالف نقاد بھی ان کے جادوئی سخن کے دیوانے ہو گئے۔ انھوں نے فلموں میں بھی غزلیں لکھیں اور فلمی دنیا کے ذریعہ ان کے نغموں کی صدا ملکوں ملکوں گونجی۔ غزل کی آبیاری میں ان کا خون پسینہ شامل ہے۔ انھوں نے طب کا پیشہ اختیار کیا لیکن اسے جلد ہی ترک کر کے شاعری کو زندگی گزارنے کا ذریعہ بنا لیا۔ ان کے شعری مزاج کی پرورش آسی الدنی، رشید احمد صدیقی اور جگر مرادآبادی جیسی ذی اثر شخصیات کے زیرِ سایہ ہوئی۔ لاکھ مخالفت اور سنگِ طعنہ سہنے کے باوجود مجروح نے غزل کا دامن نہیں چھوڑا۔ حقیقت بیانی کے سبب ان پر بہتان لگا اور ڈیڑھ سال کے لیے جیل کی صعوبت برداشت کرنی پڑی۔

دیگر سخنوروں کی طرح مجروح نے بھی ابتدائی دور میں عشقیہ شاعری کی، چونکہ عشق حقیقی ہو یا مجازی ازل سے ہی انسانی جبلّت میں داخل ہے۔ عشق ایک ایسا موضوع ہے، جسے بیان کرنے کے لیے مطالعہ، مشاہدہ یا خود عشق کرنا ضروری نہیں۔ یہ ایک جذبہ ہے، جو عمر کے مطابق انسان اسے خود بخود محسوس کرنے لگتا ہے۔ اسی عشق کے بیان نے اسرار الحسن خاں کو مجروح بنا دیا۔ انھوں نے روایتی کلاسیکی رنگ سے معمور تشبیہ اور استعارہ سے مزین شاعری کی۔ پھر رفتہ رفتہ اس میں تغیر و تبدل پیدا ہوتا گیا اور کلام میں تہذیب و شائستگی، تہداری اور طرحداری کا رنگ نظر آنے لگا۔ یہ وہ رنگ تھا، جو ان دنوں مہذب اساتذہ کا تھا اور مجروح کی غزلوں میں بھی وہ رنگ دیکھا جا سکتا ہے۔ ذیل میں موصوف کے عاشقانہ جذبات کے متعلق چند اشعار درج کیے جا رہے ہیں جو توجہ کے مستحق ہیں۔ مثلاً

اس نظر کے اٹھنے میں، اس نظر کے جھکنے میں
نغمۂ سحر بھی ہے، آہِ صبح گاہی بھی

یاد کر وہ دن جس دن تیری سخت گیری پر
اشک بن کے اٹھی تھی میری بے گناہی بھی

کبھی تو یوں بھی امنڈتے سرشکِ غم مجروح
کہ میرے زخمِ تمنا کے داغ دھو دیتے

غزل کے ان اشعار میں مجروح نے اشارہ کنایہ سے کام لیتے ہوئے مہذب اسلوب و زبان استعمال کی ہے۔ کہیں بھی عریانیت جھانکتی نظر نہیں آتی۔

مجروح کی جس شاعری میں سیاسی اشارے، انقلابی آہنگ اور سماجی نظریہ پایا جاتا ہے، وہ ان کی شاعری کا عظیم کارنامہ ہے۔ اس پُر پیچ کارنامہ کو انجام دینے کے لیے انھیں دشوار امتحان سے گزرنا پڑا۔ حالانکہ ایسا بھی نہیں تھا کہ شاعری میں سیاسی پہلوؤں کو برتا نہیں گیا۔ کسی نہ کسی شکل میں اس کا پرتو شاعری میں ضرور رہا ہے لیکن غزلیہ شاعری میں ایسے مضامین کم داخل ہو پائے تھے۔ علامہ اقبال اور اقبال سہیل کے علاوہ دیگر شعرا کے کلام میں سیاسی مضامین مل جاتے ہیں مگر غزلیہ شاعری میں بہت کم مل سکیں گے۔

مجروح کی سیاسی، انقلابی اور معاشرتی شاعری میں بہت شور و غل نہیں ہے، بلکہ ایک طرح کی سکون اور اطمینان بخش گفتگو ہے۔ وہ مثبت خیالات کے حامل نظر آتے ہیں اور تر و تازہ عزم مصمم رکھتے ہیں۔ تھوڑی سی امید کی کرن پر بھی مطمئن رہتے ہیں۔ یہی وہ خصوصیات ہیں، جو موصوف کو اپنے ہم عصر شعرا سے منفرد کرتی ہیں۔ ایک خوبی ان کے کلام کی نغمگی بھی

> مجروح کی غزل کے ہر شعر کا ایک خاص مقصد ہوتا ہے۔ جس میں معنی کا دریا پنہاں ہوتا ہے۔ یہ خوبی موصوف کو اردو کے چند بڑے غزل گو شعرا کی قطار میں لا کھڑا کرتی ہے۔ اردو ادب کی تاریخ میں شاعروں کا ایک ہجوم نظر آتا ہے، لیکن ایسے شاعر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں جن کے متعدد اشعار ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔

ہے۔ جس سے ایسی کیفیت طاری ہوتی ہے کہ دامنِ دل کھنچتا ہے۔ یہ شعری نغمگی ان کے کلام کی عظمت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی غزلوں میں عمدہ اور خاص قسم کا توازن ہے، جو شاعر کی غزلوں کا معیار بلند کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ قاری کو کیف بخشتا ہے۔ مجروح کے کچھ ایسے اشعار دیکھتے چلیں جو شاعر کی انفرادی حیات سے تعلق رکھتے ہیں اور کچھ ان کی بے باکی و جرأت کا ثبوت دیتے ہیں۔ مثلاً:

رفتہ رفتہ منقلب ہوتی گئی رسمِ چمن
دھیرے دھیرے نغمۂ دل بھی فغاں بنتا گیا
حیات لغزشِ پیہم کا نام ہے ساقی
لبوں سے جام لگا بھی سکوں خدا جانے
میرے ہی سنگ و خشت سے تعمیر بام و در
میرے ہی گھر کو شہر میں شامل کہا نہ جائے
ہم کو جنوں کیا سکھلاتے ہو، ہم تھے پریشاں تم سے زیادہ
چاک کیے ہیں ہم نے عزیزو، چار گریباں تم سے زیادہ

مجروح کے کلام کا اسلوب سلیس ہے مگر اس سلیس اسلوب کی عبارت بہ آسانی حل نہیں ہوتی۔ ان کی غزل کے ہر شعر کا ایک خاص مقصد ہوتا ہے۔ جس میں معنی کا دریا پنہاں ہوتا ہے۔ یہ خوبی موصوف کو اردو کے چند بڑے غزل گو شعرا کی قطار میں لا کھڑا کرتی ہے۔ اردو ادب کی تاریخ میں شاعروں کا ایک ہجوم نظر آتا ہے، لیکن ایسے شاعر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں جن کے متعدد اشعار ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ اگر کسی شعر کو ضرب المثل کا درجہ مل جائے اور وہ شعر لازوال ہو تو یہ اس شاعر کی عظیم شاعری ہونے کا پختہ ثبوت ہے اور یہ اس کی پوری زندگی کا گراں بہا سرمایہ ہے اور بلا شبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مجروح کے کئی شعروں کو یہ اعزاز نصیب ہوا اور ان میں ضرب المثل بننے کی صلاحیت موجود تھی۔ مجروح کا ایک لافانی شعر یہ ہے۔

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

مجروح کا یہ شعر بہت وسیع پیمانے پر مقبول ہوا۔ ہر خاص و عام کی زبان پر تھا اور آج بھی حافظہ میں محفوظ ہے۔ جب بھی کسی ادبی و معیاری مشاعروں اور جلسوں میں کسی کو حوصلہ دیتے ہوئے نصیحت کرنی ہوتی ہے تو مجروح کا یہ شعر بے ساختہ زبان پر دوڑا چلا آتا ہے۔ یہ شعر اپنی فصاحت و بلاغت اور عزم و جرأت کا لوہا منوا چکا تھا۔ شاعری کے باذوق قاری اپنی گفتگو کے دوران اس شعر کی مثال دینے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ اسی قبیل کے چند اشعار غور طلب ہیں۔

جو دیکھتے مری نظروں پہ بندشوں کے ستم
تو یہ نظارے مری بے بسی پہ رو دیتے
دیکھ زنداں سے پرے رنگِ چمن جوشِ بہار
رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ
ہم ہیں متاعِ کوچہ و بازار کی طرح
اٹھتی ہے ہر نگاہ خریدار کی طرح

مجروح پستی کی حالت میں رہ کر پستی پر ماتم کرنے کے قائل نہیں ہیں، بلکہ وہ پستی میں رہتے ہوئے بلندی پر پہنچنے کے لیے جست لگاتے ہیں۔ ان کی شاعری حوصلہ خیز ہے جو استحصال زدہ طبقہ کی ہمت افزائی کرتی ہے اور انھیں ناجائز ظلم و جبر سے نجات دلاتی ہے۔

نظروں پر پابندی اور بے بسی پر نظاروں کی اشک فشانی سے معلوم ہوتا ہے کہ مجروح کی طبیعت بہت حساس تھی۔ وہ عمیق اور باریک نظر رکھتے تھے۔ انھوں نے انسان کو فطرت سے سبق حاصل کرنے کا پیغام اس طرح دیا ہے کہ اگر رقص کرنا ہے تو بہار کا جوش دیکھنا چاہیے، کیونکہ انسان کے جنونی عمل سے ہر رکاوٹ دور ہو جاتی ہے۔ مجروح پستی کی حالت میں رہ کر پستی پر ماتم کرنے کے قائل نہیں ہیں، بلکہ وہ پستی میں رہتے ہوئے بلندی پر پہنچنے کے لیے جست لگاتے ہیں۔ ان کی شاعری حوصلہ خیز ہے جو استحصال زدہ طبقہ کی ہمت افزائی کرتی ہے اور انھیں ناجائز ظلم و جبر سے نجات دلاتی ہے۔ جیسا کہ ہم نے میر و غالب جیسے عظیم شعرا کے دواوین کی سیر کی ہے۔ ان کے ساتھ ساتھ بیشتر سخنوروں نے اپنے تخلیقی فن پارے پر فخر کا اظہار کیا ہے اور اپنی شعری استعداد و صلاحیت کی داد چاہی ہے۔ مثلاً میر نے کہا۔

جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز
تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

پھر غالب نے کہا۔

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

ٹھیک اسی طرح مجروح نے بھی اپنے کلام پر فخر و ناز کا مظاہرہ کیا ہے۔ اپنی کم سخنی کے متعلق اور اپنے کلام پر نکتہ چینی کرنے والوں کے متعلق نادر اشعار رقم کیے ہیں۔ مثلاً۔

دہر میں مجروح کوئی جاوداں مضموں کہاں
میں جسے چھوتا گیا وہ جاوداں بنتا گیا
نوا ہے جاوداں مجروح جس میں روحِ ساعت ہو
کہا کس نے مرا نغمہ زمانے کے چلن تک ہے
تجھے نہ مانے کوئی تجھ کو اس سے کیا مجروح
چل اپنی راہ بھٹکنے دے نکتہ چینوں کو
ملے جو وقت نوا سنجیِ ہزاراں سے
ادھر بھی دیکھ تماشا ہے میری کم سخنی

یہ سچ ہے کہ مجروح نے جس مضمون کو ہاتھ لگایا، اسے دوام عطا کیا اور ان کی کم سخنی ہی تاریخِ ادب اردو کا اہم باب بن گئی۔

حوالہ جات

1 گلکاریِ وحشت کا شاعر مجروح، مرتبہ: خلیق انجم، مضمون مشمولہ، مجروح سلطانپوری: ایک تاثر، انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی، 2000

2 مجروح فہمی، تحقیق، ترتیب و مقدمہ: آصف اعظمی، مضمون مشمولہ: مجروح کی غزل میں پیکر تراشی، مجلس فخرِ بحرین برائے فروغِ اردو، بحرین 2019

3 کلیاتِ مجروح سلطانپوری، مرتب: تاج سعید۔ از گفتنی ناگفتنی، الحمد پبلی کیشنز، 2003

4 بحوالہ، تہذیبِ غزل کا شاعر مجروح سلطانپوری، ترتیب: ڈاکٹر زیبا محمود۔ مضمون مشمولہ، مجروح کی غزل گوئی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2012

■

Dr. Mohammad Danish
Bal Govind Patel Smarak P.G College
Sultanpur Khas Mau Aima
Prayagraj -212507 (UP)
Mob.: 9794530403
da051217@gmail.com

مظفر حنفی کی غزلیہ شاعری

محمد وسیم رضا

1970 کے بعد جن فن کاروں نے غزل کے حوالے سے اپنی پہچان بنائی اور اپنے لب ولہجہ میں گرد و پیش کے حالات سے اپنی بے اطمینانی کا احساس دِلایا، اُن میں ایک اہم اور نمایاں نام مظفر حنفی کا ہے۔ اُن کی تخلیقی ہنرمندی یہ ہے کہ انھوں نے اردو غزل کی روایت کی پاس داری تو کی لیکن محض روایتی علائم ولفظیات پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس میں وسعت پیدا کی جس کا ثمرہ یہ ہے کہ ان کے کلام میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو ایک اچھے شاعر کے یہاں ہونی چاہئیں۔ مظفر حنفی کے یہاں قدیم وجدید کا امتزاج اور آمیزش ان کے داخلی آہنگ سے پوری طرح میل کھاتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ آیئے! اب مظفر حنفی کی غزلیہ شاعری کے فکری وفنی اختصاص پر گفتگو کی جائے۔

یوں تو مظفر حنفی کے شعری مجموعوں کی تعداد نصف درجن سے زیادہ ہے۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ 1967 میں 'پانی کی زبان' کے عنوان سے شائع ہوا۔ یہی زمانہ جدیدیت کے رجحان کے شباب کا عہد ہے۔ اس مجموعے کی اشاعت نے مظفر حنفی کو جدید شعرا میں اہم مقام دِلانے میں کلیدی رول ادا کیا ہے۔ جدید غزل چونکہ نئے ذہن کی کیفیات و احساسات کی پیداوار ہے۔ جدید غزل نے پرانی لفظیات کی تکرار اور گھسے پٹے مفہوم کو یکسر خارج کرتے ہوئے، اس کی جگہ پر نئے نئے الفاظ اور علامتوں کا استعمال کیا جو ایک نئی فکر اور نئے مفہوم کے ساتھ ہمارے سامنے اُبھری۔ مظفر حنفی اس معاملے میں پیش پیش رہے۔ ان کے کئی شعری مجموعے تواتر کے ساتھ شائع ہوئے جنھیں جدیدیت کی شناخت قرار دیا گیا۔ مثلاً شعری مجموعہ تیکھی غزلیں، صریر خامہ،..........وآگ، 'دیم بہ دیم، طلسم حرف، کھل جا سم سم، پردہ سخن کا، یا اخی، پرچم گرد بار، ہات اوپر ہے، آگ مصروف ہے وغیرہ کی غزلیں ہمارے اس دعوے کی تائید کرتی ہیں۔ مظفر حنفی کی انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے اپنی شعری لفظیات، اپنے شعری برتاؤ، لہجے میں بے نیازی، طنزیہ لہجے سے معمور اشعار میں جدید علائم اور اچھوتی تراکیب کی ایک دنیا بسائی ہے جس میں نئے نئے مفاہیم پیدا کیے گئے ہیں۔ اپنی باتوں کو تقویت بخشنے کے لیے چند اشعار پر اکتفا کرتا ہوں۔

مظفر خود اپنی راہ نکالنے کی دُھن میں ہے
اگرچہ خود علم ہے اُسے ندی کی دھار کا

اپنے اشعار کے لہجے سے مظفر صاحب
بھیڑ میں دور سے پہچان لیے جاتے ہیں

اشعار مظفر کے پامال زمینوں میں
دو ہاتھ پرے ہٹ کر فرسودہ خیالوں سے

شاہراہوں پہ تو مجموع مظفر صاحب
شعر کہنے کے کئی اور بھی رستے ہوں گے

ان اشعار میں صاف گوئی بھی ہے اور بے باکی بھی اور یہ اشعار اُن کے شاعرانہ موقف اور تنقیدی نظریات کی عمدہ ترجمانی بھی کرتے ہیں۔ انھوں نے فرسودہ خیال اور فرسودہ انداز بیان سے اپنے آپ کو الگ کیا ہے اور اپنے نجی لہجے اور اسلوب کی تشکیل کی ہے۔

مظفر حنفی کی شاعری میں وہ تمام بنیادی خصوصیات موجود ہیں جو ایک فن کار کو بلند مقام عطا کرتی ہیں۔ ان کی غزلیہ شاعری میں تغزل کا رنگ بھی ہے اور محاکات آفرینی کی بوقلمونی بھی۔ عشق ومحبت کی کیفیات وواردات بھی ہیں اور معاصر زندگی کے کرب کا اظہار بھی۔ ان کے یہاں اخلاقی قدروں کی پامالی، رشتوں کا انہدام، سیاست کی شعبدہ بازی، اپنوں کی منافقت، کرب آگہی جیسے موضوعات کثرت سے مل جائیں گے۔ یہاں بھی انھوں نے اپنی انفرادیت قائم رکھی ہے۔

غم کھا کر مسکرانا ان کی فطرت میں شامل ہے بلکہ درد وغم کو وہ اپنی میراث سمجھتے ہیں اور اسے پی جانے میں انھیں عافیت کا احساس ہوتا ہے۔ دیکھیے یہ اشعار

تلخیاں تو مظفر کی میراث ہے
شعر میں آنسوؤں کو چھپاتا ہے وہ

ہزاروں مشکلیں ہیں دوستوں سے دور رہنے میں
مگر اک فائدہ ہے پیٹھ پر خنجر نہیں لگتا

جب وفا ہی نہ کی مظفر سے
غم کا ناطہ بھی توڑتے جاؤ

ماحول میں زہر گھل چکا ہے
اب خون کثیف کردیا جائے

نہ جانے کیوں مرا گھر جل رہا ہے اور وہ خوش ہیں
یہی ہمسائے کل تک مجھ سے بے حد پیار کرتے تھے

اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مظفر حنفی کی شاعری میں نہ صرف موضوعات کا تنوع ہے بلکہ زندگی اور سماجی حقیقت نگاری کی سچی تصویر بھی پیش کی گئی ہے۔ اُن کی نظر اپنے چاروں طرف پھیلے سماج کی فکر اور انتظام کے لیے کوشاں رہتی ہے۔ ان کا قلم معاشرہ کی سچی تصویر پیش کرنے سے نہیں چوکتا۔ نئے موضوع، طنزیہ لہجہ اور

حوصلہ مندانہ طرز بیان ان کی شاعری کو انفرادیت بخشتی ہے۔ اُن کے یہاں رجائیت کا عنصر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ دیکھیے یہ اشعار

کھیتوں کھیتوں بھوک اُگی ہے، دریا دریا پیاس کا عالم
رستے رستے پیڑ کھڑے ہیں سائے کو دامن پھیلائے

ظاہر ہے جسم و جاں کی خسارہ قریب ہے
ایک بلبلہ رواں ہے کنارہ قریب ہے
مجھے دربدری میں لطف آتا ہے
مری بلا سے فراہم نہ کر در و دیوار

عشق اور معاملاتِ عشق اردو شاعری کا خمیر ہے۔ تقریباً تمام شعرا نے عشق کے موضوع پر طبع آزمائیاں کی ہیں، نام گنانے کی ضرورت نہیں۔ مظفر حنفی نے گرچہ عشقیہ اشعار اپنی غزلوں میں پیش کیے ہیں لیکن فرسودہ خیال اور فرسودہ زبان اور اندازِ بیان سے اپنے آپ کو الگ رکھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ عشقیہ روایات سے ناآشنا ہیں۔ معاملاتِ عشق میں ان کی غزلوں میں لہجے کی شوخی بھی ہے اور بے ساختگی اور بے باکی بھی۔ اندازِ گفتگو میں بے تکلفی بھی ہے اور احساس میں گرمی بھی۔ ان کے عشقیہ اشعار میں روایت اور جدت کا خوب صورت امتزاج ہے۔ دیکھیے یہ اشعار

کچھ ایسے انداز سے جھٹکا اس نے بالوں کو
میری آنکھوں میں در آیا پورا بجلی بن
پھینکا گیا ہے پھول جہاں سے رقیب پر
تشویش ہے وہ تیرا دریچہ نہ ہو کہیں
وہ پاس آ کے مہکتی ہے کس قدر یارو
وہ دور سے نظر آتی ہے دل ربا کتنی

ان کے عشقیہ اشعار میں لہجے کی انفرادیت بھی ہے اور فکر کی ندرت بھی۔ حسن و عشق کی کیفیات، پیکرِ حسن کی تعریف، ہجر و وصال کی باتوں اور زلف و رخسار کے تذکروں کے علاوہ مظفر حنفی کی غزلیہ شاعری کی ایک اہم شق ان کی طنزیہ شاعری ہے۔

مظفر حنفی کی غزلوں میں جو طنزیہ اسلوب ہے، اس میں جدید لہجے کی آمیزش، سونے پر سہاگا کا کام انجام دیتی ہے۔ مظفر حنفی نے معاشرتی زندگی کے انتشار، اخلاقی قدروں کی پامالی، سیاست کے مکر و فریب، فرقہ پرستی اور اقتدار کی ہوس کا مشاہدہ بہت ہی قریب سے کیا ہے۔ لہٰذا انھوں نے طنزیہ اسلوب میں کہہ کر معاشرے کے بدصورت اور کریہہ چہرے کو آشکار کیا ہے۔ اپنی

مظفر حنفی کی غزلوں میں جو طنزیہ اسلوب ہے، اس میں جدید لہجے کی آمیزش، سونے پر سہاگا کا کام انجام دیتی ہے۔ مظفر حنفی نے معاشرتی زندگی کے انتشار، اخلاقی قدروں کی پامالی، سیاست کے مکر و فریب، فرقہ پرستی اور اقتدار کی ہوس کا مشاہدہ بہت ہی قریب سے کیا ہے۔ لہٰذا انھوں نے طنزیہ اسلوب میں کہہ کر معاشرے کے بدصورت اور کریہہ چہرے کو آشکار کیا ہے۔

باتوں کو تقویت بخشنے کے لیے کچھ ایسے اشعار پیش کرنے پر اکتفا کروں گا جن میں انھوں نے اپنے مزاج سے مطابقت رکھنے والے الفاظ اعتدال و توازن، مناسبت، برجستگی و بے باکی کے ساتھ برتا ہے۔ دیکھیے یہ اشعار

یہ کام اہلِ سیاست نے لاجواب کیا
خفا کسی سے ہیں، جینا میرا عذاب کیا
دیکھو مٹی کو لہو سے نہ کرو آلودہ
ورنہ اس سال بھی برسات نہیں ہونے کی
جا کر بلندیوں پر وہ طنز کر رہے ہیں
ہم لوگ جن کے خاطر زینہ بنے ہوئے تھے
تم اپنے سر تو سہرا میرے سر الزام رکھتے ہو
کہاں کے رہنے والے ہو میاں کیا نام رکھتے ہو
یوں تو جس کو آپ فرمادیں وہی ہے بے گناہ
ورنہ اک معیار جس کا ہاتھ جتنا سرخ ہے

مذکورہ بالا اشعار زہر میں بجھے ہوئے تیر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اپنے طنز کے فن پر رگڑ کر جس طرح الفاظ کو نکیلا اور تیکھا بنایا ہے، ان کی فنی اجتہادات پر دلالت کرتے ہیں۔ بقول پروفیسر وہاب اشرفی:

’’طنز نگاری مظفر حنفی کا عمومی مزاج ہے۔ مظفر حنفی کو شاد عارفی سے تلمذ تھا اور موصوف کتنے بے باک اور خطرناک تھے.... مظفر حنفی کی تنقید نگاری محض تقلیدی نہیں ہے۔ شاد عارفی کے یہاں تو ایک قسم کا کھردراپن، نکتہ چینی کا تیور اور لڑائی بھڑائی کی کیفیت ہے لیکن مظفر حنفی لب و لہجہ کی متانت، انتہائی سنگین موقع پر بھی نہیں کھوتے۔ اس لیے ان کے طنز پر غصہ نہیں آتا۔‘‘

(بحوالہ تاریخ ادب اردو، جلد سوم، وہاب اشرفی)

ڈاکٹر انور سدید مظفر حنفی کی غزلوں میں طنزیہ و مزاحیہ عناصر پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’اردو میں طنز و ظرافت کی جو مثال شاد عارفی نے قائم کی تھی اور جس کے بارے میں خیال تھا کہ شاد عارفی اس اندازِ فکر کے شاعرِ آخر الزماں ہوں گے۔ اس کا ایک روشن زاویہ مظفر حنفی کی صورت میں اُبھرا ہے۔ مظفر حنفی جو شاد عارفی کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں اس لیے بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ ان کے فن میں فیضِ استاد کی تابندہ کرنیں ہیں۔‘‘

مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مظفر حنفی کی غزلیہ شاعری کا کینوس بہت وسیع ہے۔ ان کی غزلیہ شاعری عشقیہ جذبات و احساسات کا اظہار بھی ہے اور نازک خیالی، نزاکتِ احساس کا لطیف بیان بھی۔ الفاظ کے استعمال میں تصویرکاری کا ہنر جانتے ہیں۔ انھوں نے طنزیہ اسلوب کو وسعت بخشتے ہوئے اس کے دائرے کو کافی وسیع کر دیا ہے۔ انھوں نے روایت سے اپنا رشتہ ہمیشہ استوار رکھا لیکن اپنی انفرادیت قائم رکھنے کے لیے صالح اور جاندار روایت کو اپنی شاعری میں جگہ تو دی لیکن فرسودہ روایات سے اپنا رشتہ توڑتے ہوئے نئی روایتوں کی تخلیق کی۔ انھوں نے اپنا لہجہ اور اسلوب تشکیل کیا۔ ان کی شاعری میں فن، زبان اور قواعد کا شعور پختہ ہے، ابلاغ کی ترسیل کا مسئلہ نہیں ہے۔ انھوں نے اپنی غزلوں کو سادہ، دل نشیں، سلیس اور تکلفات سے عاری زبان میں پیش کیا ہے۔ بات دل سے نکلتی ہے اور دل میں اترتی چلی جاتی ہے۔ عصری حسیت اور خود آگہی کے موتی الفاظ کے وسیلے سے اس طرح اُجاگر کیے گئے ہیں کہ ہر لفظ مفہوم و معنی کے اعتبار سے اثر انگیز ہو جاتا ہے۔ نئے نئے الفاظ، اختراعی عمل، نئی نئی تراکیبوں سے قاری کو جھنجھوڑنے کا ہنر کوئی اُن سے سیکھے۔

■

Dr. Md. Wasim Reza
Head, Deptt. of Urdu
Rameshwar College
Muzaffarpur-842001
Mob.: 9955545128,
Email: drwasimreza@gmail.com

ابوالليث جاويد کے افسانوں کے امتیازات

آصف سلیم

معاصر افسانوی منظرنامے میں ابواللیث جاوید منفرد اور جداگانہ طرز تحریر کی بدولت ایک الگ شناخت رکھتے ہیں۔ 1970 کے قریب اردو کے افسانوی افق پر جو معتبر نام ابھرے ان میں سرزمین بہار کا اہم رول ہے کہ یہاں حسین الحق، شفق، عبدالصمد، شموئل احمد اور شوکت حیات وغیرہ کے ساتھ ابواللیث جاوید کی آمد سے اردو افسانے میں ایک نئی روش کا آغاز ہوا۔

2018 کے اوائل سے قبل ابواللیث جاوید کو میں شخصی اعتبار سے نہیں جانتا تھا مگر ایک موقع سے ملاقات کی جب گھڑی آئی تو میں ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کے دو اسباب تھے۔ ایک تو یہ کہ اپنی وضع قطع کے اعتبار سے جہاں وہ صوفی منش دکھائی دیے وہیں دوسری جانب عصرِ حاضر میں دم توڑتی ہوئی اخلاقی قدروں کے ضامن بھی۔ اس کا ثبوت انھوں نے یہ پیش کیا کہ میرے سلسلے میں ایک موقر رسالہ میں شائع ہوئے میرے ایک مضمون کے حوالے سے مجھ سے متعلق اپنے ایک رشتۂ پارینہ کی دریافت کی اور عرصۂ دراز سے گم شدہ ایک خاندانی رشتے کو آباد کر دیا۔ میری نظر میں ان کا یہ عمل گہری اخلاقی جرأت کا مظہر تھا جو عہدِ حاضر میں سماجی اعتبار سے ایک بڑے تناسب میں زوال آمادہ ہے۔ ایسے بحرانی حالات میں ابواللیث جاوید اپنی شخصیت اور اپنے فن کے لحاظ سے اس لیے غنیمت معلوم ہوتے ہیں کہ ان کے یہاں کسی قسم کے تصنع یا تکلف کا گزر نہیں ہے۔ ان کے یہاں کلیدی حیثیت سے اگر کچھ ہے تو وہ ان کا مذہب اور ان کی انسانی محبت ہے جو ان کے اخلاق مندانہ رویوں میں ڈھل کر اپنی صحتمند معنویت کے ساتھ ان کے افسانوں میں جا بجا جلوہ گر ہے۔

یوں تو ماقبل میں وقفے وقفے سے ان کے تین افسانوی مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں مگر اتفاق ہے کہ میں ان سے محض اطلاع بھر ہی آشنا ہوں جب کہ بعد میں یعنی 2017 میں 'اب صبح نہیں ہوگی' کے نام سے مزید ایک افسانوی مجموعہ اشاعت پذیر ہوا۔ چودہ افسانوں پر مشتمل اس مجموعہ کے پیش لفظ میں مصنفین کے مسائل پر ابواللیث جاوید نے تخلیقی کاروبار شوق کے تعلق سے کئی توجہ طلب نکات اجاگر کیے ہیں تو حقانی القاسمی نے 'ارتعاشی افسانے' کا عنوان دے کر افسانہ نگار کی شخصی صفات کے علاوہ ان کے افسانوی مزاج و اطوار کا بخوبی احاطہ کیا ہے۔ کتاب کے آخر میں 'سچی باتیں' کا عنوان قائم کر کے چند مشاہیر ادب کے فن و شخصیت سے متعلق گرانقدر آرا یکجا کی گئی ہیں۔ کتاب میں شامل مختصر خوبصورت سی ایک نظم 'تتلی' کی تلاش و جستجو کے واسطے سے کسی قدر قابلِ ذکر ہے۔

جہاں تک ابواللیث جاوید کے افسانوں کا سوال ہے تو وہ ان کے منتخب کردہ ایسے موضوعات و مشاہدات پر مبنی ہیں جو اپنے سماج و اطراف سے گہری وابستگی کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوئے ہیں۔ چنانچہ ان کے یہاں موضوعات کی سطح پر بڑی وسعت ہے۔ اپنے پسندیدہ موضوعات کے ذیل میں انسان انسان کے مابین اخلاق مندی اور وطنی اعتبار سے مذہبی رواداری کے علاوہ اپنی زمین سے جذباتی وابستگی، سطح در سطح پھیلی بدعنوانی، حرص و ہوس کی عملداری، دینیات سے ناآشنائی، جہیز پسند عالمِ سودائی، رہِ ظلمات کی اسیری، امتیازاتِ مشرق و مغرب سے آشنائی، نسلی ہنگامہ خیزیوں سے الفت و محبت کی برآمدگی اور ہم جنس پرستی کے لعنتی و ملامتی چلن کے علاوہ جنگل کی دنیا کی سبق آموز سیر گاہی کا بطور خاص التزام دکھائی دیتا ہے۔

ابواللیث جاوید کے افسانوں سے ان کے انتساب کا جہاں ایک بلا واسطہ تعلق دکھائی دیتا ہے جو خدائے بزرگ و برتر کے نام معنون ہے وہیں ان کے عملِ صالح کے تحت سورہ البقرۃ کا اردو ترجمہ خدا، آدم اور ملائکہ کے حوالے سے تحریر کیا جانا ان کی صوفیانہ صفات کو بخوبی اجاگر کرتا ہے اور یہی سبب ہے کہ ان کے تقریباً تمام افسانوں میں موضوعات کے ساتھ ساتھ کردار و واقعات کی سطح پر بھی مذہبی و اخلاقی قدریں سایہ فگن دکھائی دیتی ہیں۔ چنانچہ وہ صورتحال کو سامنے تو لاتے ہیں، اس کے ساتھ ہی مذہبی احکام کو پیش کرنا بھی اپنے فرائضِ منصبی میں شمار کرتے ہیں۔ افسانہ 'عالم پناہ'، 'نصیب دشمناں' اور 'میری بھی ایک بات' میں موضوعات کی سطح پر مماثلت ضرور ہے مگر افسانہ نگار کے طرزِ اسلوب نے انھیں گہری توجہ کے ساتھ پڑھے جانے کے قابل بنا دیا ہے۔ اس کے علاوہ متذکرہ افسانوں میں ایک نکتۂ خاص کا اشتراک یہ ہے کہ مذہبی اقدار سے لاتعلقی کے سبب بالخصوص مسلمان حد درجہ عذاب میں مبتلا ہیں ورنہ گھریلو اعتبار سے آسودہ افسانہ 'عالم پناہ' کے بدر عالم کی حرصِ دولت میں ملازمت سے معطلی کے بعد حضرتِ بختیار کاکی کے آستانے پر گردشِ حالات سے نجات کے ہمراہ خوشنودیٔ خداوندی کی آرزومندی میں رسائی یقینی نہ بنتی۔ افسانہ 'نصیب دشمناں' میں بچے کو دین سے غافل رکھنے اور محض دنیاوی تعلیم سے آراستہ کرنے کے بھیانک نتائج ایک شخص کے سامنے یوں آتے ہیں کہ اس کا بیٹا جلال نہ صرف یہ کہ ایک غیر مسلم لڑکی سے ازدواجی طور پر وابستہ ہو جاتا ہے بلکہ وہ ملک کے باہر خود ڈاکٹر جے لال بن جاتا ہے اور بیٹے کا نام اسکول میں کمل لال درج کراتا ہے۔ 'میری بھی ایک بات' میں محض نام کے ایک قاضی کے حوالے سے اس کے بالکل برعکس کردار و اطوار والے عصرِ حاضر کے جہیز کے ایک سودائی سے ہماری آشنائی ہوتی ہے جس کے مطالبات میں لڑکی کی تصویر، ماروتی کار اور زیورات بھی شامل ہیں۔ اس افسانہ میں افسانہ نگار نے جہیز کے سلسلے میں جہاں سماج کے ایک غیر مذہبی رویے کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے وہیں ایک صدائے احتجاج بھی بلند کی ہے۔ افسانہ کے آخر کے صرف دو جملے بطور مثال پیش کیے جاتے ہیں:

''میں تیزی سے باہر نکلا اور تیز تیز ڈگ بھرتا ہوا ان کے گیٹ کے باہر آ گیا۔ وہ مجھے بلاتے رہے مگر میں

نے پیچھے مڑکر دیکھنا گوارہ بھی نہیں کیا۔'' (ص 133)

'اب صبح نہیں ہوگی' کے افسانوں کی ترتیب میں پہلا افسانہ 'چراغ کی لَو' ہے جسے فرقہ وارانہ خیرسگالی کے ایک عمدہ ماڈل کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ بالخصوص عصرِ حاضر میں بابری مسجد کے تعلق سے مذہبی منافرت پھیلانے اور دلوں میں شگاف ڈالنے جیسے بدترین عمل کو انگریزوں کی پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو جیسی پالیسی سے وابستہ کرتے ہوئے افسانہ کا اختتام گاؤں کے دونوں ہندو مسلم فریقین کی دلی رضامندی پر کیا گیا ہے جہاں فرنگی جج کے مندر کے حق میں فیصلہ سنادیئے جانے کے باوجود وہاں کے باسیوں نے اس سے اتفاق نہ کرتے ہوئے فیصلے کی کاپی عدالت کے سامنے جلادی تھی اور الفت ومحبت کا عملی ثبوت پیش کیا تھا۔

افسانہ نگار کا اسی طرز کا ایک افسانہ 'احساس' بھی ہے۔ اس افسانہ میں زلزلے کا ایک سماں ہمارے ملاحظے میں آتا ہے جہاں چہار جانب سے چیخ وپکار کی صدائیں بلند ہورہی ہیں۔ ایسے بحرانی حالات میں بلا تفریق مذہب وملت کارِ خیر کی روش کو عام کرنے کی ایک صحتمند راہ ہمارے لیے وضع کرنے کی کوشش کی گئی ہے جہاں ایک دوسرے مذہب کا ریٹائرڈ جوان مندر میں بیٹھے بھگوان پر چڑھاوے کے زیورات کی حفاظت کے لیے خود کو مامور کرلیتا ہے جب کہ اصلاً وہاں مامور پروہت دکھیا زلزلے کے خوف سے فرار رہتے ہیں اور مصیبت کے ٹل جانے کے بعد نمودار ہوتے ہیں۔

افسانہ نگار نے اپنے سماج ومعاشرے پر توجہ مبذول کرتے ہوئے دو افسانے بعنوان 'زبان یارمن ترکی' اور 'اڑان' تحریر کیے ہیں۔ اول الذکر افسانہ میں دراصل اپنے معاشرہ و وطن سے بھٹکے ہوئے ایک ایسے خاندان کی شکست خوردگی کی داستان رقم کی گئی ہے جو مدت طویل تک کناڈا میں بودوباش اختیار کرنے کے بعد اپنے مقام پر واپس لوٹتا ہے اور اپنی خالص مغربی مزاج واطوار والی بیٹی کے لیے اپنے پڑوس کے انجینئر نوجوان کو بیرونِ ملک کی آسودگی کا خواب دکھا کر اس سے منسوب ہونے کا آرزومند ہوتا ہے مگر یہاں افسانہ نگار نے اس نوجوان کے توسط سے انھیں انکار کی راہ دکھائی ہے اور یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ ہزار تنگ دامانیوں کے باوجود ہماری زبان، ہماری تہذیب اور ہمارا اسلامی معاشرہ بہرحال مقدم ہے اور اس سے کسی طرز کا سمجھوتہ محال ہے۔

افسانہ 'اڑان' میں بیرونِ ملک کے تعلق سے ایک بالکل متضاد کیفیت پیش کی گئی ہے جہاں پیداواری رشتوں کو تیاگ کر دور دیس سے دل لگانے کا ایک الگ ہی قصہ بیاں ہوتا ہے۔ یہ افسانہ بڑے شہر میں کام کرنے والی ایک ملازمہ کے حوالے سے تحریر کیا گیا ہے۔ یہاں مرکزی کردار سلمٰی کا ہے جو ایک بن بیاہی لڑکی ہے۔ اس کے عزائم بلند ہیں کہ جہاں وہ اپنی ماں اور بہنوں کی کفالت کرتی ہے وہیں بہنوں کی شادیوں کے ارادے بھی اسے دامن گیر رہتے ہیں۔ فکری اعتبار سے اس افسانے کا عجیب موڑ یہ ہے کہ وہ لڑکی اپنے اہلِ خانہ کو بے دست وپا چھوڑ کر صدیقی انکل کے چھوٹے انجینئر بیٹے جنھیں وہ سلمان خان سے مشابہ مانتی تھی، ان کے ساتھ فرار ہوجاتی ہے۔ اس افسانہ میں افسانہ نگار نے اپنا یہ مشاہدہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہمارے سماج میں سطح افلاس پر گزر بسر کرنے والوں کے بالعموم کوئی Stand نہیں ہوتے اور پلک جھپکتے عیش وآرام کی طلب میں وہ کچھ بھی کرگزرنے سے کبھی نہیں چوکتے۔

افسانہ 'اڑان' میں بیرونِ ملک کے تعلق سے ایک بالکل متضاد کیفیت پیش کی گئی ہے جہاں پیداواری رشتوں کو تیاگ کر دور دیس سے دل لگانے کا ایک الگ ہی قصہ بیاں ہوتا ہے۔ یہ افسانہ بڑے شہر میں کام کرنے والی ایک ملازمہ کے حوالے سے تحریر کیا گیا ہے۔

'اب صبح نہیں ہوگی' کے عنوان سے تحریر کردہ افسانہ کا اسلوب نیا ہے اور وہ جدیدیت کے زیر اثر تحریر کیا گیا ہے۔ متذکرہ تحریک کا ایک مخصوص عہد تک تخلیقی سطح پر شدید غلبہ رہا جہاں اس بات سے انکار کی گنجائش بھی نہیں کہ اس عہد کے تحریر کردہ ادب میں ترسیل کی پیچیدگیوں نے قاری کو اس سے یکسر بیگانہ بنا دیا تھا۔ چنانچہ اپنی شناخت وحیات کے پیش نظر اکثر لکھنے والوں نے اپنے طرزِ تحریر میں تبدیلی پیدا کی اور صاف ستھری راہوں پر گامزن ہوگئے۔ ابواللیث جاوید کے اس افسانہ کو اسی تجربۂ شوق کی نشانی ماننے کہ تشکیلی اعتبار سے جس کی اساس علامت واستعارہ پر ٹکی تو ہے مگر معنوی اعتبار سے افسانہ یہ باور کراتا ہے کہ ہم وقتی راحت ومراعات کی طلب میں اپنے اسلاف کی راہوں سے بھٹک کر ہزار مصیبتوں میں مبتلا ہوگئے ہیں اور اب ہمارے مابین حرام وحلال کا امتیاز بھی باقی نہیں رہا۔ لہٰذا ہمیں اپنی روش بدلنے کی ضرورت ہے۔ شاید کہ نئی صبح نمودار ہوجائے۔ پورا افسانہ دورانِ مطالعہ اس لیے بھی دلچسپ معلوم ہوتا ہے کہ وہاں چرند وپرند کے استعارے ہیں اور بطور خاص نفس کو مرکزیت حاصل ہے جس کے خیالات نہایت پاکیزہ ہیں۔

افسانہ 'کیسے سمجھاؤں' کا قصہ یہ ہے کہ وہ عصر حاضر کے نہایت اہم موضوع یعنی رشوت خوری کے موضوع پر مبنی ہے۔ افسانہ گھر سے لے کر ملک گیر سطح کے متعلقہ حالات سے ہمیں باخبر کرتا ہے۔ اس افسانہ کا کردار ارجن اس طور پر بے حد اہم ہے کہ وہ بدعنوانی اور کرپشن کے مسئلے پر شہر سے گاؤں آتا ہے اور بازپرس کرتا ہے۔ متذکرہ مسئلہ کے ذیل میں شہنشاہ اکبر اور سمراٹ اشوک وغیرہ کے ادوار سے بھی مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ افسانہ کے اختتامی صفحہ پر رہنما اصول کے طور پر اپنائے جانے والے چند جملے قابل غور ہیں:

''اپنی ذہنیت کو بدلیے۔ نہ ایسی برائی خود کیجیے اور نہ کسی کو کرنے دیجیے۔ حل تو ہمارے پاس ہے۔ صرف اس پر عمل کرنا ہے۔'' (ص 47)

افسانہ 'گردش' دراصل احتجاج کا افسانہ ہے جہاں گروجی کا کردار یہ ہے کہ وہ سارے عالم کو گردش سے نجات پانے کی تدابیر بتاتے ہیں مگر خود ان کا المیہ یہ ہے کہ ان کے گھر میں تین بیٹیاں بڑی عمر کو پہنچ گئیں اور ان کا نباہ نہ ہوسکا۔ اس افسانہ میں گروجی کے خانگی حالات سے آشنا ہوکر آصف نامی کردار جو اپنے دوست اُتم کے ساتھ اپنی پریشانیوں سے نجات کی خاطر ان کے رابطے میں آیا تھا ان سے پورے طور پر متنفر ہوگیا۔

گویا ایک تلخ حقیقت کے سامنے آتے ہی بطور انسان انسانی رویے میں جو تبدیلی رونما ہوئی تھی وہ ان کی بیٹیوں کے سلسلے میں ایک طرح کا احتجاج تھی۔

'بن باس' افسانہ میں افسانہ نگار نے ایک مریضہ مسز وہائٹ کی زبانی مغربی تہذیب کے جملہ عیوب سے ہمیں روبرو ہونے کا وسیلہ عطا کیا ہے اور تقابلی اعتبار سے مشرقی کلچر کو اعلیٰ وارفع قرار دیا ہے۔ انھیں ہندوستان کے متعدد شہروں میں اپنے کلکٹر خاوند مسٹر جان وہائٹ کے ساتھ بسر کیے ہوئے ایام یاد رہتے ہیں۔ انھیں مشرقی کلچر میں عورتوں کا ستی ہوجانا اور اپنے شوہروں کو مجازی خدا تصور کرنا قیمتی عمل معلوم ہوتا ہے جب کہ ان کی نگاہ میں مغرب میں زن وشو کے مابین باہمی لاتعلقی اور غیروں کے

مابین جنسی رشتوں کی استواری کے ساتھ بڑی عمر والوں کے اولڈ ایج ہوم پہنچائے جانے کا مرحلہ ایک بڑا المیہ ہے۔ اس افسانہ میں انگریز خاتون کے ہندوستان میں قیام کے دنوں کے ملازم اکبر اور لندن کے سینٹ تھامس ہاسپٹل میں مامور ڈاکٹر اعظم کے کردار اہم ہیں۔

افسانہ 'تیج تھری' اپنے عنوان کے اعتبار سے تقریباً اپنا مدعا پیش کر دیتا ہے۔ ہم جنس پرستی کے موضوع پر افسانہ نگار کا یہ ایک ایسا افسانہ ہے جہاں کالج کے دنوں سے سریش مسیح اور سمیر خان کی ہم جنس پرستی کی داستان کا آغاز ہوتا ہے۔ اس افسانہ میں ایک کردار جاوید کا ہے جو دونوں کے تعلق سے کسی قسم کے تمسخر کا حامی نہیں ہے بلکہ وہ تو ان کے روم کی دیوار پر انھیں عریاں دکھائے جانے اور ایک حمام میں دو ننگے جیسی سرخیاں لگائے جانے کے عمل پر برطانوی اخبارات میں شائع ہونے والے تیج تھری کے مشمولات سے انھیں آگاہ کر کے کسی قدر ڈھارس کا سامان فراہم کرتا ہے۔ یہی نہیں وہ مشرقی معاشرے میں بھی اخبارات کے توسط سے ماڈلس کی عریاں تصاویر کی اشاعت کے مایوس کن احوال بھی بیان کرتا ہے۔

مگر جاوید کا قابلِ ذکر اہم کارنامہ یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے تعلق سے مذہبیات کو بطور خاص فوکس کرتا ہے۔ سمیر خان کو متنبہ کرتے ہوئے حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کا بے راہ روی کے سبب فنا کے گھاٹ اتارے جانے کا قصہ سنانے کا اس کا عمل دراصل انھیں ہم جنس پرستی جیسی لعنت سے باہر نکالنے کی مؤثر کاوش ہے مگر اس بدبختی کو کیا کہیے کہ وہ اپنے ہم جنس کے ساتھ لندن میں مقیم ہو جاتا ہے جہاں انھیں شہریت و ملازمت مل جاتی ہے۔ وہ کورٹ میرج کر لیتے ہیں اور برطانوی اخبار 'The Sun' کے تیج تھری پر ان کی بولڈ تصویر شائع ہوتی ہے۔

'سناٹا بولتا ہے' افسانہ دراصل صوبہ بہار کے ایک گاؤں اکبر پور کے سیاق و سباق میں تحریر کیا گیا ہے جہاں بابو کیشو سنگھ اور حسن خاں جیسے زمینداروں کے زیر سایہ تمام مذہب و ملت کے لوگ مسرت کے دن گزار رہے تھے اور یہ آزادی کے آس پاس کا زمانہ تھا۔ اس افسانہ میں ایک قصہ تو یہ ہے مگر افسانہ میں دوسرا قصہ چارو مجمدار کی قیادت والی نکسلی تحریک سے متعلق ہے جو اصلاً افسانہ کی جان ہے۔ یہاں گاؤں کی مظلوم وجیا ہے جو نکسلی بن جاتی ہے اور دوسرا ایک فوجی سردار خان ہے اور وہ وجیا کا محسن ہے۔ جس کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ گزرے ہوئے دنوں میں اسی کے احسان کی بدولت وجیا نے اکبر پور پر حملہ کرنا ترک کر دیا تھا۔ وجیا کے سلسلے کا یہ واقعہ گاؤں والوں کے لیے جہاں ایک پہیلی تھا وہیں دل والوں کے لیے لائق ترغیب ایک ناقابلِ فراموش مثالی داستان کے مترادف تھا۔ افسانہ نگار کا متذکرہ افسانہ نہایت دلچسپ ہے اور اوّل تا آخر بہ شوق پڑھے جانے کے قابل ہے۔

افسانہ 'وائلڈ لائف' افسانہ نگار کے دیگر افسانوں کے مقابلے منفرد ڈھب کا ہے جو قاری کو جنگل کی دنیا کی سیر گاہی کا لطف عطا کرتا ہے۔ اس افسانہ میں راوی کا یہ انکشاف بھی دلچسپ ہے کہ دادا اور باپ کے شکار کے شوق کے علاوہ عہد طفلی میں خود اپنی شمولیت کے سبب ہی وائلڈ لائف کے موضوع پر تحقیق کی جانب اس کی توجہ مبذول ہوئی تھی۔ اس ضمن میں وہ ہمیں آگاہ کرتا ہے کہ مدھیہ پردیش اور آسام کے گھنے جنگلوں میں شیر کی تلاش، ان کی نسلوں میں بچے سے بڑے ہونے تک کے مراحل، روزمرہ کے معمولات کے ساتھ ان کی نفسیات کے علاوہ دوسرے جانوروں کے ساتھ ان کے رویوں کے مشاہدات میرے موضوع سے متعلق تھے۔

اس افسانہ میں افسانہ نگار نے ایک قابلِ توجہ قصے سے ہمیں روشناس کراتے ہوئے یہ عرض کیا ہے کہ اس کے اس کاروبارِ شوق میں ایک اہم واقعہ یوں پیش آتا ہے کہ ایک شیر راوی یعنی مرکزی کردار کے بہت قریب چلا آتا ہے اور چند ساعت کو نظریں ملا کر جنگل میں واپس لوٹ جاتا ہے بالکل اس انداز سے کہ جیسے اس کا منشا کسی کا احسان اتارنا رہا ہو۔

صاحبِ تحقیق عالمِ تحیر میں شیر کے اس انوکھے اور غیر فطری رویے پر جب غور و فکر کے مرحلے سے گزرتا ہے تب اسے یاد آتا ہے کہ ایک زخمی شیر کا بچہ جس کے سر اور چہرے پر زخم تھے اسی علاقے میں اسے کبھی ملا تھا جس کا علاج کرنے کے بعد اس نے اسے واپس جنگل میں چھوڑ دیا تھا۔ عالمِ تجسس میں کیمرے کا کلوزاپ بڑھانے پر عرصہ بعد اس حقیقت سے آشنائی ہوئی کہ یہ وہی شیر کا بچہ تھا۔ یہاں افسانہ کے خاتمے پر ایک شعر تحریر کیا گیا ہے جو معنوی اعتبار سے یہ باور کراتا ہے کہ اب جنگل میں ہی جائے پناہ ڈھونڈی جائے کہ اب شہر میں بھیڑیے آباد ہوئے جاتے ہیں۔

اس طرح سے ابواللیث جاوید افسانوں کے سلسلے میں بطور مجموعی میرے خیالات و تاثرات یہ ہیں کہ وہ اپنے تقریباً تمام افسانوں میں مذہبی اقدار اور زمینی حقائق کو بہر صورت مقدم رکھتے ہیں کیونکہ ان کا یہ عقیدۂ مصمم ہے کہ مذہب کا ایک سچا پیروکار ہی صدقِ دل سے سماجی سروکار سے وابستہ ہو سکتا ہے اور اپنے اطراف کی جملہ بدعنوانیوں کو اجاگر کرنے کے ساتھ ان سے نجات کی تدابیر بھی دریافت کر سکتا ہے۔ ابواللیث جاوید اس جہانِ اردو افسانہ میں غالباً اپنی اسی مخصوص روش کی بنیاد پر اپنے معاصرین کے مقابلے ایک منفرد و امتیازی حیثیت کے حامل بن جاتے ہیں۔

اس کے علاوہ جہاں تک ان کے متذکرہ افسانوی مجموعہ میں شامل افسانوں کے اسلوب کا سوال ہے تو اس سطح پر وہ راست بیانیہ کے قائل دکھائی دیتے ہیں۔ شواہد پہ آیئے تو دورانِ مطالعہ ان کے افسانوں میں موضوعات کے برتاؤ کا یہ عالم ہوتا ہے کہ وہ اوّل تا آخر بصد توجہ قاری کے رابطے میں ہوتے ہیں اور بہ آسانی فہم میں اتر کر انھیں مسرت سے ہمکنار کرتے ہیں۔ ویسے ان کے نمونۂ فن کے تمام پہلو محض مثبت رخ پر مبنی نہیں ہیں بلکہ ان کے یہاں قاری کے مزاج کو بوجھل کر دینے والے اسباب بھی یقیناً موجود ہیں جنھیں ان کے افسانوں میں جملوں کی ساخت کے اعتبار سے دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کی متعدد مثالیں ہیں مگر صرف دو افسانوں سے مثالیں پیش کرتے ہوئے رعایتاً یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ان کے افسانوں کی اعلیٰ و ارفع ناصحانہ فکر انگیزیوں کے صدقے انھیں فراموش کر دینے میں کوئی عذر نہیں ہے کیونکہ ان معاملات کے سبب ان کے افسانوں کی صحت پر بلاواسطہ کسی قسم کے مضر اثرات مرتب نہیں ہوتے۔

ابواللیث جاوید اپنے افسانہ 'احساس' میں کہتے ہیں کہ:

''بے شمار لوگ ملبوں کے نیچے دبے پڑے موت اور زندگی کا بھیانک کھیل کھیل رہے ہیں۔''

''سمندر بھڑکا دیے جائیں گے یعنی تمام پانی میں آگ لگ جائے گی۔'' (ص 56)

اسی طرح افسانہ 'اُڑان' میں ہے کہ:

''ساری اپنی راز کی باتیں بڑی بے تکلفی سے کہہ جاتی ہے۔'' (ص 86)

غرض کہ ابواللیث جاوید کی افسانہ نگاری، اسلوب اور موضوعاتی تنوع دونوں کے اعتبار سے اردو افسانے کے معاصر منظرنامے میں ایک نئی روش کی نمائندگی کرتی ہے۔

■

Dr. Asif Saleem
Green Maraige Hall, Fase-2
Bari Path, Mahendru
Patna-800006 (Bihar)
Mob.:9534052751
riyazahmadpat@gmail.com

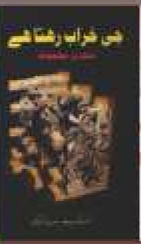

احمد نثار

تسلیم نیازی

اردو کا قلندر مزاج شاعر

اردو ادب کی تاریخ میں بعض شخصیات ایسی ہوتی ہیں جو نہ صرف اپنی تخلیقات سے بلکہ اپنے طرزِ فکر، لہجے، اور ادبی روش سے ایک الگ پہچان قائم کرتی ہیں۔ تسلیم نیازی ایسی ہی ایک منفرد اور غیر روایتی شخصیت کا نام ہے، جو اردو شاعری میں قلندر مزاجی کا استعارہ بن کر ابھرتے ہیں۔ ان کی شاعری نہ صرف لسانی حدود کو چیلنج کرتی ہے بلکہ فکری جمود کو توڑ کر قاری کو ایک نئی معنویت سے روشناس کراتی ہے۔ قلندر کی طرح وہ کسی رسم یا تقلید کے پابند نہیں، وہ اپنی راہ خود بناتے ہیں، اپنی زبان خود تراشتے ہیں، اور اپنے قاری کو جھنجھوڑ کر جگانے کا ہنر رکھتے ہیں۔ تسلیم نیازی کا یہ قلندرانہ اندازِ سخن اردو شاعری کو ایک نئی جہت عطا کرتا ہے۔

تسلیم نیازی اپنے عہد کی دھڑکن تھے، سماج کے المیے، انسان کے باطن، اور فطرت کے نازک احساسات کو شعری قالب میں ڈھالنے کا ہنر جانتے تھے۔ ان کی شاعری صرف ردیف و قافیہ کی ترتیب نہیں بلکہ فکر و احساس کی بلند پروازی ہے۔

تسلیم نیازی اپنے مشاہدے، مطالعے اور فکری گہرائی سے اشعار میں وہ تاثیر پیدا کرتے ہیں جو روح کو چھو جائے۔ ان کے کلام میں جمالیاتی نزاکت، فکری بلندی اور انسانی دکھوں کا سچ ہوتا ہے جو قاری کو اپنے ساتھ بہالے جاتا ہے۔ ان کی غزلیں ہوں یا نظمیں، وہ جذبات کی گہرائی میں ڈوبی ہوتی ہیں۔ تسلیم نیازی کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنے الفاظ سے معاشرتی شعور بیدار کرتے تھے۔ وہ روایتوں کی پاسداری کرتے ہوئے جدت کی راہیں نکالتے تھے۔

تسلیم نیازی کا اصل نام محمد تسلیم ہے اور جائے ولادت موضع ویاؤ، ضلع نالندہ (بہار) ہے۔ ولادت کی تاریخ 17 فروری 1966 اور وفات 19 جنوری 2021 کو ہوئی انھیں برن پور کے قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔ انھوں نے بی اے تک کی تعلیم حاصل کی تھی۔ انھوں نے اپنی علمی اور ادبی زندگی کا بیشتر حصہ علی گڑھ اور برنپور (آسنسول، مغربی بنگال) میں گزارا۔ وہ ایک دانشور، استاد، نقاد اور ماہرِ لسانیات بھی تھے، لیکن ان کی اصل شناخت شاعر اور صحافی کے طور پر ہوئی۔

تسلیم نیازی نے اپنے شعری سفر کا آغاز روایت کی پیروی سے کیا، لیکن جلد ہی وہ غزل کو محض رومانیت اور تشبیہات سے نکال کر ایک فکری تجربہ بنانے میں کامیاب ہو گئے۔

تسلیم نیازی کی شخصیت میں سنجیدگی، فکری پختگی اور انفرادی طرزِ فکر نمایاں ہے۔ وہ عمومی میلانات سے ہٹ کر سوچنے والے، خوددار اور آزادیٔ فکر کے علمبردار شاعر تھے۔ ان کی شاعری کا دائرہ صرف جمالیات تک محدود نہیں بلکہ تہذیبی، معاشرتی، سیاسی اور فلسفیانہ مضامین بھی اس میں سمائے ہوئے ہیں۔

تسلیم نیازی کی شاعری میں زبان ایک نیا تجربہ ہے۔ انھوں نے اردو زبان کے محاوروں، روزمرہ، دیہی لہجوں، جدید استعاروں، اور علمی اصطلاحات کو اس طرح استعمال کیا کہ اردو شاعری ایک نئے دور میں داخل ہو گئی۔

ان کے یہاں غزل محض جذباتی اظہار نہیں بلکہ ایک فکری اور لسانی تجربہ ہے۔ انھوں نے زبان کو شاعری میں اس طرح برتا کہ وہ خود ایک موضوع بن گئی۔

تسلیم نیازی کی شاعری میں درج ذیل موضوعات نمایاں ہیں، تشخص اور شناخت کا بحران، مابعد الطبیعیاتی سوالات، سیاسی و سماجی تضادات، فرد کی تنہائی اور عدمِ مطابقت، محبت کا نیا شعور اور تہذیبی شکست و ریخت وغیرہ۔ ان کی غزلیں عام طور پر پیچیدہ اور علامتی ہوتی ہیں، لیکن ان میں گہرائی، تنوع اور معنویت کا ایک وسیع جہان موجود ہے۔ ان کے ہم عصر شعرا نے ان کے اسلوب کی پذیرائی کی، اور ان کی جدت کو غزل کے ارتقا میں سنگِ میل قرار دیا۔ انھوں نے سینکڑوں غزلیں، رباعیات، قطعات اور نظمیں کہیں، مجموعے اور دیوان شائع کیے جن میں ذوالفن، لہو شعر، جی خراب رہتا ہے، تجھے کیا پتا۔ 'تجھے کیا پتا' تسلیم نیازی کے غیر مطبوعہ کلام کا مجموعہ ہے جسے مغربی بنگال اردو اکادمی کے تعاون سے 2025 میں شائع کیا گیا جس کی مرتبہ ان دختر نیک اختر شاذیہ نیازی ہیں) وغیرہ شامل ہیں۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہم اپنے زخموں کو لائے ہیں اس مقام پہ خود
کسی کے پاس برائے نمک نہیں گئے ہیں

دنیا سے تو ہر جنگ میں وہ ہارا ہوا ہے
اپنے ہی خلاف آج محاذ آرا ہوا ہے

جلتے تھے جو چراغ وہ سب لو سے باز آئے
لازم ہے اب ہوا بھی تگ و دو سے باز آئے

بڑی امید سے تکتے ہیں سب تری آنکھیں
نہ جانے کس کو کریں منتخب تری آنکھیں

پیش ہے تسلیم نیازی کے چند اشعار کی تشریح و تجزیہ۔

ہم نہ موتی میں نہ مرجان میں رکھے ہوئے ہیں
ہم تو پاسنگ ہیں میزان میں رکھے ہوئے ہیں

اس شعر میں شاعر نے نہایت گہرا اور علامتی انداز اپنایا

ہے۔ موتی اور مرجان دونوں قیمتی اور خوبصورت جواہرات ہیں۔ ان کا ذکر اکثر بلند مقام، قدر و قیمت اور دلکشی کے لیے کیا جاتا ہے۔

شاعر کہتا ہے کہ ہم ان قیمتی چیزوں میں شمار نہیں ہوتے، یعنی ہماری حیثیت نہ بلند ہے، نہ قابلِ فخر۔ یہ ایک خود آگاہی یا خود انکاری کا مظہر ہے۔ ہم وہ نہیں جنھیں سراہا جائے، یا جنھیں زینت بنایا جائے۔

دوسرا مصرع: 'ہم تو پاسنگ ہیں میزان میں رکھے ہوئے ہیں'

پاسنگ ترازو میں رکھی جانے والی وہ چھوٹی سی چیز ہوتی ہے جو وزن کو توازن دینے کے لیے رکھی جاتی ہے، لیکن اس کی خود کوئی قدر یا قیمت نہیں ہوتی، یہ صرف معیار یا پیائش کا آلہ ہے۔ شاعر نے یہاں اپنی ذات کو ایک ایسی چیز سے تشبیہ دی ہے جو صرف دوسروں کو پرکھنے یا تولنے کے لیے استعمال ہوتی ہے، مگر خود کسی وقعت یا مرکزیت کی حامل نہیں۔

وہ شخص جو دوسروں کے لیے معیار بنتا ہے، لیکن خود نظر انداز کیا جاتا ہے۔ جیسے ایک استاد، ناقد یا مصلح، جسے معاشرہ صرف دوسروں کے کام آنے کی حد تک یاد رکھتا ہے۔ شاعر کا کہنا ہے کہ ہم ترازو کے توازن کے لیے رکھے گئے ہیں، ہماری موجودگی سے دوسروں کا وزن معلوم ہوتا ہے، لیکن ہمیں کوئی نہیں گنتا۔ یہ شعر خود آگاہی، انکساری، اور معاشرتی بے قدری کے احساسات کا خوبصورت اظہار ہے۔ شاعر نے اپنے وجود کو کسی شوخ و قیمتی چیز کے بجائے ایک چھوٹے، مگر ضروری کردار سے تشبیہ دی ہے، جو نظر انداز ضرور کیا جاتا ہے، مگر غیر ضروری نہیں۔ یہ شعر

کب سے ہے انتظار کسی خوش خرام کا
مجھ سے بھی کوئی گزرے، گزرگاہ میں بھی ہوں

یہ شعر کلاسیکی اردو غزل کی روایت میں عاشقانہ، انتظار، اور تنہائی کے جذبات سے لبریز ہے۔ شاعر کے احساسات میں گہری چاہت، بے قراری، اور ایک طرح کی خاموش التجا جھلکتی ہے۔

پہلا مصرع: 'کب سے ہے انتظار کسی خوش خرام کا'

'کب سے' یہ فقرہ طویل انتظار اور وقت کی شدت کو ظاہر کرتا ہے۔ شاعر مدتوں سے کسی کا منتظر ہے۔

'انتظار' یہاں صرف جسمانی موجودگی کا انتظار نہیں، بلکہ ایک خاص کیفیت، ایک محبوب، ایک خواب

تسلیم نیازی کی شاعری نئی صدی کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہے۔ وہ کلاسیکی غزل کے مزاج کو ایک جدید پیرایہ میں ڈھالتے ہیں۔ ان کا شعری سرمایہ اردو ادب کا قیمتی اثاثہ ہے۔ ان کی شاعری صرف تخلیقی اظہار ہی نہیں بلکہ فکری ارتقا کا استعارہ بھی ہے۔ وہ شاعر جس نے روایت کے ساتھ مکالمہ کیا، زبان سے تجربہ کیا، اور جدید انسان کے ذہنی اور روحانی تضادات کو فن کے دائرے میں برتا، تسلیم نیازی کو بجا طور پر اردو غزل کی نئی سمت کا رہنما کہا جا سکتا ہے۔

جیسی ہستی کی راہ دیکھنا مراد ہے۔

'کسی خوش خرام کا' یہ لفظ محبوب کی خوبصورتی، نرمی، اور پرکشش شخصیت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

شاعر ایک ایسی شخصیت کا منتظر ہے جو نہ صرف خوبصورت ہو بلکہ اس کی چال میں بھی کشش ہو۔

دوسرا مصرع: 'مجھ سے بھی کوئی گزرے، گزرگاہ میں بھی ہوں'

شاعر نہ صرف انتظار میں ہے بلکہ خود کو اس راستے پر موجود تصور کرتا ہے جہاں سے محبوب کا گزر ممکن ہو۔

'مجھ سے بھی کوئی گزرے'

ایک خاموش فریاد ہے۔ جیسے شاعر محبوب کو پکار رہا ہو کہ 'میں بھی تو یہاں ہوں، ایک نظر ادھر بھی ہو۔'

یہ احساس کہ 'میں بھی قابلِ توجہ ہوں'، ایک خود پر سوال بھی ہے اور محبوب سے امید بھی۔

یہ ایک نہایت لطیف اور گہرا شعر ہے جو عشق، انتظار، اور تنہائی کی کیفیت کو نہایت دلنشیں انداز میں بیان کرتا ہے۔ شاعر اپنی موجودگی کو ثابت کر رہا ہے، لیکن ساتھ ہی اس کی بے بسی بھی جھلک رہی ہے۔

یہ شعر

جی خراب رہتا ہے
تو یہاں نہیں ہے کیا

یہ ایک مختصر، مگر گہرا شعر ہے، جس میں ایک داخلی کیفیت اور خارجی حقیقت کے درمیان تعلق قائم کیا گیا ہے۔

پہلے مصرعے میں شاعر کہتا ہے کہ میرا 'جی' (یعنی دل، ذہن یا طبیعت) خراب رہتا ہے، تو کیا اس کی کوئی وجہ یہاں موجود نہیں؟ کیا وہ سبب یا شخص جو اس کیفیت کا باعث ہے، یہاں (قریب، آس پاس یا زندگی میں) موجود نہیں؟ دوسرا مصرع سوالیہ ہے، جو شکایت، حیرت اور استفسار کی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے۔ الفاظ عام فہم ہیں، مگر معنوی طور پر گہرائی رکھتے ہیں۔

اس شعر کا نفسیاتی و فلسفیانہ پہلو ہے کہ شاعر مسلسل بے چینی محسوس کرتا ہے مگر اس کی وجہ مکمل طور پر واضح نہیں ہوتی۔ شاعر اس بے چینی کا سبب کسی مخصوص وجود یا کیفیت سے جوڑ کر گویا یہ کہہ رہا ہے کہ اگر میرا جی خراب رہتا ہے، تو ضرور کوئی وجہ یہاں موجود ہے، یعنی یہ دنیا، یہ ماحول، یہ رشتے، سب میں کوئی نہ کوئی خرابی یا کمی موجود ہے۔ یہ شعر سادگی میں لپٹی ہوئی ایک گہری فکر پیش کرتا ہے۔ شاعر نے اپنی داخلی کیفیت کو اس قدر عمومی اور موثر انداز میں پیش کیا ہے کہ قاری کو اپنے وجود کی کیفیت کا عکس اس میں دکھائی دیتا ہے۔ یہ ایک ایسا شعر ہے جو ذاتی احساس کو اجتماعی تجربے میں ڈھال دیتا ہے۔

یہ شعر جدید اردو شاعری کے اس رجحان کی نمائندگی کرتا ہے جس میں داخلی تجربات کو مختصر مگر پرتاثیر انداز میں بیان کیا جاتا ہے۔

تسلیم نیازی کی شاعری نئی صدی کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہے۔ وہ کلاسیکی غزل کے مزاج کو ایک جدید پیرایہ میں ڈھالتے ہیں۔ ان کا شعری سرمایہ اردو ادب کا قیمتی اثاثہ ہے۔ ان کی شاعری صرف تخلیقی اظہار ہی نہیں بلکہ فکری ارتقا کا استعارہ بھی ہے۔ وہ شاعر جس نے روایت کے ساتھ مکالمہ کیا، زبان سے تجربہ کیا، اور جدید انسان کے ذہنی اور روحانی تضادات کو فن کے دائرے میں برتا، تسلیم نیازی کو بجا طور پر اردو غزل کی نئی سمت کا رہنما کہا جا سکتا ہے۔

■

Ahmad Nesar
Editor 'Aalmi Falak'
Mohammad Ali road, City Colony
By Pass, P.O: B-Polytechnic- 828130
Dhanbad (Jharkhand)
Mob.: 8409242211
ahmadnesar2211@gmail.com

رام پور رضا لائبریری
کے چند اہم مخطوطات

محمد عبدالقادر

رام پور رضا لائبریری کا شمار، دنیا کی چند اہم لائبریریوں میں ہوتا ہے، جس میں ہندوستانی اور اسلامی تہذیب وثقافت کے بیش قیمتی مآخذ ومنابع موجود ہیں۔ اسے مخطوطات اور اسلامی تاریخ کے حوالے سے ایشیا کی سب سے بڑی لائبریری ہونے کا بھی شرف حاصل ہے۔ اس کی بنیاد، نواب فیض اللہ کے ہاتھوں 1774 میں رکھی گئی اور اس کی باقاعدہ تعمیر و ترقی کا زمانہ نواب سعید خان کی تخت نشینی سے شروع ہوتا ہے انھوں نے ریاست رام پور کی اصلاح وترقی میں اپنا کردار ادا کیا تو اس لائبریری کو بھی اصلاحی امور میں شامل کر کے تاریخ پر گراں قدر احسان کیا اس عہد سے لے کر آج تک اس کی تابندگی میں اضافہ ہوتا رہا ہے۔ نوابین رام پور نے ہر عہد میں اس کی حفاظت و صیانت میں بڑھ کر حصہ لیا ہے۔ ہر نواب نے اس کی تعمیر وترقی میں اپنے پیش رو سے زیادہ دلچسپی لی اور اس کی جلوہ سامانیوں کے نت نئے طریقے ایجاد کیے۔ نوابین رام پور کو نوادرات کا بڑا شوق تھا انھوں نے نوادرات جمع کرنے کے لیے کو بہ کو شہر بہ شہر اپنے کارندے پھیلا رکھے تھے جو عوام وخواص میں نوادرات کی تلاش وجستجو اور خرید پر مامور تھے خصوصی حالات میں نوادرات کے حصول کے لیے بڑی سے بڑی رقم دی جاتی، عام حالات میں نوادرات کی اہمیت کے لحاظ سے اس کی قیمت ادا کی جاتی، اس طرح بہت سے اہم اور کار آمد سکے، مہریں، اور مخطوطات اس کی زینت بن گئے۔

اس میں عربی، فارسی، پشتو، سنسکرت، ترکی، ہندی، تمل اور پنجابی زبانوں کی پندرہ ہزار قلمی کتب نیز سیکڑوں پینٹنگس، خوش خطی کے نادر ونایاب نمونے اس میں موجود ہیں۔ ان سب سے بڑھ کر اس کی خوش قسمتی یہ ہے کہ اس میں امام جعفر رضی اللہ تعالی عنہ کے دست کا لکھا ہوا قرآنی نسخہ بہ خط کوفی موجود اور لائق قرأت ہے۔ نایاب تفسیروں میں امام سفیان ثوری کی تفسیر کا واحد نسخہ اس کی زینت بنا ہوا ہے۔ عرشی نے اس کو مرتب کر کے علمی دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ عربی کے مشہور شاعر جریر بن عطیہ کا دیوان مع شرح موجود ہے۔ فارسی زبان وادب میں کلیات سعدی، خسرو، اور تفسیر طبری کے چند فارسی تراجم موجود ہیں۔ اردو زبان وادب کے حوالے سے دیوان زادہ شاہ حاتم جس کو انھوں نے اپنے دیوان سے مختصر کیا تھا، کلیات میر، سودا، حسن، جرأت، سوز، غالب کے دواوین کے نسخے اس میں موجود ہیں۔ ان شاءاللہ خان کی رانی کیتکی کے دو نسخے اس میں محفوظ ہیں۔

ہندی ادب کے حوالے سے بھی اس میں نایاب ذخیرہ اس کے خزائن کی دولت کو مزید تابندہ و تابناک بنا رہا ہے اس جانب تو کسی کی نظر ہی نہیں گئی اس کے مخطوطات پر ہندی ادبا کو کام کرنے کی بڑی ضرورت ہے تاکہ والیان رامپور کی علم پرستی اور ادب نوازی کا اندازہ ہو سکے اور اس کا یہ علمی ذخیرہ عام ہندی قارئین کے سامنے آجائے جس سے وہ اس علمی میراث سے مستفید ہو سکیں۔ مغلیہ دور حکومت سے متعلق مخطوطات کی بھی اس میں بہتات ہے کچھ مخطوطات بیرم خان عبدالرحیم خان خاناں وغیرہ کے دست کے یہاں ہیں۔ اس کے علاوہ ایسے نوادرات بھی اس کی زینت ہیں جو صرف دنیا میں اسی کا حصہ ہیں باقی کسی بھی کتب خانے میں دیکھنے میں نہیں آتے۔ فتاوی عالم گیری کے ترجمے کی اولین کاوش کا شرف روہیل کھنڈ کو حاصل ہے اس کا ترجمہ یہیں کیا گیا۔ نواب رام پور نے اس کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی کیوں کہ یہ بھی فقہ حنفی کے پیروکار تھے اس لیے اس حوالے سے عبادات ومعاملات کے فیصلے اس کی روشنی میں کیے جاتے اس کام کے لیے اس عہد کے نہایت نام ور علما کی خدمات حاصل کی گئیں لیکن اس کی بدنصیبی کہیے کہ وہ آج تک شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ ممتاز عالم دین مفتی سعد اللہ مرادآبادی جن کی شہرت ونام وری کے چرچے چار دانگ عالم میں تھے ان کے قلم سے 'طلسم ہوش ربا' کا نہایت حسین ترجمہ اس کی زینت ہے اس کے تراجم کی الگ الگ جلدیں مختلف ترجمہ نگاروں کے قلم کی زائیدہ ہیں مزید ان کے سوا ایسے جواہر پارے اس کی زینت ہیں کہ جن کے دیدار اور قرأت سے دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ اور مخطوطات کے حوالے سے تو یہ لائبریری اس قدر وسیع ہے کہ کوئی بھی محقق اس سے بے نیازی نہیں برت سکتا قدیم ہندوستانی تواریخ کے ایسے نایاب ونادر مآخذ اس میں موجود ہیں جن سے آنکھیں پھیرنا ناممکن ہے اگر تحقیقی میدان میں اعتبار حاصل کرنا ہے تو ان سے استفادہ کرنا ہی ہوگا۔

ورنہ کسی بھی محقق کی کاوش کو خواص میں اعتبار حاصل نہیں ہوگا۔ مخطوطات کے حوالے سے جیسا کہ مذکور ہو چکا یہ دنیا بھر میں اپنا کوئی جواب نہیں رکھتے، اس میں ہر موضوع سے متعلق، مواد کی اس درجہ کثرت ہے، جس کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا، اس میں طب وحکمت، منطق وفلسفہ، فصاحت وبلاغت، بیان وبدیع، شعروشاعری، سیرت و سوانح، تاریخ و تذکرہ، تجوید وقرأت، ناسخ ومنسوخ، تاویل وتفسیر، حدیث، اصول حدیث، فقہ اور اصول فقہ، تصوف وطریقت، عقائد واعمال اور تعارف رجال، فلسفہ وسحر، رمل وجفر جیسے سیکڑوں علوم وفنون سے متعلق ہزاروں مخطوطات کے ساتھ اسلامی علوم وفنون کی بیش بہا کتب اس میں محفوظ ہیں۔

اردو کے قدیم شعرا کے تذکرے بھی اس کی زینت ہیں فارسی زبان وادب کی نہایت عظیم الشان کتابیں اس میں موجود ہیں۔ اس عہد میں ان کی ترتیب و تدوین کی ضرورت ہے تاکہ ان علمی ذخائر تک عام اہل علم کی رسائی ہو سکے اور ان سے استفادہ ممکن ہو سکے۔ اردو کے ابتدائی تذکرے بھی فارسی زبان میں مکتوب ہیں ان کے متداول اور غیر متداول نسخوں سے ان کی ترتیب تدوین کا کام لیا گیا ہے، جس وجہ سے ان کے متون اغلاط سے پر ہیں اگر ان میں یہ خامیاں نہیں بھی ہیں تو یہ جدید پیمانے پر پورے نہیں اترتے اس لیے اس عہد میں اس ذخیرے پر دوبارہ تنقیدی نظر ڈالنے کی اشد ضرورت ہے۔ اس کے لیے ان کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ نسخوں پر نظر ڈالنا وقت کا اہم تقاضا ہے عبدالحق، قاضی عبدالودود، امتیاز علی عرشی، حبیب الرحمٰن شیروانی، مسعود حسن رضوی ادیب، حنیف نقوی، اکبر حیدری یہی گنے چنے نام ہیں جنھوں نے اس جانب توجہ کی ہے۔ باقی لوگوں کی دسترس سے یہ ذخیرہ باہر تھا جس وجہ سے عام محققین نے اس جانب نہایت کم توجہ دی۔ یا توجہ دینا چاہا بھی تو ان کی رسائی ان تک ممکن نہیں تھی اس وجہ سے ان کے حواس جواب دے گئے۔ مخطوطات کو بہ حیثیت فن مختلف زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ان کی مختلف قسمیں اس لائبریری میں موجود ہیں۔ اردو شعرا سے متعلق تذکروں کے مخطوطات کو دو حصوں میں بانٹا جاسکتا ہے۔ اولاً وہ تذکرے جو خود مصنف کے دست خط سے مزین ہیں۔ اور دسرے وہ تذکرے جو کسی کاتب نے نقل کیے ہیں دونوں قسم کے تذکرے اس میں وافر مقدار میں موجود ہیں۔

نکات الشعرا کا ایک ناقص الاوسط نسخہ اس میں موجود ہے۔ اس کا ایکسس نمبر 4811 ہے۔ اس کا سائز انیس ضرب گیارہ ہے۔ اس کے ہر صفحے پر 15 سطور ہیں یہ میر تقی میر کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ ہے۔ اس کے اوراق کی تعداد چھبیس اور صفحات 52 ہیں۔ لیکن اس کے اوراق پر جو نمبر درج ہیں وہ اس بات کے گواہ ہیں کہ اس میں کمی ہے اگر وہ اوراق محفوظ ہوتے تو اس نسخے کی

کیفیت نہایت بلند و بالا ہوتی۔ اس کا زمانہ تصنیف 1752 ہے اس کی تکمیل کے بعد بھی اس میں میر نے اضافے کیے جس پر اس کے مندرجات شاہد ہیں میر نے اس میں فارسی کی تقلید کی ہے۔ اس کے اولین صفحے کی پشت پر ریاست رام پور کی مہر ثبت ہے۔ اس کا آغاز بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے ہوتا ہے اس کا خاتمہ اس شعر پر ہوتا ہے۔

کہاں آتی میسر مجھ کو تجھ سی خود نمائی
یہ خیر اتفاق، آئنہ ترے رو بہ رو ٹوٹا

(نکات الشعرا قلمی، میر تقی میر مخزونہ رضا لائبریری رام پور، ورق نمبر 26)

اس کے تمام عنوانات شنگرفی روشنائی سے مکتوب ہیں۔ اس کا خط شکستہ ہے۔ بدخط ہے۔ اس کے اسلوب سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ نسخہ رواروی میں لکھا گیا ہے۔ اس کے اوراق آب رسیدہ ہیں، پورا نسخہ کرم خوردگی کا شکار ہے۔ اس کا زمانہ تالیف وتصنیف اٹھارہویں صدی عیسوی ہے۔ اس کی تصنیف کس کے ایما پر ہوئی اس حوالے سے یہ نسخہ رہنما نہیں ہے۔ بعض مواقع پر اس کی قرأت مشکل امر بن جاتی ہے۔ اس کے کرم خوردہ اوراق کی جلد سازی میں دوسرے اوراق سے مدد لی گئی ہے۔ اس کے آخری ورق پر بھی ریاست کی مہر مکتوب ہے۔ لیکن اس کے تمام اوراق پر ایک دوسرے ترتیبی نمبر بھی مکتوب ہیں جس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ نسخہ کسی دوسری کتاب کے ساتھ ملصق تھا۔ ورنہ اس کے ترتیبی نمبر اس پر مندرج نہ ہوتے۔ اس کا کاغذ ہینڈ میڈ دہلوی ہے۔ اس کی رنگت مائل الی الصفرۃ ہے لیکن امتداد زمانہ کی وجہ سے اس کی رنگت کہیں بھوری اور کہیں عنابی ہوگئی ہے۔ اس پر مصنف یا کاتب کی جانب سے کوئی مہر مکتوب نہیں ہے۔ اس میں حواشی موجود نہیں ہیں۔ لیکن مصنف کی جانب سے دیگر شعرا کے اشعار پر تصحیح موجود ہے۔ اس میں میر کے قلم نے نہایت قیمتی گوہر لٹائے ہیں اس میں لسانی مباحث اور زبان کے امثال ومحاورات سے اس کی قدر وقیمت میں ایسے اضافے کیے ہیں جن کی مثال اس عہد کی تذکرہ نگاری میں مفقود ہے۔ میر نے کہیں مختصر اور کہیں طویل تبصرے کر کے اس کے تنقیدی پہلو روشن کیے ہیں۔ مضمون اور حاتم کے اشعار پر ان کی تصحیح کچھ اس طرح مندرج ہے۔ حاتم کے سوانحی کوائف میں میر لکھتے ہیں کہ اگر یہ شعر میرا ہوتا تو میں اسے ایسے لکھتا۔

اگر چہ شعر من می شود این چنیں می گفتم
مبتلا آتشک میں اب ہوں میں
آگے آیا میرے کیا میرا

(ایضاص 20)

میر نے انھیں کے ایک دوسرے شعر کی تصحیح میں ایک لفظ کا اضافہ کر کے شعر کی معنویت کو کس طرح آسمان کی بلندیوں تک پہنچا دیا اور اس اضافہ نے اس کی دل کشی کے ساتھ اس کی معنوی رونق بھی مزید بڑھائی ہے جس سے میر کی معنی شناسی کے ساتھ ان کی بصیرت کا عرفان بھی ہمیں ہو جاتا ہے کہ میر کو انھیں باریکیوں اور لفظ شناسی کی وجہ سے شاعری کا خدائے سخن کہا جاتا ہے۔ ان استاذ شعرا کے یہاں بھی یہ خوبیاں مفقود ہیں جو میر نے ان کے اشعار میں تھوڑی سی ترتیب وترمیم اور حذف واضافہ کر کے پیدا کی ہیں یہ

صرف میر کی استادی کا کمال ہے۔ ورنہ ان کی جانب خود شاعر کا ذہن بھی راہ نہ پا سکا اگر اس جانب ان کا ذہن راہ پاتا تو وہ ان خوبیوں کو ہرگز فراموش نہیں کرتے جن کی ایجاد کا سہرا میر کے سر ہے۔ ان کے ایک دوسرے شعر کی تصحیح کرتے ہوئے لفظ قصاب کا میر نے اضافہ کیا ہے۔ اور اس اضافے نے شعر کی بلندی کو چار چاند لگائے ہیں۔

نظر آتا تھا بکری سا کیا پر ذبح شیروں کو
نہ جانا میں کہ یہ قصاب کا رکھتا ہے دل گردا

(ایضاً، ص20)

اس نسخے میں صفحہ نمبر گیارہ بارہ نصف ساقط ہے اس میں شعرا کی کل تعداد بانوے ہے یہ بھی امور نسخے کی کیفیت سے متعلق ہیں اور اس کے صفات کی تشریح و توضیح میں ممد و معاون ہیں اگر محقق کو ان کا علم نہ ہو تو وہ کما حقہ نسخہ شناسی کے عرفان سے محروم رہے گا۔ نسخہ شناسی میں قدم قدم پر ان بھی امور سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔

تذکرہ ریختہ گویاں، سید فتح علی گردیزی 1224ھ مطابق 1809 کی تصنیف ہے۔ ان کا تعلق گردیزی سادات سے ہے ان کی پیدائش دہلی میں ہوئی ان کو تصنیف و تالیف کا شوق تھا۔ اس میدان کے سوا دوسرے میدانوں میں بھی ان کے رشحات قلم موجود ہیں۔ اس تذکرے کے دو نسخے رام پور رضا لائبریری میں موجود ہیں ایک نسخہ کامل ہے اور دوسرا نسخہ ناقص الاول ہے۔ اس میں دیباچہ اور چودہ شعرا کے تراجم مفقود ہیں۔ اس کے صفحہ اول پر یہ عبارت مندرج ہے:

''تذکرہ ریختہ گویاں از سید فتح علی حسینی گردیزی
کہ بخط سید محسن علی صاحب سراپا سخن است''

(ریختہ گویاں قلمی از سید فتح علی گردیزی ورق 1 مخزونہ رام پور رضا لائبریری رام پور)

اول الذکر نسخے میں ستانوے اور ثانی الذکر میں شعرا کی تعداد تراسی ہے۔ ان دونوں نسخوں کے شعرا کی تعداد میں چودہ شعرا کا فرق ہے۔ اس میں کون سے شعرا مذکور ہیں اور کون سے اس میں مذکور نہیں ہیں اس حوالے سے دونوں کا تقابل کرنے کے بعد ہی کوئی فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ان دونوں میں کافی فرق ہے۔ اول الذکر میں حمد و ثنا اور دیگر لوازمات تالیف کا لحاظ رکھا گیا ہے لیکن ثانی الذکر اس حوالے سے عاری ہے۔ بلا واسطہ حمد و ثنا سے اس کا آغاز ہوتا ہے۔ اس حوالے سے دونوں میں یکسانیت موجود ہے۔ اس کے کاتب سید محسن علی محسن ہیں۔ رضا لائبریری میں موجود ثانی الذکر نسخے کا ایکسس نمبر موجود نہیں ہے۔ لیکن اس کا سیریل نمبر اس کی پیشانی پر درج ہے مزید اس کا قدیم نمبر بھی اس پر درج کیا گیا ہے۔ اس کی تشریح و توضیح کے لیے مصنف یا کاتب کی جانب سے کسی بھی قسم کا کوئی اہتمام نہیں کیا گیا ہے۔ اس کی زبان فارسی اور زمانہ کتابت 1166ھ مطابق 1752 عیسوی ہے۔ اس کا رسم الخط نستعلیق ہے۔ لیکن اس کی کتابت باریک قلم سے کی گئی ہے۔ اس میں کل شعرا کی تعداد ستاسی ہے۔ اس کے مجموعی اوراق کی تعداد 26 اور صفحات 52

ہیں۔ اس کے اوراق میں سطور کی تعداد بھی متفرق ہے کسی صفحے میں یہ تعداد پندرہ، انیس، بیس یا اس سے کم ہے۔ اوراق کرم خوردگی کا شکار ہیں۔ لیکن ان کی مرمت کا اہتمام کیا گیا ہے ان کی رونق اور مرمت میں کسی بھی قسم کی کوئی کمی نہیں رہنے دی گئی ہے ان کو لائق استفادہ بنانے کے لیے ہر ممکن کوشش کو بروئے کار لایا گیا ہے۔ ان اوراق میں کسی بھی قسم کی تزئین کاری نہیں کی گئی ہے۔ یہ اوراق جداول سے بھی عاری ہیں جو اس عہد میں عموماً رائج تھی۔ اس میں چند جگہوں پر حواشی تو موجود ہیں لیکن مصنف کی جانب سے کسی بھی قسم کی یادداشت اس نسخے کا حصہ نہیں ہیں۔ اس میں آغاز تا انجام کسی بھی قسم کی مہر مکتوب نہیں ہے اس میں ترقیمہ بھی مفقود ہے۔ امتداد زمانہ کی وجہ سے ان اوراق کی رنگت پیلی ہوگئی ہے۔ لیکن اس میں بھی تفاوت موجود ہے۔ سبھی کا رنگ ایک دوسرے سے جداگانہ ہے۔ اس کے نو صفحات درمیان سے یک گونہ خالی ہیں۔ اور اس نسخے میں یہ سادہ پن کاتب کی جانب سے ہے۔ اس کا سائز تیس ضرب بیس ہے۔ اس کا کاغذ ہینڈ میڈ دہلوی کاغذ ہے۔ اس کی روشنائی سیاہ ہے اس کے سوا اس نسخے میں کسی بھی روشنائی کا استعمال نہیں کیا گیا ہے اس کے جلی عنوانات میں کسی بھی امتیاز سے گریز کیا گیا ہے۔ بعض صفحات میں یہ روشنائی پھیل گئی ہے۔ محسن نے اس کی کتابت کہاں کی ہے یہ آج تک پردہ خفا میں ہے۔ کس کی فرمائش پر یہ معرض وجود میں آیا یہ بھی مجہول الحال ہے۔ اس کا خاتمہ اس شعر پر ہوتا ہے۔

دل پہ میرے ہیں داغ تیرے ہجر کے کئی
گنتی میں جن کی عمر میری سب گذر گئی

(ایضاً، ص52)

اس عہد میں بھی رضا لائبریری کا یہ نسخہ اپنے نقصان کے باوجود قارئین کو دعوت مطالعہ پیش کر کے اپنی جلوہ سامانیوں سے ادبی جہات کو روشنی فراہم کر رہا ہے۔

اردو میں میر حسن کی شناخت مختلف جہات سے ہوتی ہے۔ تذکرۃ الشعرا از میر غلام حسن کے بھی دو نسخے اس میں موجود ہیں۔ اسی تذکرے سے اردو زبان و ادب میں تذکرہ نگاری کی داغ بیل پڑی اور اس زبان کے اولین تذکرہ نگار ہونے کا ان کو شرف حاصل ہے۔ اس تذکرے کو میر حسن نے بڑی عمدگی کے ساتھ مرتب کیا ہے اپنے گرامی اوقات صرف کر کے ادب میں بہترین نمونہ پیش کیا اس کا آغاز اس عبارت سے ہوتا ہے۔ مزید اس سے قبل رب یسر و تمم بالخیر کے دعائیہ کلمات شنگرفی روشنائی سے مکتوب ہیں:

''سخن سنجان مضمون پرور، احمد قادری کہ بزبان لال قلم، از سرمہ دودہ ہم چشم منقار بلبلاں نمودہ اند۔''

(تذکرۃ الشعرا قلمی از میر غلام حسن ورق نمبر1 مخزونہ رام پور رضا لائبریری رام پور)

یہ نسخہ کامل ہے۔اس میں شعرا کو تاریخی اعتبار سے منقسم کیا گیا ہے متقدمین، متوسطین اور متاخرین کے زمرے،اس کو ایک الگ حیثیت عطا کر رہے ہیں۔ اس کے کاتب خود میر حسن ہیں۔ اس کا خط نستعلیق ہے۔اگر چند مواقع کو شمار نہ کیا جائے تو یہ اول تا آخر خوش خطی کا بہترین نمونہ ہے جو اس بات کی روشن دلیل ہے کہ میر حسن کو خطوط کی اچھی خاصی معرفت حاصل تھی یہی وجہ ہے کہ ان کا طریقہ کار اس عہد میں رائج طریقوں سے جداگانہ ہے۔اور انھوں نے بہ قدر استطاعت اس میں جدت کو برتنے کی سعی مشکور کی ہے۔ اس کے اوراق 158 اور صفحات تین سو سولہ ہیں۔اس کا سائز بائیس ضرب ساڑے تیرہ ہے۔اس کا کاغذ ہینڈ میڈ دہلوی کاغذ ہے۔ یہ نسخہ کرم خوردگی کا شکار نہیں ہے۔اس کی جلد عمدہ اور اس کے اوراق نہایت صاف ستھرے اور سادہ ہیں۔اس کے ہر صفحے میں،اول تا آخر تیرہ سطریں ہیں۔مصنف نے اس کے اوراق میں جداول کا اہتمام کیا ہے۔اس کی طلائی جدولیں اس کی خوب صورتی میں اضافہ کا باعث ہیں۔اس میں دو جگہ کے سوا کہیں بھی حاشیہ درج نہیں ہے۔مصنف کی یادداشتوں سے یہ نسخہ خالی ہے۔میر حسن نے اس کے مواد کو تختیوں میں بانٹا ہے۔بہت ساری جگہوں پر اس کے صفحات سادہ ہیں۔ اس میں شنگرفی اور سیاہ روشنائی کا استعمال کیا گیا ہے۔ جلی عنوانات شنگرفی روشنائی سے درج کیے گئے ہیں۔ میر حسن کی جانب سے اس میں کسی مہر کا استعمال بھی نہیں کیا گیا ہے۔اس کا مقام کتابت اور کس کی فرمائش پر یہ معرض وجود میں آیا،کس واسطے سے یہ رضا لائبریری پہنچا یہ بھی امور آج بھی مجہول ہیں۔ اس نسخے میں نثر و نظم کے اندراج میں مصنف نے امتیاز برتا ہے۔اگر نظم درج کی ہے تو ہر صفحے کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے اور نثر میں یہ اہتمام مفقود ہے۔اس میں ترقیمہ موجود نہیں ہے اس کا خاتمہ اس شعر پر ہوتا ہے۔

گل نرگس میں بھیجوں ہوں یعنی
چشم تیرے ہی انتظار میں ہے

(ایضاً،ص316)

تذکرۃ الشعرا کا دوسرا نسخہ بھی اس میں موجود ہے اس کے اوراق اس نسخے سے کم ہیں ان کی تعداد 122 اور صفحات 244 ہیں اس کا خط بھی نستعلیق ہے لیکن نہایت پراگندہ ہے چند مواقع پر تو اتنا بدنما ہے کہ دماغی

مشقت کا باعث بن جاتا ہے۔اس میں جداول کا اہتمام نہیں کیا گیا ہے۔اس کا حجم بھی کم ہے۔اس کے ہر صفحے میں پندرہ لائنیں ہیں۔ یہ نسخہ بھی کامل ہے اس کا آغاز اولین نسخے کی مانند ہوتا ہے۔اس کا سائز پچیس ضرب ساڑھے پندرہ ہے۔اس کا کاتب مجہول ہے۔ یہ کرم خوردہ ہے۔لیکن اس کی تزئین و آرائش کا اہتمام نہیں کیا گیا ہے اس کی جلد صاف ستھری ہے نیز یہ اس عہد میں بھی لائق استفادہ ہے۔اس پر حواشی مفقود ہیں اس کے اوراق میں چند لائنیں خط کشیدہ ہیں۔اس کے آغاز سے قبل بسم اللہ مکتوب ہے۔ لیکن رب یسر و تمم بالخیر کے دعائیہ کلمات اس نسخے میں موجود نہیں ہیں اول الذکر نسخے میں علامت تخلص کئی جگہ مفقود ہے لیکن اس میں کاتب نے اس کا اہتمام کیا ہے۔اس کا خاتمہ بھی اسی کی طرح ہے۔لیکن اس میں کاتب کا ترقیمہ موجود ہے لیکن ترقیمہ سادہ ہے۔اس کی عبارت حسب ذیل ہے:

''تمت تمام شد، روز دوشنبہ تمام شد''

(تذکرۃ الشعرا قلمی نسخہ ثانی از میر حسن،ص244،مخزونہ رام پور رضا لائبریری رام پور)

اس ترقیمہ سے اس کے دن کا تعین ہو جاتا ہے اول الذکر میں یہ تعین مفقود ہے ان دونوں نسخوں میں کافی فرق ہے اور یہ دونوں مستقل الگ الگ نسخے ہیں۔ ان کے چند فرق یہاں درج کرتا ہوں تا کہ ان کے فرق کو سمجھنے میں آسانی ہو۔میر، درد کے سوانحی کوائف دونوں میں یکساں ہیں لیکن اشعار کے درمیان فرق ہے۔اول الذکر نسخے میں میر درد کے انتیس اشعار درج ہیں لیکن ثانی الذکر میں ستائیس اشعار درج ہیں۔ میر ظفر علی آزاد کے سوانحی کوائف میں یکسانیت ہے لیکن مذکورہ نسخے میں یہ شعر کم ہے۔

مرغ دل تیری جدائی سے تڑپتا ہے
اس کو کیا حکم ہے آزاد کروں یا نہ کروں

(ایضاً،ص 16)

ایک فرق ان میں یہ بھی ہے کہ اول الذکر میں اشعار کی ترتیب میں خلل پیدا ہو جاتا ہے لیکن اس نسخے میں اس حوالے سے صحت کا بھرپور لحاظ رکھا گیا ہے۔میر انشاء اللہ خان کے انتخاب میں بھی کمی بیشی ہے۔اس میں سات شعر ہیں اور نسخہ اولی میں آٹھ شعر درج ہیں اول الذکر نسخے میں انشا کا انتخاب' گالی سہی، جفا سہی، چیں جبیں سہی' سے شروع ہوتا ہے لیکن اس میں اس شعر کا اضافہ ہے۔

گر نازنین کے کہنے سے مانو ہو کچھ برا
میری طرف تو دیکھیو میں نازنین سہی

(ایضاً،ص123)

اس شعر کے سوا باقی اشعار یکساں ہیں۔اس نسخے میں چند مواقع پر عبارتیں مٹ گئی ہیں۔ اکثر جگہوں پر حروف بوسیدہ ہو گئے ہیں۔اس میں نستعلیق شکستہ آمیز ہو گیا ہے۔محمد اعظم نامی شاعر کا اس میں اضافہ ہے جو اول الذکر میں موجود نہیں ہے بے نوا کے بیان میں بھی ان دونوں نسخوں میں فرق ہے لیکن کس کی دین اس جانب اس نسخے میں کوئی اشارہ موجود نہیں ہے اس بارے میں راقم کا خیال یہ ہے کہ یہ کاتب کی کرشمہ سازی ہے۔اس طرح مزید فرق ان دونوں نسخوں میں موجود ہیں جن کی تعداد کا تعین تقابل کا متقاضی ہے اس حوالے سے الگ مضمون میں روشنی ڈالی جائے گی تا کہ اس کا کوئی بھی پہلو تشنہ نہ رہ سکے۔اس مضمون سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ رام پور رضا لائبریری رام پور کی ادبی وراثت، محققین کی نظر نوازی کی حاجت مند ہے تا کہ اس کا ذخیرہ عام قاری کے سامنے آ سکے ورنہ اس بحر ذخار کو عبور کرنا کسی ایک انسان کے بس کا کام نہیں۔

■

Mohd Abdul Qadir
Research Scholar, Dept of Urdu
Delhi University
Delhi-110007
Mob.:9411659868
abdulquadirmisbahi7@gmail.com

بیگم انیس قدوائی

محمد سلیم قدوائی

بیگم انیس قدوائی (1906-1982) ایک ایسی غیر معمولی خاتون تھیں جنھوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں اپنی ہمہ گیر شخصیت کے انمٹ نقوش ثبت کیے۔ وہ ایک مجاہد آزادی، پارلیمینٹرین، سماجی کارکن اور ممتاز ادیبہ تھیں۔ ان کی پیدائش 1906 میں بارہ بنکی میں ہوئی تھی۔ انھوں نے جس دور میں آنکھیں کھولیں وہ ملک کی تاریخ کا ایک نہایت ہنگامی اور پر آشوب زمانہ تھا۔ ان کے ہم وطن مہاتما گاندھی کی قیادت میں برطانوی سامراج سے ملک کو آزاد کرانے کی جدوجہد میں مشغول تھے۔ نئی نئی سیاسی، جماعتیں اور تحریکیں جنم لے رہی تھیں۔ سیاست کے افق پر نئے نئے چہرے ابھر کر سامنے آ رہے تھے۔ تحریک خلافت، سول نافرمانی، نمک ستیہ گرہ، سودیشی تحریک اور بھارت چھوڑو کے نعروں سے فضائیں گونج رہی تھیں۔ غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف نفرت کا لاوا ابھر رہا تھا۔ خود ان کا قدوائی خاندان جنگ آزادی میں پیش پیش تھا۔ ان کے والد ولایت علی بمبوق محمد علی جوہر کے نزدیک ساتھی ہونے کی حیثیت سے تحریک خلافت کے ذریعہ جنگ آزادی میں سرگرمی سے حصہ لے رہے تھے۔ ان کے چچازاد بھائی رفیع احمد قدوائی پنڈت موتی لعل نہرو کے سکریٹری کی حیثیت سے تحریک آزادی کے ہیڈ کوارٹر آنند بھون میں مقیم تھے اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہے تھے۔ ایک حساس خاتون ہونے کی حیثیت سے انھیں قدوائی اپنے گرد و پیش کے ماحول سے نہ تو بے خبر رہ سکتی تھیں اور نہ ہی ان واقعاتی اور حالات کو نظر انداز کر سکتی تھیں۔ اس پس منظر کو سامنے رکھنا قدوائی کی فعال شخصیت اور کردار کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔ نتیجے کے طور پر وہ بچپن سے ہی تحریک آزادی میں سرگرم ہو گئیں اور نمک ستیہ گرہ، سودیشی اور بھارت چھوڑو تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگیں۔ جن دو ہستیوں نے انھیں سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ان کے والد ولایت علی بمبوق اور رفیع احمد قدوائی تھے۔ وہ ان دونوں کے زیر تربیت رہیں اور ان سے بہت کچھ سیکھا۔ ان کے علاوہ وہ مہاتما گاندھی کی مقناطیسی شخصیت سے بھی بہت متاثر ہوئیں۔ سچائی، عدم تشدد، مذہبی رواداری اور انسانیت کے بارے میں گاندھی جی کے نظریات اور تعلیمات ان کے لیے مستقل مشعل راہ کا کام دیتے رہے۔

انیس قدوائی کی شادی ان کے چچازاد بھائی شفیع احمد قدوائی سے (جو رفیع احمد قدوائی کے چھوٹے بھائی تھے) سے ہوئی تھی۔ وہ حکومت اترپردیش میں اونچے عہدے پر فائز تھے۔ ملک کی آزادی اپنے جلو میں برصغیر کی تقسیم بھی لے کر آئی اور ملک دو حصوں میں بٹ گیا۔ یہ تاریخ کا ایسا المیہ تھا جس نے برصغیر میں قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا۔ بے شمار جانیں گئیں اور ان گنت لوگ گھر سے بے گھر ہو گئے۔ تقسیم کے نتیجے میں جو خونریزی ہوئی اس کا نشانہ بننے والوں میں شفیع احمد قدوائی بھی شامل تھے۔ اس وقت ان کی پوسٹنگ دہرہ دون میں تھی۔ حالات خراب ہونے کے باوجود وہ اپنے فرائض کی انجام دہی کے لیے ڈٹے رہے اور ان کو بے رحمی سے شہید کر دیا گیا۔ انیس قدوائی کا سہاگ اجڑ گیا۔ اس سانحہ نے ان کے دل و دماغ کو بری طرح متاثر کیا۔ رنج و غم میں ڈوبی ہوئی وہ مہاتما گاندھی کے پاس پہنچیں۔ گاندھی جی نے ان کی ڈھارس بندھائی اور ان کی حالت کے پیش نظر ان کو ایسا کام سونپا جس کو انجام دینے میں وہ اپنا غم فراموش کر بیٹھیں۔ گاندھی جی نے ان کو ہدایت کی کہ وہ پرانی دلی کے علاقوں میں ریلیف کا کام کریں۔ وہ جب ان فساد زدہ علاقوں اور کیمپوں میں گئیں تو ان کو پتہ چلا کہ ان کی طرح بے شمار عورتوں کا سہاگ اجڑا ہے، اپنی آنکھوں سے پورے خاندان کو قتل ہوتے دیکھا ہے اور گھر سے بے گھر ہوئی ہیں۔ انھوں نے اپنے ذاتی غم کو بھلا کر اپنی پوری توانائی، مظلوموں اور فساد سے متاثر افراد کی زندگی میں رنگ بھرنے میں لگا دی۔ اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر وہ فساد زدہ علاقوں میں گئیں لوگوں کی جانیں بچائیں، رفیوجی کیمپوں میں جا کر بھوکوں کو کھانا پہنچایا، زخمیوں کی مرہم پٹی کی اور اسپتال پہنچایا۔ سبھدرا جوشی اور مردولا سارا بائی کے ساتھ مل کر انھوں نے برصغیر کی بہت سی ہندو مسلم خواتین اور لڑکیوں کا پتہ لگایا، جن کو اغوا کر لیا

گیا تھا اور ان کے وارثوں تک پہنچانے کا عظیم کام انجام دیا۔ آزادی کے بعد وہ مستقل خدمت خلق میں مصروف رہیں۔ ان کی خدمات کے اعتراف کے طور پر کانگریس پارٹی نے ان کو پارلیمنٹ کے ایوان بالا (راجیہ سبھا) کا ممبر منتخب کیا اور وہ دوٹرم یعنی 1956 سے 1968 تک پارلیمنٹ کی ممبر رہیں۔ بحیثیت رکن پارلیمنٹ وہ بہت فعال رہیں۔ ایوان کی کاروائی میں سرگرم حصہ لیا۔ سوالات کے ذریعہ حکومت کی توجہ مختلف مسائل پر مبذول کرائی۔ اس مدت کے دوران ونڈسر پلیس پر واقع ان کی سرکاری رہائش گاہ کے دروازے خاص و عام کے لیے کھلے رہے اور وہ بلا تفریق مذہب و ملت مظلوموں اور ضرورت مندوں کی ہر ممکن مدد کرتی رہیں۔ وہ ہمیشہ کمزور طبقات کو انصاف دلانے کے لیے کوشاں رہیں۔ ساٹھ کی دہائی میں جب ملک کے مختلف مقامات پر فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے تو وہ سبھدرا جوشی اور دوسرے لوگوں کے ساتھ فوراً وہاں پہنچیں اور متاثرین کو راحت رسانی اور ان کی بازآبادکاری میں مشغول رہیں۔ اس سلسلے میں جواہر لعل نہرو پر اپنے مضمون میں انھوں نے لکھا ہے:

''جبل پور کے ہنگامے کو سن کر وہاں جاتے ہوئے ہم نے ان کو (پنڈت نہرو) کو خط لکھ دیا کہ ہم دونوں (سبھدرا جوشی) سے وہاں کے خوفناک حالات سن کر جا رہے ہیں۔ آپ کی اخلاقی مدد کی ضرورت ہے۔ ہم ضرورت پڑنے پر آپ کا نام استعمال کریں گے۔ انکار نہ کر دیجیے گا۔ آپ کے نمائندے اور ایلچی کی حیثیت ہم کو حاصل ہونا چاہیے اور پنڈت جی نے ہماری لاج رکھ لی۔'' (اب جن کے دیکھنے کو...)۔

پارلیمنٹ کی ممبری ختم ہونے کے بعد بھی وہ خدمت خلق میں آخری دم تک مصروف رہیں۔

سیاست اور سماجی خدمت کے علاوہ قدوائی نے ادب کے میدان میں بھی اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے اور ایک مستند ادیبہ کے طور پر بھی اپنا مقام بنایا ہے۔ ان کے گھر کا ماحول ادبی تھا۔ ان کے والد ولایت علی بمبوق ایک ممتاز ادیب تھے۔ ان کو اردو اور انگریزی دونوں زبانوں پر عبور حاصل تھا اور والدہ بھی اسی زمانے کے لحاظ سے پڑھی لکھی خاتون تھیں اور اپنے ساتھ کتابوں کے کئی سیٹ جہیز میں لائی تھیں۔ بدقسمتی سے اس زمانے کے اصول کے مطابق ان کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا لیکن انھوں نے اپنی دلچسپی شوق اور مطالعہ سے اردو زبان پر عبور حاصل کر لیا اور اس میں گھریلو ماحول نے بھی مدد کی کیونکہ ان کے خالو کے پاس کثرت سے رسالے آیا کرتے تھے اور ذاتی لائبریری میں کتابیں بھی خاص تھیں۔ پڑھنے کے ساتھ ساتھ قدوائی کو لکھنے کا بھی شوق تھا۔ ان کی مضمون نگاری کا سلسلہ 1928 سے شروع ہوا جب ان کا پہلا مضمون عصمت دہلی میں شائع ہوا۔ مضامین کے علاوہ انھوں نے افسانے بھی لکھے، انشائیے بھی لکھے، ڈرامے اور خاکے بھی لکھے۔ ان کی تصنیفات میں چار کتابیں شامل ہیں۔ پہلی کتاب 'آزادی کی چھاؤں میں' ہے جو 1974 میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب ان کے ذاتی مشاہدات اور تجربات پر مبنی ہے جو تقسیم ہند کے پس منظر میں لکھی گئی

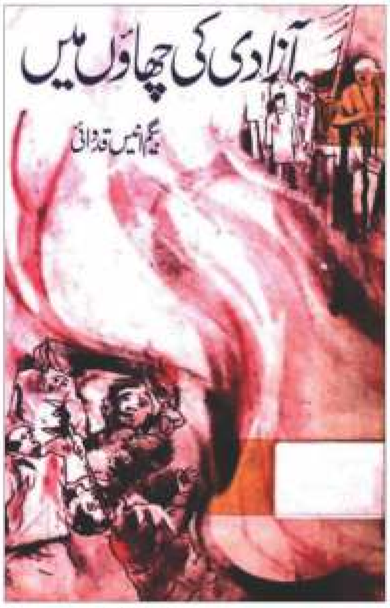

ہے۔ یہ ایک دستاویزی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی تاریخی اہمیت کے پیش نظر اس کو نیشنل بک ٹرسٹ نے شائع کیا۔ اس کتاب کا انگریزی اور ہندی میں ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ تقسیم ہند کے موضوع پر اس کتاب کی اپنی اہمیت ہے اور اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے اور ریسرچ کرنے والے اس کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ دوسری کتاب انشائیوں کا مجموعہ 'نظرے خوش گزرے' جو 1976 میں شائع ہوا۔ اس مجموعے کے کچھ مضامین آل انڈیا ریڈیو کے دیے ہوئے عنوانات پر نشر ہوئے، کچھ ادبی محفلوں میں پڑھے گئے، کچھ مضامین محض خیالی ہیں۔ ان میں چند شخصیات پر بھی مضامین شامل ہیں۔ اس مجموعہ کے تمام مضامین انشائیہ کے زمرے میں نہیں آتے۔ تیسری کتاب ان کے خاکوں کا مجموعہ 'اب جن کے دیکھنے کو' ہے۔ اس مجموعہ میں 13 خاکے ہیں جن میں والد کے علاوہ معروف شخصیتیں مثلاً جواہر لعل نہرو، مولانا آزاد، رفیع احمد قدوائی، محمد علی جوہر، شفیق الرحمن قدوائی، مردولا سارابائی، ڈاکٹر کچلو، چودھری محمد علی ردولوی، ڈاکٹر سید عابد، قدسیہ زیدی شامل ہیں۔ وہیں دوسری طرف کچھ غیر معروف ہستیوں مثلاً حافظ جمن، مرزا ابوالفضل اور اجتماع ضدین بھی شامل ہیں۔ یہ تمام خاکے نہایت دلچسپ انداز میں لکھے گئے ہیں۔ یہ تمام ہستیاں ان کو محبوب تھیں۔ ان خاکوں سے ان شخصیات کے وہ پہلو ابھر کر سامنے آتے ہیں جن کی وجہ سے وہ انھیں قدوائی کے لیے آئیڈیل کی حیثیت رکھتے تھے۔ چوتھی کتاب ان کی نامکمل خودنوشت 'غبارِ کارواں' ہے جس کو پروفیسر انور صدیقی نے مرتب کر کے 1983 میں مع اپنے پیش لفظ کے ساتھ شائع کیا تھا۔ بدقسمتی سے وہ اپنی زندگی کی کہانی کو 1926 تک ہی لکھ سکی تھیں کہ خرابیِ صحت کی وجہ سے وہ اس کو مکمل کرنے سے قاصر رہیں۔ بقول انور صدیقی:

''غبار کارواں صرف انیس آپا کی زندگی کی کہانی نہیں ہے، اس میں ہماری معاشرتی، تہذیبی اور سیاسی زندگی کے بہت سے ایسے نقوش ہیں جنھیں ان کے قلم نے بڑی خوبی اور خوبصورتی سے ابھارا اور محفوظ کیا ہے... یہ ایک ادھورا رزمیہ ہے، مسلم متوسط گھرانے کی ایک عورت کا جو اپنی شناخت کے سفر پر نکلتی ہے اور طرح طرح کی مشکلات و مواقع کے باوجود کامیاب و کامران ہوتی ہے۔'' (پیش لفظ غبار کارواں)

'نظرے خوش گزرے' کے پیش لفظ میں وہ خود اپنی تحریروں پر یوں اظہار خیال کرتی ہیں:

''میری زبان قصباتی ہے، اودھ کے قصبات میں ہندی اور فارسی الفاظ کا ایک خوبصورت ملا جلا، لغت و ڈکشنری سے مستثنیٰ تلفظ رائج تھا۔ مضامین میں اہل زبان کو چند لفظ غیر مانوس سے نظر آئیں گے اگر معنی ومفہوم اور سلاست اور روانی میں فرق نہیں آتا تو ڈکشنری نہیں عوام کے منھ سے ان الفاظ کی تصدیق کر کے ان کی جامعیت اور لطافت کا اندازہ کر لیجیے۔''

ان کتابوں کے علاوہ انھوں نے مختلف رسائل و جرائد میں کثرت سے لکھا اور ادبی دنیا میں اپنی شناخت قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ ان کے زور قلم کا اعتراف کرتے ہوئے نامور ادیب اور انشاپرداز مولانا

عبدالماجد دریابادی نے اپنے ایک خط میں لکھا:

''کئی دن ہوئے آں عزیزہ کا ایک مضمون جبل پور کے خونیں واقعہ پر سیکولر ڈیموکریسی (اردو) کے پرچے میں دیکھا اور ادبی حیثیت سے بہت پسند آیا۔ یہ گمان نہ تھا کہ ولایت زادی (ان کے والد کا نام ولایت علی تھا) (اگنی صحیح، سلیس، بے تکلف اور شگفتہ اردو پر قادر ہوگی۔'' (مکتوبات ماجدی، جلد ششم، ص171)

بیگم انیس قدوائی ملک کی تحریک آزادی میں جس جذبۂ صادق سے شامل ہوئی تھیں اس پر زندگی کے آخری لمحہ تک قائم رہیں اور عمل کرتی رہیں۔ اپنی زندگی کے بدترین سانحہ کے بعد گاندھی جی سے ان کی ملاقات ان کی زندگی کا اہم سنگ میل ثابت ہوئی اور ان کی زندگی کا مقصد ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کو زندہ اور پائندہ رکھنا بن گیا۔ انسانیت اور بھائی چارے کے لیے انھوں نے زندگی وقف کردی۔ انھوں نے جو سوچا قوم کے لیے سوچا، جو قدم اٹھائے، انسانیت کی بھلائی کے

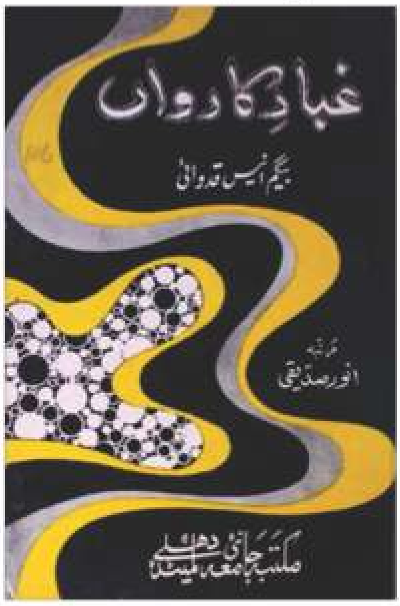

لیے اٹھائے، انسان کی عزت وآبرو کو اپنی ذات سے زیادہ مقدس سمجھا۔ وہ ٹھیٹھ ہندوستانی تھیں لیکن ان کا دماغ بیسویں صدی کا سائنٹفک دماغ تھا۔ مذہب کی اصل روح کو انھوں نے اپنے افعال واعمال میں سمولیا تھا۔ جس سے کسی نہ کسی طرح کا ان کا تعلق قائم ہوجاتا۔ اس سے ذاتی تعلقات اپنی لطافت سے قائم رکھتیں کہ حیرت ہوتی۔ ان کی سادگی، خوش اخلاقی اور خوش مذاقی اور تہذیب مسحور کن تھی۔

میری خوش قسمتی تھی کہ خاندانی تعلق ہونے کے علاوہ مجھے ان سے ملنے کے مواقع کثرت سے ملے اور خصوصی تعلق قائم ہوا۔ ہماری پہلی ملاقات بچپن میں اس وقت ہوئی جب میں اپنے رشتے کے چچا انصر قدوائی کی بارات میں مسولی گیا تھا۔ ان کی شادی بیگم انیس قدوائی کی بھتیجی سے ہوئی۔ پہلی ملاقات کا نہایت خوشگوار تاثر لے کر لوٹا تھا اور اس دن سے انھیں قدوائی کا شمار میری پسندیدہ ہستیوں میں ہونے لگا تھا۔ اس کے بعد مختلف موقعوں پر خاص طور سے تقریبوں میں لکھنؤ، علی گڑھ اور دہلی میں ان سے ملنا ہوتا رہا، لیکن ہمارا اصل اور گہرا تعلق 1975 میں ہوا جب میں سروس کے سلسلے میں دہلی آیا جہاں بیگم انیس قدوائی کا مستقل قیام تھا۔ اس زمانے میں السٹریٹڈ ویکلی (Illustrated weekly) کے ایڈیٹر خوشونت سنگھ نے مجھے قدوائی خاندان کے بارے میں آرٹیکل لکھنے کا آفر دیا تھا۔ میں اس کا مواد اکٹھا کرنے کے لیے بیگم انیس قدوائی کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ انھوں نے بڑے تپاک اور اپنائیت سے میرا خیر مقدم کیا تھا اور دیر تک ان سے دلچسپ اور معلومات افزا گفتگو رہی تھی۔ ان سے تفصیلی ملاقات کرکے اتنا اچھا لگا تھا کہ خواہش ہوتی تھی کہ ان سے دوبارہ بلکہ بار بار ملا جائے۔ رخصت ہوتے وقت انھوں نے دوبارہ اور بھی ملنے کی تاکید کرکے دل خوش کردیا تھا اور میں ان سے گاہے بگاہے ملنے لگا تھا۔ وہ ہر ملاقات میں ایسی محبت اور شفقت سے پیش آتیں کہ لگتا کہ وہ مجھے بہت عزیز رکھتی ہیں۔ ان سے مختلف موضوعات پر جن میں قدوائی خاندان کی تاریخ کے علاوہ تحریک آزادی، تقسیم ہند کا المیہ، گاندھی جی، جواہر لال نہرو، مولانا آزاد، محمد علی جوہر اور سب سے بڑھ کر رفیع احمد قدوائی کے بارے میں بات رہتی۔ اس سے میری معلومات میں قیمتی اضافہ ہوتا۔ وہ میرے نانا عبدالماجد دریابادی جو ان کے والد ولایت علی بمبوق کے نزدیکی دوست رہے تھے کے بارے میں بھی اکثر ذکر کرتیں جو مجھے اچھا لگتا۔ ہماری ملاقاتوں کا سلسلہ تقریباً ساڑھے چار سال تک چلا یعنی 1975 سے 1979 تک پھر میں کشمیر یونیورسٹی میں سروس جوائن کرنے سری نگر چلا گیا لیکن ہمارا رابطہ برقرار رہا۔ چھٹیوں میں دہلی آنے میں ان سے ضرور ملتا اور وہ ہمیشہ نہایت گرم جوشی اور اپنائیت سے ملتیں۔ مجھے آج بھی 16 جولائی 1982 کی وہ ابر آلود شام یاد آتی ہے جب

بیگم انیس قدوائی نے جو سوچا قوم کے لیے سوچا، جو قدم اٹھائے، انسانیت کی بھلائی کے لیے اٹھائے، انسان کی عزت وآبرو کو اپنی ذات سے زیادہ مقدس سمجھا۔ وہ ٹھیٹھ ہندوستانی تھیں لیکن ان کا دماغ بیسویں صدی کا سائنٹفک دماغ تھا۔

میں نے آل انڈیا ریڈیو سے ان کی رحلت کی خبر سنی، اس سے مجھے دلی صدمہ ہوا اور ان کے یہاں گزارے ہوئے خوشگوار لمحات جذبات کی پوری شدت کے ساتھ بے اختیار نظروں کے سامنے گھوم گئے۔ ان کا خیال آتے ہی ایک شفیق، شگفتہ چہرہ، زندگی سے بھرپور ہستی جو لکھنوی تہذیب، خوش اخلاقی، خوش ذوقی اور خوش مزاجی کا دلکش امتزاج تھی، خود بخود سامنے آگئی۔ وہ بلاشبہ ایک دل نواز شخصیت کی مالک تھیں اور سادگی ان کا سب سے بڑا وصف تھی۔ آج وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن ان کی مسحور کن شخصیت، ان کی شفقت اور عنایت ذہن کے پردے پر ہمیشہ جھلملاتی رہیں گی۔ مجھے فخر رہے گا کہ میں نے بیگم انیس قدوائی جیسی عظیم خاتون کو قریب سے دیکھا اور ان سے بہت کچھ سیکھا اور سمجھا۔

بدقسمتی سے بیگم انیس قدوائی جیسی اہم اور عظیم شخصیت کے بارے میں بیشتر لوگ بے خبر ہیں۔ ان کی عوامی اور ادبی خدمات اور کارناموں کو نظرانداز کیا گیا ہے۔ ان کی سیاسی، سماجی سرگرمیوں اور تصنیفی کاموں سے نئی نسل ناواقف ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس مثالی خاتون کی خدمات اور کارناموں کو نئی نسل خاص طور سے نوجوان لڑکیوں کے سامنے پیش کیا جائے تاکہ آنے والی نسلیں ان کی شخصیت سے فیض حاصل کرسکیں۔ وہ بلاشبہ ان کے لیے رول ماڈل ثابت ہوسکتی ہیں۔

■

Prof. (Dr.) Mohd Saleem Qidwai
C-501, Rosewood Apartment
Mayur Vihar
New Delhi- 110091
Mob.:9953529424
mskidwai@hotmail.com

ابن کنول کی غیر افسانوی نثری خدمات

عامر عباس

ابن کنول کا شمار اردو ادب کے ان اہم قلم کاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے کلاسیکی ادب کی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ تخلیقی ادب پیش کیا۔ وہ ترقی پسند فکر سے متاثر ہونے کے باوجود بھی کسی مخصوص نظریے یا اصول کو اپنی تخلیقات پر حاوی نہیں ہونے دیتے تھے۔ ان کی تحریریں ایک منفرد داستانوی اسلوب کی حامل ہیں، جس نے انھیں اردو ادب کی دنیا میں ایک منفرد مقام عطا کیا۔ ابن کنول کی شخصیت ہمہ جہت تھی۔ وہ تخلیقی ذہن کے مالک کثیر الجہات ادیب تھے۔ وہ بیک وقت افسانہ نگار، ڈراما نویس، خاکہ نگار، سفرنامہ نگار، انشائیہ نگار، نقاد، محقق اور شاعر تھے۔ ان کا اصل نام ناصر محمود کمال تھا، لیکن ادبی دنیا میں وہ ابن کنول کے نام سے جانے جاتے تھے۔ ان کی تخلیقات میں گہرائی، شگفتگی اور جدت کا حسین امتزاج ملتا ہے، جو انھیں دیگر قلم کاروں سے ممتاز بناتا ہے۔ مابعد جدید اردو ادیبوں میں ابن کنول کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ ان کی انفرادیت اس بات میں ہے کہ وہ نہ صرف ایک ممتاز داستان شناس اور کامیاب افسانہ نگار تھے بلکہ ایک اعلیٰ درجے کے محقق، نقاد، اور منفرد خاکہ، انشائیہ اور سفرنامہ نگار بھی تھے۔ ان کی تخلیقیت میں خارجی عوامل کے ساتھ ساتھ شعوری اور داخلی احساسات کا بھی گہرا عمل دخل تھا، جو انھیں تخلیقی میدان میں اعلیٰ مقام پر فائز کرتا ہے۔ ابن کنول کی اہمیت اس بات سے واضح ہوتی ہے کہ انھوں نے اردو نثر کو لفظیات، ترکیب سازی، کردار نگاری، اور پیکر تراشی کے نئے انداز سے متعارف کرایا۔ انھوں نے روایتی ڈگر سے ہٹ کر اور تقلید کی راہ چھوڑ کر اردو نثر کو ایک ایسا منفرد اسلوب اور لب و لہجہ عطا کیا جو بالکل جداگانہ اور منفرد ہے، اور یہی خوبی ایک بڑے فنکار کی پہچان ہے۔ ابن کنول ایک تجربہ پسند اور تجربہ کار تخلیق کار تھے۔ ان کے ہاں عصری مسائل، خواہ وہ سیاسی ہوں، سماجی ہوں یا تہذیبی، سب کے بارے میں ان کی فکر مندی اور فنی مہارت گہرے اور متوازن انداز میں جھلکتی ہے۔ ڈاکٹر افضل مصباحی اپنے مضمون 'پروفیسر ابن کنول: کچھ یادیں، کچھ باتیں' میں لکھتے ہیں:

"پروفیسر ابن کنول میں وہ تمام خوبیاں بدرجہ اتم پائی جاتی تھی جو ایک اچھے استاد، ماہر ادیب، دیدہ ور قلم کار، دور بیں ناقد، کہنہ مشق تخلیق کار، تجربہ کار اسکالر اور ایک اچھے انسان میں ہونی چاہئیں۔ خواہ وہ تحریر ہو یا تقریر؛ خوبصورت اور دلکش پیرائے میں باتوں کو پیش کرتے اور موضوع کی مناسبت سے معرکۃ الآرا بحث کرنے کا وہ ہنر جانتے تھے۔ خاکہ ہو یا افسانہ، تحقیق ہو تنقید، تمام اصناف میں فنکارانہ مہارت کا ثبوت دیتے اور 'شگفتگی و سنجیدگی' کو برقرار رکھتے تھے۔"1

ابن کنول کے تمام ادبی کارناموں کی تفصیلات اس طرح مرتب کی جاسکتی ہیں کہ انھوں نے تقریباً تین درجن کتابیں تصنیف و ترتیب دی ہیں۔ ان کی تخلیقی کاوشوں میں شاہکار افسانے، خاکے، انشائیے، ڈرامے اور سفرنامے شامل ہیں۔ تنقید کے میدان میں بھی وہ اپنی نظیر آپ تھے۔ ان کی رہنمائی میں بے شمار طلبا و طالبات نے ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ آپ تقریباً پانچ دہائیوں تک اردو زبان و ادب کے فروغ میں مسلسل مصروف رہے۔ ان کے قلم سے مختلف اصناف میں متعدد تحقیقی، تنقیدی، علمی اور ادبی مضامین وجود میں آئے۔ ابن کنول کی کتابیں روسی زبان میں بھی ماسکو سے شائع ہوچکی ہیں، اس کے علاوہ نیشنل بک ٹرسٹ نے آپ کی کتابیں اردو اور ہندی میں بھی شائع کی ہیں۔ ان کی اہم تصانیف میں افسانوی مجموعے، تیسری دنیا کے لوگ (1984)، بند راستے (2000)، پچاس افسانے (کلیات 2014)، اہل الکہف (2018)، الحلم (2020)۔ (ڈرامے) پہلے آپ (2008)، بزم داغ (2020)، کچھ شگفتگی کچھ سنجیدگی (خاکے) 2020، بساطِ نشاطِ دل (انشائیے 2021)، تبریک (تقاریظ 2022)، چار کھونٹ (سفرنامے 2022)، ہندوستانی تہذیب بوستانِ خیال کے تناظر میں (تحقیق 1988)، ریاض دلربا (تحقیق 1990)، آؤ اردو سیکھیں (قاعدہ 1993)، داستان سے ناول تک (تنقید 2001)، بوستان خیال: ایک مطالعہ (تحقیق 2005)، تنقید و تحسین (تنقید مضامین کا مجموعہ 2006)، میر امن (مونوگراف 2007)، اردو افسانہ (تنقید 2011)، اردو شاعری (تنقید 2019)، داستان کی جمالیات (تنقید 2020)، داغ دہلوی (مونوگراف 2022)، وغیرہ ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت ساری کتابوں کو ترتیب دیا ہے۔ پروفیسر ابن کنول کی یہ تصانیف ان کے علم و فن، محنت اور اردو ادب سے لگاؤ کا واضح ثبوت ہیں، جو اردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہیں گی۔

ابن کنول کی پہچان اردو ادب میں ایک نمایاں افسانہ نگار کی ہے۔ بلا مبالغہ ابن کنول اردو فکشن کی مقبول ترین آواز ہیں۔ انھوں نے نہ صرف فکشن بلکہ غیر افسانوی ادب میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ تجزیاتی

مضامین، تحقیقی کاوشات اور مرتبین کی حیثیت سے بھی ابن کنول اردو ادب میں مشہور ہیں۔ آپ ایک بہت اچھے افسانہ نگار کے ساتھ ساتھ ایک اعلی پائے کے خاکہ نگار، ایک بہترین انشائیہ نگار، اور اچھے سفر نامہ نگار بھی ہیں، ابن کنول نے جس بھی صنف میں طبع آزمائی کی اس کے فنی وتخلیقی مطالبات کو ہمیشہ مدنظر رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تخلیقات ادبی دنیا میں اپنا ایک الگ ہی مقام رکھتی ہیں۔

موجودہ صدی میں خاکہ نگاری کی روایت کافی حدتک ماند پڑ چکی ہے۔ اب عموماً خاکہ نگار تنقید یا تنقیص پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ تاہم، ابن کنول اس رجحان سے ہٹ کر خاکہ نگاری کی کلاسیکی روایت اور فن کی پیروی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ انھوں نے خاکہ نگاری میں نئی روح پھونک دی ہے۔ کورونا جیسی مہلک بیماری کے باعث دنیا کے بیشتر ممالک کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں بھی لاک ڈاؤن نافذ کیا گیا۔ اس دوران لوگوں کو کہیں آنے جانے یا کسی سے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ اسی عالمی وبا کورونا وائرس اور ملک گیر لاک ڈاؤن کے دوران ابن کنول نے پچیس بیش قیمتی خاکے قلم بند کر کے انھیں 'کچھ شگفتگی کچھ سنجیدگی' کے نام سے 2020 میں لاک ڈاؤن کے دوران شائع کرایا۔ اس کتاب کی ادبی حلقوں میں کافی پذیرائی ہوئی۔ ابن کنول نے اس مجموعے میں ان سبھی اشخاص کا خاکہ قلمبند کیا ہے جن سے ان کے دلی مراسم تھے۔ ان خاکوں کے حوالے سے ابن کنول لکھتے ہیں:

"اس نظر بندی میں مجھے میرے اپنے یاد آئے، جن سے میرا خون کا رشتہ نہیں لیکن دل کا رشتہ تھا اور دل کا رشتہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ میں نے انھیں قلم کے ذریعہ یاد کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ 12 اپریل کو 'داستان کی جمالیات' کا پیش لفظ لکھ کر کتاب مکمل کی اور 14 اپریل سے خاکے لکھنا شروع کر دیے۔ سب سے پہلے اپنے پرائمری اسکول کے استاد کو یاد کیا، پھر اسکول کے ہم جماعت کی یاد آئی، پھر علی گڑھ اور دہلی کے اساتذہ اور دوستوں کو یاد کیا۔"[2]

اس مجموعے میں منشی چھٹن، منٹو سرکل، قاضی عبدالستار، قمر رئیس، تنویر احمد علوی، گوپی چند نارگ، عنوان چشتی، حیات اللہ انصاری، عصمت چغتائی، محمد عتیق صدیق، عینی آپا، محمد زماں آزردہ، ایڈوکیٹ اے رحمان، علی احمد فاطمی، پیغام آفاقی، اسلم حنیف، جلال انجم، فاروق بخشی، ارتضی کریم، شمس تبریزی، خواجہ محمد اکرام الدین، محمد کاظم، عظیم صدیقی، نعیم انیس اور محمد اشرف کے خاکے شامل ہیں۔ ابن کنول نے اپنے اساتذہ کے خاکے بڑی ہی عقیدت مندی سے تحریر کیے ہیں۔ مصنف نے اس مجموعے کا پہلا خاکہ آرٹ اور ریاضی کے استاد 'منشی چھٹن' پر تحریر کیا ہے۔ اس خاکے میں انھوں نے قصبہ گنور، اردو میڈیم اسلامیہ اسکول اور دیگر اساتذہ کی دلچسپ یادیں قارئین کے سامنے پیش کی ہیں۔ اس خاکے میں انھوں نے بچپن کی بہت سی یادوں کو قلم بند کیا ہے۔ ماضی کی یادوں کے اوراق پلٹتے ہوئے ابن کنول قارئین کو اس زمانے میں لے جاتے ہیں جہاں صداقت اور سچائی کا غلبہ تھا۔ انھوں نے اپنے استاد کی شخصیت کو ایک خوبصورت رنگ دے کر ابھارا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنے ایک اور استاد قاضی عبدالستار کا بھی خاکہ قلم بند کیا ہے۔ جس میں ان کا سراپا اس قدر پیش کیا ہے جیسے کسی بادشاہ کی آمد ہو۔ اس خاکے میں ابن کنول نے نہایت دلکش انداز میں اپنے افسانہ نگار بننے کی کہانی بیان کی ہے۔ اس خاکے کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ابن کنول نے باقاعدہ قاضی عبدالستار سے افسانے لکھنے کا ہنر سیکھا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے ایک اور استاد قمر رئیس کا خاکہ لکھا جو اس مجموعے کا سب سے طویل خاکہ ہے۔ یہ خاکہ 19 صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ سوانحی نوعیت کا خاکہ ہے۔ جس میں ابن کنول نے اپنے استاد سے متعلق بیشتر واقعات کو قلم بند کیا ہے۔ اس خاکے میں مصنف نے اپنے استاد کی اس عام شخصیت سے قاری کو روبرو قرار دیا جو ایک بڑے انسان میں چھپی ہوئی ہوتی ہے۔ اس خاکے کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت بھی آشکار ہوتی ہے کہ دہلی یونیورسٹی میں پروفیسر ابن کنول کی شخصیت کی تعمیر، ذہنی تربیت، اور روزمرہ زندگی کے انتظامات جیسے، دال روٹی اور گوشت بوٹی کے بندوبست میں قمر رئیس کا نمایاں کردار رہا ہے۔ ابن کنول نے قمر رئیس کے خاکے میں ان کے کئی یادگار واقعات قلم بند کیے ہیں، جن سے ان کی طلبہ سے محبت اور ان کے لیے خلوص کا اندازہ ہوتا ہے۔ قمر رئیس، کمیونسٹ نظریات کے حامی ہونے کے باوجود دین اور یاد الٰہی سے کبھی دور نہیں رہے۔ 1986 میں ترقی پسند تحریک کی گولڈن جوبلی تقریبات کو کامیاب بنانے میں قمر رئیس کا مرکزی کردار تھا۔ بن کنول نے قمر رئیس کی باوقار شخصیت کو قلم کے ذریعے یوں اجاگر کیا ہے کہ قاری ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو نہایت قریب سے محسوس کر سکتا ہے۔ مصنف قمر رئیس کی شخصیت کو یوں بیان کرتے ہیں:

"قمر صاحب کی شخصیت بہت پر کشش تھی۔ دلیپ کمار کی طرح خوب صورت پٹھان تھے، دراز قد، نکھرتا رنگ، چمک دار مسکراتی آنکھیں، پیشانی پر لہراتے سیاہ بال، جنھیں تھوڑی تھوڑی دیر میں انگلیوں سے اوپر کرتے، خاموش رہتے تو صوفیانہ استغراق، بولتے تو بلبل کی سی چہچہاٹ۔ علی گڑھ میں مجھے قاضی صاحب کی سرپرستی حاصل تھی، دہلی میں قمر رئیس جیسا شفیق انسان مل گیا۔"[3]

اپنے دوسرے اساتذہ میں گوپی چند نارگ کا خاکہ بھی انھوں نے پیش کیا، مصنف نے اس خاکے میں اپنے قلم سے مختلف رنگ ابھارنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے بعد عصمت چغتائی کا خاکہ ایک مختصر انداز لیے ہوئے ہے۔ جس میں عصمت چغتائی سے چند ملاقاتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر تنویر احمد علوی کے خاکے میں ان کی ذہانت اور دانش وبینش کو اپنے شاندار انداز میں پیش کیا ہے۔ اس مجموعے کا ایک اور اہم خاکہ اردو ادب کی مشہور و معروف فکشن نگار قرۃ العین حیدر کا ہے۔ جو بہ عنوان 'عینی آپا' کے نام سے درج ہے۔ عینی آپا بہت کم لوگوں سے ملنا پسند کرتی تھیں کچھ مزاج ہی ایسا تھا اور علم وادب کے مطالعہ میں محو رہتی تھیں۔ عینی آپا دوٹوک بات کرنے والی خاتون تھی۔ اس خاکہ میں قرۃ العین حیدر کی پوری شخصیت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ اس میں مصنف نے نہ صرف ان کی خوبیاں بلکہ خامیوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ اس خاکہ میں ابن کنول نے نہ صرف قرۃ العین حیدر کی شخصیت کے پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے بلکہ ان کے مزاج کے پہلوؤں کو بھی پیش کیا۔ مصنف اس حوالے سے لکھتے ہیں:

"عینی آپا وہ نہیں تھی جو لوگ سوچتے تھے۔ وہ ایک سچی فنکار تھیں۔ 'شیشے کے گھر' میں بیٹھ کر 'دلربا' انداز میں 'چائے کے باغ' سے لائی ہوئی چائے پیتیں اور 'پت جھڑ کی آواز' کو نظر انداز کرتے ہوئے 'ستاروں سے آگے'، 'روشنی کی رفتار' دیکھ کر یہ کہتی ہوئی رخصت ہو گئیں 'اگلے جنم موہے بیٹا نہ کیجو'۔ عینی آپا مغرور عورت نہیں تھیں، جب کہ ان کے پاس وہ سب کچھ تھا جو کسی کے اندر غرور پیدا کر سکتا ہے۔"[4]

ابن کنول نے اس مجموعے میں اپنے کئی دوست و احباب کے خاکے بھی قلم بند کیے ہیں جن میں فاروق بخشی، علی احمد فاطمی، پیغام آفاقی، ارتضیٰ کریم وغیرہ کے خاکے اہم ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ نئے دور کی ادبی شخصیات بھی اس مجموعے میں نظر آتی ہیں جن میں خواجہ اکرام الدین، محمد کاظم، عظیم صدیقی، نعیم انیس اور محمد اشرف قابل ذکر ہیں۔ ابن کنول بخوبی جانتے ہیں کہ کہاں کس طرح سے کیسے قاری سے مخاطب کروانا ہے اسی لیے اپنے دوستوں کا بیان اس خوبی اور لطف اندوز طریقے سے کرتے ہیں کہ ایک خوشنما ماحول پیدا ہو جاتا ہے۔ 'کچھ شگفتگی کچھ سنجیدگی' میں ابن کنول نے جن بھی اشخاص کا خاکہ لکھا ہے ان کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ جہاں ان کی خوبیوں کو قلم بند کیا وہیں ان کی خامیوں کو بھی قلم بند کرنے سے خود کو نہیں روکا۔ الغرض یہ خاکوں کا مجموعہ ایک معلومات کا خزانہ ہے۔ جس میں مصنف نے عام فہم زبان استعمال کرتے ہوئے اپنی بات نہایت دلکش انداز میں پیش کی ہے۔ جگہ جگہ محاورات اور ضرب الامثال کا برجستہ استعمال تحریر کو مزید پر اثر بناتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کے ذریعے خاکوں میں رنگارنگی اور تنوع پیدا کیا گیا ہے جو قاری کی دلچسپی کو برقرار رکھتا ہے۔ واقعات و منظر نگاری میں جزئیات نگاری کا خوبصورت استعمال کیا گیا ہے جو اس تحریر کو حقیقت کے قریب اور دلکش بنا دیتا ہے۔

سفر کرنا انسانی جبلت کا ایک اہم پہلو ہے۔ تاریخ کے آغاز سے ہی انسان فطرتاً متجسس رہا ہے اور نئی جگہوں کو دیکھنے، دریافت کرنے اور مختلف تجربات حاصل کرنے کی خواہش رکھتا ہے۔ یہ جبلت نہ صرف انسان کی بقا کے لیے ضروری تھی، بلکہ اس نے تہذیبوں کے ارتقا اور دنیا کے مختلف حصوں کو آپس میں جوڑنے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ سفرنامہ ایک ادبی صنف ہے جس میں مصنف اپنے سفر کے دوران دیکھے گئے مناظر، پیش آنے والے واقعات، اور محسوس کیے گئے تجربات کو تفصیل سے قلمبند کرتا ہے۔ یہ صرف ذاتی مشاہدات اور تاثرات کا بیان ہی نہیں ہوتا بلکہ قارئین کے لیے معلوماتی اور دلچسپ انداز میں سفر کی روداد پیش کرتا ہے۔ ایک کامیاب سفرنامہ پڑھنے والے کو یوں محسوس کراتا ہے جیسے وہ خود مصنف کے ساتھ اس سفر میں شریک ہو اور تمام مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہو۔

ابن کنول اردو ادب کے مشہور اور منفرد سفرنامہ نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کا اندازِ تحریر منفرد، دلچسپ، اور فکری گہرائی سے بھرپور ہے۔ ابن کنول کے سفرنامے محض مقامات کی تفصیلات فراہم کرنے تک محدود نہیں رہتے بلکہ ان میں سماجی، ثقافتی، اور تاریخی پہلوؤں کا بھرپور تذکرہ ملتا ہے۔ ابن کنول اپنے سفرناموں میں جن معاشرتوں اور ثقافتوں کو دیکھتے ہیں، ان کا باریک بینی سے مشاہدہ کرتے ہیں اور ان کی تفصیلات کو قاری کے سامنے ایک کہانی کی طرح پیش کرتے ہیں۔ ان کی زبان رواں، ادبی اور دلکش ہے، جو قاری کو ابتدا سے لے کر آخر تک باندھے رکھتی ہے۔

ان کے جملے نہایت سادہ لیکن اثر انگیز ہوتے ہیں۔ ان کے سفرنامے قاری کو نہ صرف مقام کی سیر کراتے ہیں بلکہ سوچنے پر مجبور بھی کرتے ہیں۔ وہ مقامات کی تاریخ، وہاں کے لوگوں کی زندگی اور ان کے رویے پر بھی گہری روشنی ڈالتے ہیں۔ ابن کنول کے سفرناموں میں ہلکا پھلکا مزاح اور دلچسپ کہانیاں موجود ہیں، جو ان کی تحریر کو مزید پرکشش بناتی ہیں۔ ابن کنول کے سفرنامے محض سیاحت کی داستانیں نہیں بلکہ وہ ایک ادیب کے فکری تجربات، مشاہدات، اور تاثرات کے عکاس ہیں۔ ان کے سفرنامے قاری کو ایک نئی دنیا سے روشناس کراتے ہیں اور ادب کے ذریعے دنیا کو دیکھنے کا نیا زاویہ فراہم کرتے ہیں۔ ''چار کھونٹ'' ابن کنول کا ایک مشہور سفرنامہ ہے جو ان کی تخلیقی مہارت، مشاہداتی گہرائی، اور ادبی طرزِ تحریر کا شاندار نمونہ ہے۔ اس سفرنامے کا عنوان خود اشارہ کرتا ہے کہ یہ محض ایک جغرافیائی سفر نہیں بلکہ زندگی کے مختلف پہلوؤں، انسانوں کی تہذیب و ثقافت، اور دنیا کے متنوع رنگوں کی کھوج پر مبنی ہے۔ 'چار کھونٹ' میں ابن کنول نے اپنے مختلف اسفار کو قلمبند کرتے ہوئے دنیا کے کئی خطوں کی سیر کو ایک کتاب میں یکجا کیا ہے۔ کتاب کا آغاز حج بیت اللہ کے مقدس سفر سے ہوتا ہے، جس میں ان کے روحانی تجربات اور تاثرات شامل ہیں۔ اس کے بعد آٹھ مختلف ممالک کے اسفار کا ذکر ہے، جن میں سعودی عرب، امریکہ، ماریشس، پاکستان، متحدہ عرب امارات، ماسکو، اور ازبکستان شامل ہیں۔ پاکستان کے سفر کو انھوں نے خاص اہمیت دی ہے اور اس ملک کا دو مرتبہ سفر کیا۔ پہلی بار انھوں نے فیصل آباد کا دورہ کیا، جبکہ دوسری بار تاریخی شہر پشاور کا سفر کیا، جو اپنی منفرد ثقافت اور تاریخ کے لیے مشہور ہے۔ کتاب کے آخری باب میں ہندوستان کے مختلف علاقوں کے سفر کا حال پیش کیا گیا ہے، جس میں ان کی نظر ان خطوں کی ثقافت، تاریخ اور لوگوں کے طرزِ زندگی پر مرکوز رہی ہے۔ 'چار کھونٹ' محض ایک جغرافیائی سفر کی داستان نہیں بلکہ مختلف ممالک اور علاقوں کے سماجی، ثقافتی اور روحانی پہلوؤں کی عکاسی بھی ہے۔ پروفیسر محمد زماں آزردہ اس سفرنامے کے بارے میں لکھتے ہیں:

''چار کھونٹ ابن کنول کے اس سفرنامہ پر مشتمل ہے جو انھوں نے سفرِ حج کے علاوہ محض ادبی اجتماعات میں شمولیت کرنے اور اپنے اہل خانہ کو مختلف جگہوں کی سیر و تفریح کرانے کے سلسلے میں کیے ہیں، لیکن اپنے ان سفرناموں کے ذریعے ہمیں یعنی قارئین کو شریک کر کے نہ صرف ہماری معلومات میں اضافہ کیا ہے بلکہ ان کی اپنی شخصیت کے مختلف گوشے اس طرح واضح ہوئے ہیں کہ سامنے نظر آنے والا ابن کنول آنکھوں سے اوجھل ہو کے ایک قد آور، دور دور تک اپنا سایہ پھیلانے والا اور مختلف رنگوں کی روشنیوں کو اپنے اندر جذب کرنے والا ایک محیر العقل ذی روح کا سامنا کرا دیتا ہے۔''[5]

'چار کھونٹ' کا دوسرا سفرنامہ امریکہ کے سفر کی روداد پر مبنی ہے اور پروفیسر ابن کنول کا یہ پہلا سفرنامہ ہے جو مکمل طور پر سیاحتی نقطہ نظر سے اہمیت رکھتا ہے۔ اردو انسٹی ٹیوٹ آف کیلیفورنیا کی خصوصی دعوت پر پروفیسر ابن کنول 22 مئی 2001 سے 18 جون 2001 تک امریکہ میں مقیم رہے اس سفرنامے میں ابن کنول

نے سفر کی ابتدا سے لے کر واپسی تک کے تمام پہلوؤں کو بڑی خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے۔ ان کی نگاہ امریکی معاشرت، سماجی زندگی، اور تاریخی پس منظر پر گہری رہی، جس سے قاری کو امریکہ کی تہذیب وتمدن کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ انھوں نے کھانے کی اقسام، بازاروں کی رونق، اور امریکی گھروں کی سجاوٹ جیسے چھوٹے لیکن دلچسپ موضوعات کو بھی اپنی تحریر کا حصہ بنایا۔ انھوں نے امریکی طرز معاشرت اور ہندوستانی طرز زندگی کا تقابل کرتے ہوئے دونوں کی نمایاں خصوصیات کو اجاگر کیا ہے۔ خاص طور پر انھوں نے امریکی زندگی میں تکلف کی عدم موجودگی، گھروں کی سادگی، کھانے کے اوقات میں عجلت پسندی، اور اقدار پر سختی سے عمل کرنے کی روایات کا ذکر کیا ہے۔

ابن کنول کے تیسرے سفر کا عنوان خوبصورت اور رنگین ملک ماریشس ہے، ماریشس کا پہلا سفر انھوں نے ا اگست 2003 تا 8 اگست 2003 میں کیا۔ اس کے بعد 2010، 2011، 2012 میں پھر سے وہاں کا رخ کیا۔ انھوں نے اس سفر میں ماریشس کی تہذیب وثقافت، اسلام اور ہندومت کے امتزاج، مقامی طرزِ زندگی، مہمان نوازی، گنے کی کاشت، شوگر کی بیماری کے پھیلاؤ، انگریزی کے بجائے فرانسیسی زبان کی مقبولیت، لباس وخوراک، اور مقامی جغرافیہ پر روشنی ڈالی۔ اس کے علاوہ، ابن کنول نے ماریشس کی جامعات، میوزیم، اسلامی طرزِ تعمیر، اندرا گاندھی سینٹر، ہندوستانی مہاجرین اور ہندوستانی مطالعات کے مرکز کا ذکر بھی اپنے سفرنامے میں کیا ہے۔ انھوں نے موسمی تغیرات اور اس خطے کے حسن کو نہایت منفرد انداز میں بیان کیا۔ ان کے اس سفرنامے میں نہ صرف قدرتی مناظر کی عکاسی ہوتی ہے بلکہ تاریخ اور تحقیق کی جھلک بھی نمایاں نظر آتی ہے۔ ماریشس کے اس سفر میں انھوں نے ایک سیاح کی نظر سے اس ملک کو دیکھا اور اس کی تاریخ وسماجی زندگی کو بھی بیان کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا یہ سفرنامہ نہ صرف معلوماتی ہے بلکہ تاریخی نوعیت کے اعتبار سے بھی اہم بن جاتا ہے۔ ابن کنول ماریشس کی خوبصورتی کو یوں بیان کرتے ہیں:

''کہتے ہیں ماریشس زمین کا سب سے خوبصورت جزیرہ ہے۔ مشہور مصنف مارک ٹوئن نے کہا کہ'' خدا نے پہلے ماریشس کو تخلیق کیا اور پھر ماریشس کی شکل میں جنت تخلیق کی۔'' لازم ہے ایک مصنف کی بات پر دوسرا مصنف اخلاقاً یقین کرے، چاہے مبالغہ ہی ہو، بس ہم نے اس کے دعوے پر نہیں ماریشس کی خوبصورتی پر یقین کرلیا کہ واقعی خوبصورت قدرتی نظاروں سے ماریشس بھرا ہوا ہے۔''[6]

'چارکھونٹ' کے اہم سفرناموں میں انگلینڈ کا سفرنامہ ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔ یہ سفر انھوں 4 اکتوبر سے 14 اکتوبر 2003 تک لندن اردو اکاڈمی کی طرف سے ملے دعوت نامے پر کیا۔ لندن کا یہ سفر ایک ادبی نوعیت کا تھا، جس میں ملک کے کئی دیگر اردو ادب کے ماہرین بھی ان کے ہمراہ تھے اس سفر میں پروفیسر ابن کنول نے ایک ادیب اور سیاح دونوں کی حیثیت سے اپنے تجربات ومشاہدات پیش کیے ہیں۔ انھوں نے انگلینڈ کو نہ صرف علمی وادبی نظریے سے دیکھا بلکہ اس کی ترقیات کو بھی قریب سے سمجھنے کی کوشش کی۔ اس سفرنامے میں ان کے مشاہدات دوسرے سفرناموں سے مختلف اور نمایاں نظر آتے ہیں۔ اس سفر میں انھوں نے انگریزوں کے ہندوستان میں قیام اور لندن کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بیان کیا۔ لندن کا حال بھی کچھ امریکہ جیسا ہی نظر آیا۔ وہاں کی ترقی، جدید طرز زندگی، اور اردو زبان کے حالات کا ذکر کیا۔ خاص طور پر، وہاں کے اردو کے شیدائیوں کا حال، جو پردیس میں رہ کر اردو زبان وادب کی خدمت کررہے ہیں، بڑی خوبصورتی سے بیان کیا گیا۔ لندن کے طرزِ زندگی، عمارتوں کے حسن، اور پنجاب ودہلی جیسی جھلکوں کا ذکر ان کے تحریری اسلوب میں نمایاں ہے۔ برٹش میوزیم کی تاریخ، ٹاور برج اور لندن ٹاور کے مناظر، انسانی محنت کے عظیم شاہکار، سینٹ پال گرجا کے بدلتے رنگ، اور لندن کی مصروف زندگی کو انھوں نے اپنے منفرد ادبی انداز میں اجاگر کیا ہے۔

پروفیسر ابن کنول نے اپنے آخری بیرون ملک سفر کا بیان ازبکستان کے حوالے سے کیا ہے۔ یہ سفر انھوں نے مئی 2019 میں کیا ہے۔ یہ سفر بھی ادبی نوعیت کا تھا، اور پروفیسر ابن کنول نے اس پر تفصیل سے لکھا ہے۔ ان کے اس سفرنامے کو پڑھ کر قاری ازبکستان کی حسین وادیوں، دیومالائی کہانیوں اور اس کی اسلامی تاریخ سے واقفیت حاصل کر سکتا ہے۔ پروفیسر ابن کنول نے ازبکستان کی فطری خوبصورتی اور اس کے تاریخی ورثے کو ایک ادبی اسلوب میں اس طرح پیش کیا کہ قاری ایک نیا تجربہ اور گہری بصیرت حاصل کرتا ہے۔ آخر میں پروفیسر ابن کنول نے 'سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا' کے نام سے اپنے ملک کے مختلف شہروں اور مشہور مقامات کا ذکر کیا ہے، جو عام طور پر لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔ ان مقامات کا تذکرہ کرتے ہوئے، پروفیسر ابن کنول نے دکھایا کہ ہمارے اپنے ملک میں بھی ایسے کئی عجیب و غریب اور دلکش مقامات ہیں جن کے بارے میں عام لوگ بے خبر ہیں۔

مجموعی طور پر 'چارکھونٹ' کے حوالے سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس میں شامل سفرنامے مختلف ممالک کی سماجی، سیاسی، تہذیبی، علمی وادبی زندگی سے قاری کو روشناس کراتے ہیں۔ پروفیسر ابن کنول نے ان سفرناموں میں نہ صرف مختلف ممالک کے ثقافتی اور سماجی پہلوؤں کو بیان کیا ہے، بلکہ ان کی تاریخ، ترقی اور وہاں کی اہم شخصیات کی جیتی جاگتی تصاویر بھی پیش کی ہیں۔ پروفیسر ابن کنول کا سفرنامہ قاری کو ایک ایسی دنیا میں لے جاتا ہے جہاں سے واپسی بہت تکلیف دہ محسوس ہوتی ہے۔ ان کا اندازِ بیان اتنا دلچسپ ہے کہ کتاب کے آخری صفحات تک پہنچتے پہنچتے قاری کو یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ یہ سفر شاید کبھی ختم نہ ہوگا۔ یہ سفرنامے دورِ حاضر میں تو اپنی اہمیت رکھتے ہی ہیں لیکن آنے والے زمانے میں بھی ان کی دستاویزی حیثیت بھی مسلم رہے گی، کیونکہ ان میں نہ صرف ایک سیاح کے تجربات ہیں بلکہ عالمی سطح پر مختلف ممالک کے حالات وواقعات کی گہری بصیرت بھی موجود ہے، جو مستقبل کے لیے ایک قیمتی ورثہ ثابت ہوگی۔

حواشی

1 اردو ریسرچ جرنل، ابن کنول نمبر، مارچ، 2023، ص 70
2 کچھ شگفتگی کچھ سنجیدگی، ابن کنول، کتابی دنیا، دہلی، 2021، ص 9
3 ایضاً، ص 42
4 ایضاً، ص 215
5 چارکھونٹ، ابن کنول، کتابی دنیا، دہلی، 2022، ص 10
6 ایضاً، ص 93

■

Amir Abbas
Research Scholar, Dept of Urdu
Kashmir University- 190006 (J & K)
Mob.:7006737397
aamirabasslone621@gmail.com

تبصرہ و تعارف

تبصرہ نگاری ادبی تنقید ہی کی ایک شکل ہے جس میں کتاب کے مواد، اسلوب اور معیار کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ کتاب کے مالہ و ماعلیہ اور دیگر جزئیات کے حوالے سے قارئین کو بہت قیمتی معلومات عطا کی جاتی ہیں۔ اردو میں تبصرہ نگاری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت رہی ہے، خاص طور پر قدیم مجلّات نے مطبوعات جدیدہ کے تعارف کا جو سلسلہ قائم کیا تھا وہ بہت ہی مفید تھا۔ تبصرہ بہت ذمے داری کا کام ہے اس لیے مبصرین کو چاہیے کہ وہ کتابوں کے انتخاب میں بھی اپنے اعلیٰ ذوق کا ثبوت دیں اور تبصرہ کرتے وقت غیر ضروری تمہید، افراط وتفریط، بے معنی تحسین اور بے جا تنقید سے گریز کر کے کتاب کے اہم اور افادی نکات کی نشاندہی کریں۔ اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی یا دیگر زبانوں میں اردو زبان و ادب سے متعلق جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان پر بھی آپ تبصرے بھیجیں تو بہتر ہوگا۔

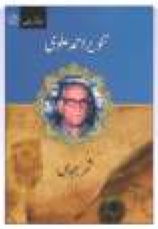

تنویر احمد علوی

مصنف: ثمر جہاں

صفحات: 170، قیمت: 120 روپے، سنہ اشاعت: 2025

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: پروفیسر اختر الواسع

مال روڈ، ارون وہار، وارڈ نمبر 8، سیکٹر 29، نوئیڈا

ممتاز نقاد، محقق، مترجم اور شاعر و ادیب ڈاکٹر تنویر احمد علوی بیک وقت کئی زبانوں پر دسترس رکھتے تھے، بالخصوص کلاسیکی فارسی اور ہندی زبان پر ان کو عبور حاصل تھا۔ تاریخ، تہذیب، تصوف، اسلامیات، ہندی ادبیات، جغرافیہ، اور مذاہب کی علمی بصیرت نے ان کی شخصیت کو عظمت عطا کی، جس سے ان کی تخلیقات میں معنویت کا رنگ اور گہرا ہوگیا۔ وہ حافظ قرآن تھے، اساطیر، داستان، مثنوی، قصیدہ، مرثیہ، رباعی اور قطعات تاریخ سے شغف رکھتے تھے اور سنگ تراشی و خطاطی ان کی توجہ کا خاص مرکز تھی۔

علوی صاحب نے قدیم اردو، فارسی، پنجابی اور عربی شاعری کے ساتھ ساتھ مشرقیات سے خوب واقفیت بہم پہنچائی تھی لیکن اردو زبان و ادب سے ان کو جنون کی حد تک عشق تھا۔ یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ انھوں نے پی ایچ ڈی خاقانی ہند ابراہیم ذوق پر کی اور اس میں ایک خاص بات یہ ہے کہ علوی صاحب کی طرح ذوق کا تعلق بھی مظفر نگر سے تھا۔ دونوں نے دہلی کو اپنا وطن ثانی بنایا اور دہلی کو ٹوٹ کر چاہا۔ انھوں نے کلیات ذوق اور کلیات شاہ نصیر کی تدوین کر کے اردو کی جو خدمت کی، دہلی کے ادبی حلقے اس کے رہین منت ہمیشہ رہیں گے۔ ایک قرض جو دہلی پر تھا، وہ علوی صاحب نے بہ حسن و خوبی اتارا۔ ذوق کے یہاں جو گہرائی ہے وہی گہرائی ہم ان کے یہاں بھی پاتے ہیں۔ لیکن ذوق نے اپنا سارا وقت شاعری پر لگایا جب کہ انھوں نے اپنا وقت دوسری چیزوں کو بھی دیا۔

ڈاکٹر علوی مرحوم نے اردو کی کئی نسلوں کی آبیاری کی، ان کے شاگردوں کی کمی نہیں ہے۔ لیکن عین اسی طرح کہ انھوں نے ذوق پر تحقیقی کام اور کلیات ذوق کی تدوین کر کے اہل دہلی کے سروں سے قرض اتارا تھا، ڈاکٹر ثمر جہاں نے ان کی ادبی شخصیت پر توجہ دے کر قرض اتارا ہے جو ہمارے سروں پر تھا۔ حسن اتفاق یہ بھی ہے کہ یہ نہ تو ان کی شاگردہ ہیں، نہ ان سے کبھی کوئی براہ راست استفادہ کیا۔ حتیٰ کہ بقول ان کے، اُن سے ان کی کبھی کوئی ملاقات بھی نہیں ہوئی۔ یہ ایک خالص علمی و ادبی تعلق، عین قدردانی اور احساس ذمہ داری ہے کہ ان کو اپنا موضوع بنایا اور اس احساس کے تحت ان کی نگارشات کو محفوظ و مدون کرنے اور ان پر قلم اٹھانے کا حوصلہ کیا کہ جس کے شاگردوں اور فیض یافتگان کی تعداد ہزاروں میں ہے، اس کے علمی و ادبی کاموں کا اعتراف اتنا بھی نہیں ہو سکا کہ کسی جریدہ کا کوئی خاص شمارہ ہی دستیاب ہوتا۔ مرحوم کی وفات کے کوئی دس سال بعد اس کا محرک خود ان کی نگارشات کے وہ گوشے بنے جو تاریخ کے شعور سے منور ہیں۔ گویا یہ بھی اپنے وقت کے اس قلندر کی کرامت ہے جس کو ہمارے دوست اور نامور صحافی و مصنف فاروق ارگلی 'اردو ادب کا زندہ پیر' کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ یقیناً ان کے ساتھ یہ سلوک اس لیے ہوا کہ اردو ادب و تنقید میں گروہ بندی اور گروہ سازی کے اس عہد زریں میں وہ کسی حلقہ توصیف باہمی کے رکن نہیں تھے اور بقول ڈاکٹر ثمر جہاں انھوں نے ''ترقی پسند تحریک کا زمانہ دیکھا، جدیدیت اور مابعد جدیت کا دور بھی دیکھا، ان کی ابتدائی نظموں میں ترقی پسند تحریک کا اثر دیکھا جا سکتا ہے لیکن وہ تحقیق کے راستے پر گامزن ہوئے تو ہمیشہ معروضی طریقے کو اپنایا'' اور ''ان کی قلندرانہ طبیعت نے کبھی شہرت کی خواہش نہیں کی۔ ترقی اردو بیورو کے لیے اردو کی اہم لغت 'نوراللغات' (چار جلدوں) کی تصحیح کا کام برسوں محنت سے کیا۔ سینٹرل ہندی ڈائریکٹوریٹ کے لیے 'فارسی لغت بنائی، رسالہ صاحبیہ اور مجمع البحرین (فارسی) کا اردو میں ترجمہ کیا

جو رسائل کی زینت بنا لیکن وہ کبھی کتابی صورت میں منظر عام پر نہیں آیا۔‘‘

تنویر احمد علوی کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ انھوں نے ہندوستانی لوک ادب کی اہم ترین صنف بارہ ماسہ کا بڑا وقیع مطالعہ پیش کیا اور اردو کے بارہ ماسوں پر جو کام کیا ہے وہ غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ ان کی تحقیق وتلاش کے نتیجے میں اردو کے متعدد بارہ ماسے محفوظ ہو گئے۔ اسی طرح ان کے ادبی سفر کا آغاز ذوق پر کام کرنے سے ہوا، اور کلیات ذوق ان کا ایک بہت اہم کام ہے جو علوی صاحب نے شائع کی۔ ’مکتوبات عالیہ‘ ہوں یا ’صحیفہ ابرار‘ علم وادب کے قدردانوں کے لیے ان کے بیش قیمت تحفے ہیں جو علوی صاحب نے ان کو پیش کیے۔

تنویر احمد علوی صاحب کو گرچہ وہ نہیں ملا، جو ان کو ملنا چاہیے تھا اور جس کے وہ اپنے معاصرین میں اوروں سے زیادہ مستحق تھے۔ لیکن یہ خوشی کی بات ہے اور مبارکباد کی مستحق ہیں ڈاکٹر ثمر جہاں اور قومی اردو کونسل جنھوں نے زیر نظر مونوگراف تیار کیا اور اس کو اہل علم ادب تک پہنچایا۔ یہ مختصر تعارف نامہ ایک دستاویزی کتاب ہے جو اردو کی نئی نسل کو ان سے متعارف کرانے میں اہم کردار ادا کرے گا۔ اس کتاب میں ان کی منتخب تخلیقات ونگارشات بھی شامل ہیں۔ ان کے جو تنقیدی محاکے ہیں، وہ بھی پڑھنے کے قابل ہیں۔ مصنفہ نے اس مختصر کتاب میں ان کی منتخب تحریروں کو جس طرح جمع کر دیا ہے، اس کی جتنی قدر کی جائے کم ہے۔ مثال کے طور پر اس انتخاب میں شامل نظم ’قلوپطرہ‘ قاری کے ذوق کو ایسا متاثر کرتی ہے کہ سماعت و بصارت دونوں حیران رہ جائیں۔ نہایت کاریگری سے کسی سنگتراش کی طرح تراشے گئے چھوٹے چھوٹے مصرعے ایک ساتھ مجسمہ سازی، موسیقی اور نغمہ سنجی ہر جہت سے محظوظ کرتے ہیں۔ ایک بے نظیر تخلیق ہے اور یہی حال اس انتخاب میں شامل ان کی ہر تحریر کا ہے۔ یہ فکر وفن کا جادو بھی ہے اور انتخاب کا ہنر بھی جس نے کوزے میں دریا سمو دیا۔

ڈاکٹر ثمر جہاں کا تعلق دہلی سے ہے۔ وہ تدریس کے شعبے سے وابستہ ہیں اور ڈائریکٹوریٹ آف ایجوکیشن میں لکچرر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہی ہیں۔ تنویر احمد علوی کی علمی وادبی خدمات سے گہری دلچسپی رکھتی ہیں۔ وہ اس سے قبل ’تنویر احمد علوی کا جہان معانی‘ کے عنوان سے دو جلدوں میں ان کے 67 مقالات کا مجموعہ پیش کر چکی ہیں۔ مرحوم کی غیر مطبوعہ تصنیف ’نشانات نور‘ کو بھی انھوں نے مرتب کیا ہے۔ یقین ہے کہ زیر نظر کتاب تنویر احمد علوی کی کثیر الجہات شخصیت کو سمجھنے میں ادب کے طالب علموں اور اساتذہ کے لیے مددگار و مفید ثابت ہوگی۔ ہم اس کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، وزارت تعلیم، حکومت ہند اور ڈاکٹر ثمر جہاں کے شکرگزار ہیں۔

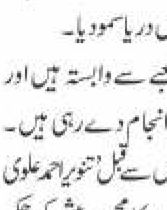

ٹیگور بتیسی (ٹیگور کے بتیس افسانوں کا انتخاب)

مصنف: رابندر ناتھ ٹیگور، مترجم: شبیر احمد

صفحات: 510، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2025

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: فیضان الحق، بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی

زیر تبصرہ کتاب رابندر ناتھ ٹیگور کے بتیس افسانوں کے انتخاب اور ترجمے پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب میری نظر میں تین زاویوں سے خاص اہمیت کی حامل ہے۔ اول یہ کہ اس میں ایک ایسے تخلیق کار کی نگارشات پیش کی گئی ہیں، جس نے نہ صرف بنگلہ بلکہ پورے ہندوستانی ادب کو مقام فخر عطا کیا۔ دوسرے یہ کہ یہ نگارشات بنگلہ زبان سے اردو میں منتقل ہو رہی ہیں، جس سے ترجمہ کی فنی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ تیسرے یہ کہ یہ کتاب متعدد کہانیوں میں سے بہترین کہانیوں کا انتخاب ہے اور مصنف کی تحریروں سے متعارف ہونے کا بھرپور موقع فراہم کرتی ہے۔

ٹیگور اب شاید ہی کسی ہندوستانی طالب علم کے لیے اجنبی ہوں۔ ان کی علمی اور تہذیبی شخصیت میں میری دلچسپی اس وقت بڑھی جب میں اپنی پہلی تحقیقی کتاب ’انور عظیم کی ادبی کائنات‘ تصنیف کر رہا تھا۔ انور عظیم نے ٹیگور کے فکر وفلسفہ، شانتی نکیتن اور دیگر متعلقہ موضوعات پر گراں قدر کالم تحریر کیے ہیں۔ وہ بہت جلد کسی سے متاثر نہیں ہوتے تھے، لیکن انھوں نے ٹیگور کے تئیں جس قسم کی عقیدت مندی کا اظہار کیا ہے وہ غیر معمولی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ ٹیگور کی دور اندیشی اور بصیرت تھی، جو مختلف اصناف کے قالب میں ڈھل کر تحریر وتقریر کا حصہ بنی۔ ٹیگور نے زندگی اور معاشرے کو قریب سے نہ صرف دیکھا ہے بلکہ تحریر میں اس کی ترقی و بہتری کا وژن بھی پیش کیا ہے۔ ان کا یہ وژن ادب، آرٹ، مصوری اور دیگر حوالوں سے عوام تک پہنچا اور لوگوں نے اسے قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ زبان کی سطح پر ٹیگور نے بنگلہ زبان کو اتنا ثروت مند بنایا کہ کئی لحاظ سے اسے اولیت کا شرف حاصل ہوا۔ جیسا کہ کتاب کے مترجم جناب شبیر احمد نے مختلف حوالوں سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہندوستان میں افسانے کی داغ بیل ٹیگور نے ہی ڈالی۔ اس اعتبار سے نہ صرف بنگلہ بلکہ پورے ہندوستان کے ادیبوں میں انھیں پہلا کامیاب کہانی کار ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔

ٹیگور کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے بنگلہ زبان میں ان اصناف کو بروئے کار لانے کی کوششیں کیں جن کے متعلق ابھی تک بہت کم سنا یا پڑھا گیا تھا۔ ٹیگور نے نہ صرف افسانے کی داغ بیل ڈالی بلکہ اس فن کو اوج کمال تک بھی لے گئے۔ ان کی کہانیوں کی تعداد سیکڑوں تک پہنچتی ہے، جن میں بعض کہانیاں ایسی ہیں جو کلاسیک کا درجہ اختیار کر چکی ہیں اور بیشتر تعلیمی نصاب کا حصہ ہیں۔ ’کابلی والا‘ جیسی شاہکار کہانی کے ذریعہ ٹیگور بچپن ہی سے ہندوستانی طالب علم کے ذہن ودماغ میں داخل ہو جاتے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ جب بچہ ان کے ناولوں اور گیتوں کا مطالعہ کرتا ہے، راشٹر گان سنتا ہے اور ’گیتانجلی‘ پر ملنے والے نوبیل انعام سے واقف ہوتا ہے تو اس کی نگاہوں میں ٹیگور کی اہمیت دوچند ہو جاتی ہے۔ ٹیگور اپنی فکر اور فلسفہ کے ذریعہ بار بار قارئین کو متاثر کرتے ہیں۔ مترجم نے کتاب کے مقدمے میں نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ ٹیگور کی کہانیاں کسی ایک موضوع یا مسئلے تک محدود نہیں، بلکہ ان میں موضوعات و مسائل کا تنوع نظر آتا ہے۔ ان کے غالب موضوعات میں دیہی زندگی، فطرت کی منظرکشی، عورت کے مسائل، سماجی و ثقافتی تبدیلی، اقدار کی کشمکش، ذات پات، حصول دولت کی سرگرمیاں، اوہام پرستی اور تانیثی افکار بھی شامل ہیں۔ صدیوں پہلے ایسے موضوعات پر اظہار خیال کرنا ٹیگور کی وسعت فکر اور دور اندیشی کی مثال ہے۔ شبیر احمد نے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ ان تمام موضوعات سے متعلق نمائندہ افسانوں کو مجموعے کا حصہ بنایا ہے۔ مجموعے میں شامل نمائندہ افسانوں میں کابلی والا، انجانی سی، مرن مئی، تیاگ، پوسٹ ماسٹر، دولہا دلھن، مہامایا، خزانہ، وارث، گم شدہ موتی، قرض، پاکھنڈ اور کنکال

وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ مترجم نے ان افسانوں کی پیش کش میں تاریخی ترتیب کا خاص خیال رکھا ہے اور اردو کے ساتھ افسانوں کے عنوانات کو بنگلہ میں بھی درج کردیا ہے۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اصل عنوان سے معروف کوئی افسانہ اردو میں آکر غیر مانوس نہیں بنتا اور اصل سے مناسبت وعدم مناسبت کے پہلو بھی نمایاں ہو جاتے ہیں۔

ایسا نہیں کہ اس کتاب کے ذریعہ پہلی دفع ٹیگور کی تخلیقات کو اردو میں منتقل کیا جا رہا ہے۔ دہائیوں قبل بنگلہ ادبیات اور ٹیگور کی تحریریں اردو میں ترجمہ کی جاتی رہی ہیں۔ اس سلسلے میں نیاز فتح پوری (عرض نغمہ)، ابوالحیات بردوانی (اکیس کہانیاں)، سہیل احمد فاروقی، عبدالرحمٰن بجنوری، عبدالعزیز خالد، ظہیر عباس، انور جلال پوری وغیرہ کی کاوشیں بھی قابل داد ہیں۔ تراجم میں ٹیگور کی نثری اور شعری دونوں قسم کی تخلیقات شامل ہیں۔ بعض شعری تخلیقات کا اردو میں منظوم ترجمہ بھی پیش کیا جا چکا ہے۔ لیکن یہ تراجم مکمل ٹیگور شناسی کے لیے کافی نہیں۔ اسی لیے ایسے مزید ترجموں کی ضرورت ہمیشہ محسوس ہوتی ہے۔

'ٹیگور بتیسی' کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ مترجم نے ان افسانوں کو کسی تیسری زبان کے بجائے براہ راست بنگلہ زبان سے اردو میں منتقل کیا ہے۔ اس ترجمے سے بنگلہ زبان پر مترجم کی زبردست قوت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ بطور فکشن نگار شبیر احمد کا نام معروف ہے ہی، لیکن بنگلہ زبان سے کیے گئے ان کے تراجم بھی غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس ضمن میں ان کی کتاب 'بچوں کے رابندرناتھ' بطور مثال پیش کی جا سکتی ہے۔ ان کا حالیہ ترجمہ محض ترجمہ نہیں بلکہ ٹیگور کے افسانوں کے بہترین انتخاب، تجزیاتی مقدمہ اور عمدہ تعارف پر مشتمل ہے۔ فکشن کے اہم ناقد جناب مقصود دانش نے ترجمے کی اہمیت کے حوالے سے کئی اہم نکات کی جانب اشارہ کیا ہے۔ انھوں نے ترجمے میں جس تخلیقیت اور تہذیبی نمائندگی کی بات کی ہے، یہ ترجمہ اس کی تصدیق کرتا ہے۔ ایسے مواقع پر اکثر دوسری زبان کے مسائل حاوی رہتے ہیں، لیکن شبیر احمد کے ترجمے میں یہ دشواری نظر نہیں آتی۔ کلاسیکی متون کے ایسے سلیس اور رواں ترجمے ہر زاویے سے اہم ہیں اور لسانی دیواروں میں محدود علمی خزانوں سے استفادے کی راہ ہموار کرتے ہیں۔

جراحیات عمومی

صفحات: 328، قیمت: 180 روپے، سنہ اشاعت: 2024

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: وسیم اقبال، ابوالفضل، نئی دہلی

طب کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ طب کی ابتدا اس دور سے وابستہ ہے جب انسان تاریخ سازی سے بھی واقف نہیں تھا اور اس کا سراغ محض قیاس پر مبنی تھا۔ برصغیر میں یونانی طب کے نام سے شہرت یافتہ طریقۂ علاج کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ دنیا کا سب سے قدیم نظام طب ہے۔ اس کی تاریخی کڑیاں آٹھ ہزار برس قبل عراق قدیم اور مصر قدیم کی طبی تہذیبوں سے پیوستہ ہیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی طویل عرصے سے طب یونانی کی نصابی کتابوں کی تیاری و اشاعت کے عظیم الشان منصوبہ پر عمل پیرا ہے۔ زیر نظر کتاب بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے جو یونانی میڈیسن پینل کے تحت منظر عام پر آئی ہے۔ اس کتاب میں علم الجراحت سے متعلق معلومات فراہم کی گئی ہے۔ جراحت کو یونانی طب میں ہمیشہ سے ایک مستقل فن کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ جراحت مسلسل اور بتدریج ارتقائی مراحل طے کرتی رہی ہے۔ میڈیکل سائنس بالخصوص جراحت میں ترقی ہوئی اور آلات جراحی بھی اختراع ہوئے۔ اس کتاب میں ایک اہم بحث عضوی پیوندکاری اور جسمانی عمل سے متعلق ہے۔ بطلان افعال کی صورت میں بعض اعضا مثلاً جگر، گردوں کا واحد علاج ان کی فعال عضو سے پیوندکاری ہوتی ہے یعنی کسی دوسرے شخص کا سالم یا درست فعل والا عضو لے کر مریض کے جسم میں مریض عضو کے مقام پر لگایا دجاتا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسیح الملک حکیم اجمل خان کی خواہش تھی کہ طب یونانی میں تحقیق و تجدید کا سلسلہ از سر نو شروع ہو تا کہ یہ طریقہ علاج بھی دوسرے مروج طریقہائے علاج کی طرح عوام کی صحت سے متعلق مسائل کو حل کرنے میں مددگار ثابت ہو سکے۔

'جراحیات عمومی' ایسے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہ کتاب کل 24 ابواب پر مشتمل ہے جس کی تفصیل اس طرح ہے:

باب اول: علم الجراحت کا تاریخی خاکہ (Brief Histor of Surgery)، باب دوم: علاج بالتدبیر اور اس کی سائنسی بنیادیں (Regimintal therapy & Its Scientific Basis)، باب سوم: جروح، زخم (Wounds)، باب چہارم: عدوئی: تعدیہ/چھوت (Infection)، باب پنجم: جراحی کے طریقہ کار میں تعدیہ (Infection in Surgical Procedures)، باب ششم: سیالات بدن و برقیروں کا توازن (Fluid & Electrolyte Balance)، باب ہفتم: نمکیات و ایسڈ-بیس توازن (Electrolyte and acid base balance)، باب ہشتم: جراحت کے مریض کا تغذیہ (Nutrition on Surgical Patient)، باب نہم: صدمہ (Shock)، باب دہم: حرق وسلق، عمل ترقیع و جلدی پیوندکاری (Burn and Scald, Skin Grafting)، باب یازدہم: جریان الدم و انتقال الدم (Haemorrhage & Blood Transfusion)، باب دوازدہم: مجریٰ و ناصور اور اکیاس (Sinus and Fistula & Cysts)، باب سیزدہم: سلعات حمیدہ (Benign tumouss)، باب چہاردہم: طرف اعلیٰ (The Hand)، باب پانزدہم: طرف اسفل (The Foot)، باب شانزدہم: عضوی پیوندکاری اور جسمانی ردعمل (Organ transplantation and body reaction)، باب ہفدہم: امراض شریان (Arterial Disoredrs)، باب ہجدہم: امراض عروق (Venous Disoredrs)، باب نوزدہم: عمومی استوائی جراحی امراض (Common Tropical Surgical Problems)، باب بیستم: عنق و فک، غدہ لعابیہ، جوف دہن، بشرہ (Face, Oral Cavity, Salivery Gland, Jaws and Neck)، باب بیست و یکم: صدر (Thorax)، باب بیست و دوم: یونانی ادویہ اور امراض جراحت (Traditional Surgical Medicines)، باب بیست و سوم: تشخیصی شعاعی عکاسی (Diagnostic Radiology and Imaging)، باب بیست و چہارم: طریقۂ کار برائے حجرہ جراحت اور عمل تطہیر (Ot Technique & Sterilization)،

قوی امید ہے یہ کتاب جو مختلف اصحاب قلم کی کاوشوں کی رہین منت ہے۔ نہ صرف درسی ضرورت کی تکمیل کا باعث ہوگی بلکہ اس سے تصنیف و تالیف میں دلچسپی رکھنے والے اطبا و طلبا بھی مستفید ہوں گے۔

تحقیق و تنقید

گلدستوں میں شعرائے اعظم گڑھ اور ان کا نادر کلام

مصنف: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

صفحات: 360، قیمت: 400، سنہ اشاعت: 2025

ناشر: ادبی دائرہ اعظم گڑھ

مبصر: عبدالعلیم اعظمی

شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کا نام شبلیات پر گراں قدر نگارشات کی وجہ سے اہل علم کے درمیان کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ شبلیات کے علاوہ انھوں نے اعظم گڑھ کی تاریخ کو اپنی علمی و تحقیقی کاوشوں کے ذریعہ بہت سے مخفی پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ کسی بھی شخصیت کے مطالعہ کے لیے اس کے عہد اور اس کے خطے کا مطالعہ کرنا ناگزیر ہوتا ہے۔ شبلیات پر تحقیقی کتابوں اور مضامین و مقالات کے ضمن میں ڈاکٹر صاحب نے متعدد ایسے گوشوں اور پہلوؤں پر کثرت سے لکھا ہے جن کا براہ راست تعلق اعظم گڑھ کی تاریخ سے ہے۔ تاریخ اعظم گڑھ کے تعلق سے اگر ڈاکٹر صاحب کی خدمات کا جائزہ لیا جائے، تو اس ضمن میں آپ نے اعظم گڑھ کی تاریخ پر افضال اللہ قادری کے مسودہ کو 'تاریخ اعظم گڑھ' کے نام سے مرتب کر کے شائع کیا۔ 'دارالمصنفین کی تاریخی خدمات' آپ کی گراں قدر تصنیف ہے۔ زیر نظر کتاب اور ایک مضمون سے آپ کی اعظم گڑھ پر دو غیر مطبوعہ کتابوں کا علم ہوتا ہے۔ ایک 'ناموران اعظم گڑھ' دوسری 'تذکرہ مصنفین اعظم گڑھ' ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ اعظم گڑھ کی تاریخ پر آپ کے دسیوں تحقیقی مقالات و مضامین مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوئے ہیں، جن میں سے بعض اب آپ کے مضامین کے مجموعے: عکس و اثر، نقش و اثر اور حرف و اثر وغیرہ کا بھی حصہ بن گئے ہیں۔ یہاں تاریخ اعظم گڑھ کے تعلق سے آپ کی خدمات کا احاطہ کرنا مقصود نہیں ہے؛ بلکہ اس کی ایک جھلک پیش کرنی ہے۔ اسی لیے تفصیلات سے احتراز کرتے ہیں۔ زیر نظر کتاب 'گلدستوں میں شعرائے اعظم گڑھ اور ان کا نادر کلام' تاریخ اعظم گڑھ پر ڈاکٹر صاحب کی ایک اور گراں قدر کاوش ہے، جس سے نہ صرف اعظم گڑھ کے دسیوں گمنام شعرا کے نایاب کلام محفوظ ہوئے ہیں؛ بلکہ متعدد شعرا کا نام اس کتاب سے پہلی مرتبہ منظر عام پر آیا ہے۔

کتاب کے شروع میں 'اعظم گڑھ کے شعری منظر نامہ' پر ایک علمی و تحقیقی مقدمہ ہے۔ جس میں تفصیل کے ساتھ اعظم گڑھ کے شعری منظر نامہ پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ مصنف نے علامہ شبلی اور ان کے اساتذہ سے اعظم گڑھ کی شعری تاریخ کو شروع کیا ہے۔ ہر دور کے اہم شعرا اور ان کے کلام کا نمونہ پیش کیا ہے۔ ''کتاب کے مفصل مقدمہ میں اولاً اعظم گڑھ کے شعری منظر نامے کا اختصار سے ذکر کیا گیا ہے اور دکھایا گیا ہے کہ شعرائے اعظم گڑھ نے ہر دور میں شعر و شاعری سے بھرپور شغف رکھا اور نا مساعد حالات میں بھی داد سخن دیتے رہے۔'' (صفحہ 14) مقدمہ کے آخر میں پندرہ گلدستوں کا تعارف بھی پیش کیا گیا ہے۔ ''یہاں اس بات کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اردو کے سوا دنیا کی کسی زبان میں گلدستوں کا وجود نہیں پایا جاتا ہے۔ اس انفرادیت کے باوجود گلدستوں پر اب تک کوئی علمی و تحقیقی کام نظر سے نہیں گزرا ہے۔ لہٰذا الگ الگ شہروں کے گلدستوں کا مطالعہ، ان کا انتخاب اور ان میں شامل شعرا کا تذکرہ بھی مستقل طور پر لکھا جانا چاہیے۔ تصنیف و تالیف بالخصوص جامعات میں تحقیقی مقالات کے لیے یہ ایک بے حد اہمیت کا حامل موضوع تحقیق ہے۔ امید ہے جامعات کے اساتذہ اس جانب توجہ فرمائیں گے۔'' (14)

اصل کتاب 64 صفحہ سے شروع ہوتی ہے۔ پہلا تذکرہ آز قاضی احمد کوثر یا پاری کا اور آخری تذکرہ یتیم اعظمی نورالدین کا ہے۔ اس میں مصنف کا اسلوب اور منہج یہ ہے کہ پہلے شاعر کی شخصی زندگی اور شعری خصوصیات پر اختصار مگر جامعیت کے ساتھ روشنی ڈالتے ہیں، پھر گلدستوں سے ان کی نایاب غزلوں اور اشعار کو نقل کرتے ہیں۔ اس مجموعہ میں اعظم گڑھ کے 94 قدیم و جدید شعرا کا نادر و نایاب کلام شامل کیا گیا ہے۔ جن میں چار سو سے زائد غزلیں ہیں۔ متعدد شعرا کے صرف ایک دو اشعار شامل ہیں، اسی طرح بہت سے شعرا کے حالات تلاش بسیار کے باوجود نہیں مل سکے۔ نام و تخلص کے ساتھ صرف ان کا شعر نقل کر دیا گیا ہے۔ اس کتاب میں شامل شعرا کے کلام اور ان کے عہد پر روشنی ڈالتے ہوئے فاضل مصنف لکھتے ہیں:

''اس کتاب میں شعرائے اعظم گڑھ کا جو کلام یکجا کیا گیا ہے اس کا غالب حصہ اردو شعر و شاعری کے ایک قدیم طرز سخن کا نمونہ اور کلاسک کا درجہ رکھتا ہے۔ اب جدید اردو شاعری اور اس کی ترقیوں نے گو اس رنگ کہن کو پھیکا بلکہ مٹا دیا ہے، لیکن قدیم شعر و ادب بالخصوص غزلیہ شاعری کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے اور اس کے شیدائیوں کے لیے اب بھی اس میں لطف و لذت کا بہت کچھ سامان موجود ہے۔ کم از کم عہد گزشتہ کے شعر و ادب بازخوانی کے لطف سے تو کسی طور انکار نہیں کیا جا سکتا ہے... اس مجموعہ میں شامل تخلیقات کا دورانیہ ایک صدی کے عرصہ کو محیط ہوتا ہے۔ گویا یہ کتاب اعظم گڑھ کے شعرا کی تقریباً ایک صدی کی سخنوری کی اجمالی داستان ہے... امید ہے شعر و سخن بالخصوص اعظم گڑھ کے شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ کتاب ایک قیمتی سوغات ثابت ہوگی۔''

اعظم گڑھ کی شعری تاریخ پر یہ ایک تحقیقی کتاب ہے؛ اگر چہ اس سے قبل اعظم گڑھ کی شعری تاریخ پر مولانا قمر الزماں مبارک پوری نے تفصیل سے لکھا ہے؛ لیکن اس کتاب نے شعری تاریخ میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ گلدستوں کی دبیز جلدوں سے سینکڑوں غزلوں اور اشعار کو جمع کر کے اعظم گڑھ کے شعرا کے ایک قیمتی ذخیرہ کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا ہے۔ اس کتاب کے ذریعہ متعدد شعرا کے نام اور ان کے کلام کا پہلی مرتبہ علم ہوتا ہے۔ اس کتاب میں متعدد مشہور و معروف شعرا کے کلام بھی درج کیے گئے ہیں؛ لیکن اس میں بھی خاص بات یہ رہی ہے کہ یہ وہ کلام ہے جو رسائل و جرائد کی دبیز جلدوں میں موجود تھا۔ ان شخصیات کی شہرت کے باوجود یہ کلام نایاب تھا۔ بلاشبہ یہ ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ کتاب ادبی دائرہ اعظم گڑھ سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

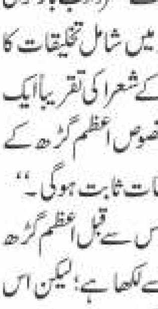

ادب کے تفہیمی زاویے

مصنف: امتیاز احمد

صفحات: 360، قیمت: 500 روپے، سنہ اشاعت: 2025

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: عامر مظفر بٹ، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

زیر تبصرہ کتاب 'ادب کے تفہیمی زاویے' امتیاز احمد کی تصنیف کردہ کتاب ہے۔

اردو ادب کی تنقیدی روایت میں گہرائی اور وسعت کی جو ضرورت روز بہ روز محسوس کی جارہی ہے، امتیاز احمد کی کتاب 'ادب کے تفہیمی زاویے' اسی فکری تقاضے کو پورا کرنے کی ایک سنجیدہ اور اہم کوشش کے طور پر سامنے آتی ہے۔ یہ کتاب نہ صرف اپنے موضوعات کے تنوع کے سبب اہم ہے بلکہ اس کی علمی گہرائی اور تحقیقی وسعت بھی اسے اردو ادب کے سنجیدہ مطالعے کے زمرے میں ایک نمایاں مقام عطا کرتی ہے۔ مصنف نے خود پیش گفتار تحریر کی ہے۔ جب کہ معروف نقاد حقانی القاسمی کی تحریر کردہ تبریک کتاب کی علمی و فکری قدر و منزلت کو مزید مستحکم کرتی ہے۔

یہ کتاب دراصل مختلف تحقیقی و تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے، جو اردو نثر و نظم کی اصناف، زبان کے نظریات، ادبی تنقید کے رجحانات، اور تہذیبی و ثقافتی مطالعات جیسے اہم موضوعات کا احاطہ کرتی ہے۔ اس کا اسلوب علمی، تحقیقی اور معروضی نوعیت کا ہے، جس میں مصنف نے ہر مضمون میں نہ صرف تاریخی پس منظر پر روشنی ڈالی ہے بلکہ فنی اور نظریاتی تجزیے کے تقاضوں کو بھی بخوبی نبھایا ہے۔ کتاب کو تین بڑے حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے جن میں منثورات، منظومات، اور ادبی تصورات و نظریات شامل ہیں، اور ہر حصہ اردو ادب کے ایک وسیع دائرے کا احاطہ کرتا ہے۔

پہلے حصے میں شامل مضامین اردو نثر کے مختلف پہلوؤں پر مبنی ہیں۔ داستان کی شعریات پر تحریر مضمون میں مصنف نے داستان کو محض بیانیہ صنف نہیں بلکہ ایک فنی و شعری عمل کے طور پر دیکھا ہے، جس میں استعاراتی زبان، کردار نگاری، اور بیانیہ کی گہرائیوں پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ اسی تسلسل میں اردو داستان کی تہذیبی معنویت پر بات کرتے ہوئے مصنف نے اس صنف کو محض تفریحی ادب نہیں بلکہ ایک ثقافتی و سماجی دستاویز کے طور پر پیش کیا ہے، جو تہذیب و اقدار کا آئینہ دار ہے۔ اردو داستان کی روایت پر مختصر مگر جامع جائزہ پیش کرتے ہوئے امتیاز احمد نے اس صنف کے ارتقا، نمایاں مصنفین اور تنقیدی میلانات کو متوازن انداز میں بیان کیا ہے۔

ناول، خاکہ نگاری، سوانح عمری، سفرنامہ، اور غیر افسانوی ادب پر لکھے گئے مضامین میں مصنف نے ان اصناف کی فنی، اسلوبیاتی، اور تہذیبی جہات کو موضوع بنایا ہے۔ خاص طور پر اردو سوانح نگاری پر مضمون میں انھوں نے اسے محض سوانحی معلومات نہیں بلکہ تہذیبی شعور کے حامل بیانیے کے طور پر پیش کیا ہے۔ اردو خاکہ نگاری اور عوامی ذرائع ابلاغ پر تحریر مضمون عصر حاضر کے تناظر میں خاص اہمیت رکھتا ہے، جس میں زبان، اسلوب، اور ابلاغ کے نئے ذرائع کے اثرات کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

کتاب کے دوسرے حصے میں شاعری سے متعلق اصناف کا مطالعہ شامل ہے۔ اردو قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، غزل، اور جدید نظم جیسے موضوعات پر مصنف نے صنفی شناخت، فنی امتیازات، اور موضوعاتی جہات کو تحقیقی انداز میں پیش کیا ہے۔ اردو قصیدے کی صنفی شناخت اور اس کی فنی ساخت جیسے تشبیب، مدح، دعا وغیرہ پر عالمانہ تبصرہ کیا گیا ہے، جب کہ مثنوی کو ایک بیانیہ صنف کے طور پر دیکھتے ہوئے اس کی جمالیاتی و فکری جہات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اردو مرثیہ اور خاص طور پر شخصی مرثیہ پر لکھے گئے مضامین اس صنف کو صرف ایک ماتمی روایت تک محدود نہیں رکھتے بلکہ اسے فکری و تہذیبی مظہر کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ اردو غزل کو جذباتی اظہار کی حد سے نکال کر اس کی فکری اساس، اسلوبیاتی رموز، اور خیال بندی کے پیرائے میں پرکھا گیا ہے۔ جدید نظم پر تحریر مضمون میں فیض، راشد، اور میراجی جیسے شعرا کے کلام کے ذریعے اس صنف کی فنی و فکری خصوصیات کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔

کتاب کا تیسرا حصہ زبان، نظریات، اور ادبی مفاہیم پر مبنی ہے۔ اردو زبان کے آغاز کے مختلف نظریات کو لسانی، تاریخی، اور سماجی تناظر میں پرکھتے ہوئے مصنف نے گہرائی سے تجزیہ کیا ہے۔ تذکروں میں موجود تنقیدی میلانات کو دریافت کرنے والا مضمون اردو تنقید کے ابتدائی نقوش کو سمجھنے کے لیے نہایت اہم ہے۔ تہذیب کے مفہوم، اس کے ادبی اثرات، اور بنیادی عناصر کو زیر بحث لاتے ہوئے مصنف نے تہذیب کو ادبی تنقید کا ایک اہم حوالہ بنایا ہے۔ مخطوطہ شناسی، تحقیق کے اصول، اور محقق کی ذمہ داریوں پر مضمون تحقیقی عمل کے لیے رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ کلاسکیت کے مغربی و مشرقی تصورات کا تقابلی جائزہ لیتے ہوئے مصنف نے فنی و جمالیاتی اقدار کا فرق اور ان کی معنویت کو خوبصورتی سے واضح کیا ہے۔ شعریات کے عنوان پر تحریر مضمون ادب کے لسانی، ہیئتی، اور معنوی پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے، جس میں ارسطو سے جدید لسانیاتی نظریات تک کی فکری روایت شامل ہے۔

امتیاز احمد کی یہ کتاب اردو ادب کے محققین، اساتذہ، طلبہ، اور عام سنجیدہ قارئین کے لیے ایک قیمتی سرمایہ ہے۔ اس کی سب سے نمایاں خوبی موضوعات کا تنوع، تحقیقی گہرائی، اور نظریاتی وسعت ہے۔ کتاب کی زبان علمی لیکن رواں ہے، اور اسلوب میں توضیحی وضاحت کے ساتھ ساتھ فکری استناد بھی شامل ہے۔ مصنف نے کلاسیکی ادب، جدید رجحانات، اور ثقافتی تناظرات کو باہم مربوط کرتے ہوئے ایک متوازن تحقیقی فضا قائم کی ہے۔

مجموعی طور پر 'ادب کے تفہیمی زاویے' نہ صرف اردو ادب کے فہم میں گہرائی پیدا کرتی ہے بلکہ تحقیق و تنقید کے نئے در بھی وا کرتی ہے۔ یہ تصنیف اردو ادب کے ان طلبہ کے لیے ایک رہنما کتاب کی حیثیت رکھتی ہے جو ادب کو صرف ایک مطالعے کی چیز نہیں بلکہ فکری اور تہذیبی شعور کے طور پر دیکھتے ہیں۔

شاعری

تالاب (نظموں کا مجموعہ)

شاعر: نیاز جیراجپوری

صفحات: 176، قیمت: 350 روپے، سنہ اشاعت: 2025

رابطہ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی۔ 110002

مبصر: ڈاکٹر منور حسن کمال

N-93، فورتھ فلور، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ 25

نیاز جیراجپوری کی نظموں کا تازہ مجموعہ 'تالاب' ہے۔ اس مجموعے میں جو نظمیں شامل ہیں، ان میں اردو زبان، میں اردو ہوں، ذکر اردو، فکر اردو اور عدسۂ اردو اس جانب اشارہ کر رہے ہیں کہ انھیں اردو سے کتنی محبت ہے۔ عدسہ اردو کا درج ذیل بند بھی اسی جانب اشارہ کر رہا ہے۔

زندہ باد اے پیار سے بھی پیاری اردو زندہ باد
ذہن و دل پہ چلنے والا تیرا جادو زندہ باد
دل کشی سے بھی تو دلکش، حسن سے بھی تو حسیں
تیرے جلوے تیری رنگت تیری خوشبو زندہ باد

اردو زندہ باد، اردو کا جادو، اردو کی دلکشی، اردو کا حسن، اردو کے جلوے، اردو کی رنگت اور اردو کی خوشبو یہ وہ استعارے ہیں جن کی تشبیہ فوراً دل و دماغ کو اردو کے اوصاف سے جوڑ لیتی ہے اور اس کی ہمہ جہتی کی جانب اشارے صاف جھلکتے ہیں۔

اسی طرح پیغام آزادی، جشن آزادی، جشن آزادی منائیں، یوم جمہوریہ اور میرے پیارے وطن نظموں میں ملک اور اس کے جمہوری نظام سے نیاز جیراجپوری کی محبت کا پتا چلتا ہے۔ 'پیغام آزادی' میں وہ کہتے ہیں۔

مبارک ہو ہمیں یہ جشن آزادی مبارک ہو
مبارک ہو ہمیں بارش یہ خوشیوں کی وطن والو
خوشی کے گیت گاتی ہیں ہوائیں بھی وطن والو
فضائیں آج ہیں رنگین سی کتنی وطن والو
نظر جس سمت بھی جائے خوشی کے پھول کھل جائیں
چلو ہم ایک ہوجائیں گلے کچھ ایسے مل جائیں

یہ آزادی کا تعین، یہ خوشیوں کی سوغات، خوشیوں کی بارش، خوشبو کے گیت گاتی ہوائیں اور رنگین فضائیں ایسا سماں باندھ رہی ہیں کہ ہر طرف جل ترنگ بجتے محسوس ہوتے ہیں، اور ان رنگینیوں میں ڈوب جانے کو جی چاہتا ہے۔

'جشن آزادی' کا یہ بند بھی دیکھیں۔

بسائیں آج سے آنکھوں میں یہ سپنے وطن والو
نہیں ہے غیر کوئی ہیں سبھی اپنے وطن والو
یہی شانِ وطن بھی ہے یہی پیغام آزادی
منائیں جشن آزادی، منائیں جشن آزادی

دونوں نظموں میں اپنے ہم وطنوں سے ان کی محبت کے نقش بھی روشن نظر آتے ہیں۔ ان کو اس خواہش کا شدت سے احساس ہے کہ وطن سے محبت اور وطن والوں سے محبت دونوں برصغیر ہند کی مٹی سے اٹھے ایسے اجسام ہیں، جن کا آپس میں محبت اور بھائی چارے کے ساتھ رہنا ضروری ہے۔

وہ جس طرح 'عید' کی خوشیاں بانٹتے ہیں اسی طرح 'دیوالی' کی روشنیوں کی تقسیم کے بھی قائل ہیں۔ ان کی نظمیں دیوالی، عید آئی، عید کے دن، ہولی آئی بروز عید بھی اسی میل جول کی زبان میں لکھی گئی ہیں اور ان سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ نیاز جیراجپوری ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب اور اس کے تہواروں کے کس حد تک قائل ہیں۔ جیسے وہ 'دیوالی' میں کہتے ہیں۔

رنگ و روغن سے سجیلے ہوگئے دیوار و در
جو بھی تھے کوڑے کباڑے ہوگئے گھر سے باہر
آگئے برتن نئے کچھ آتے ہی دیوالی کے
ہر طرف پھیلے اجالے خوشیوں اور خوش حالی کے

اسی طرح وہ 'عید کے دن' میں بھی اپنے پورے آہنگ کے ساتھ نظر آتے ہیں۔

نور کا آبشار عید کے دن   ہر گلی لالہ زار عید کے دن
ہر امیر و غریب کے دل میں   رقص کرتی بہار عید کے دن

ان کی شاعری بالخصوص نظمیہ شاعری میں قوم کا درد و کرب اور گرد و نواح کے مسائل صاف نظر آتے ہیں۔ انھیں سماج کے دبے کچلے طبقے مزدور اور اس کی ضرورتوں کا بھی احساس ہے۔ اسی لیے وہ 'آہ! اے مزدور' اور 'مزدور نامہ' منظوم کرتے ہیں اور مزدور کی سخت جانی اور محنت کشی کی طرف ایسے استعارے پیش کرتے ہیں کہ ان کی روشنی دور تک نظر آتی ہے، جیسے 'آہ! اے مزدور' کا انداز دیکھیے۔

آہ! اے مزدور محنت کش، جیالے سخت جاں
خون کے آنسو رلاتی ہے تمھاری داستاں
تم تلاش رزق میں رہتے ہو پیہم گامزن
تم بچھائے اوڑھتے رہتے ہو محنت اور تھکن
گردش حالات سے دوچار ہوتے رہتے ہو
مشکلوں سے برسر پیکار ہوتے رہتے ہو

اسی طرح کی دلکش اور رنگ و آہنگ سے بھرپور نظموں سے انھوں نے 'تالاب' کو سجایا ہے۔ تالاب نام بھی اس جانب ایک خوبصورت استعارہ ہے کہ وہ گاؤں اور قصباتی زندگی سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ امید ہے ان کا یہ مجموعۂ کلام ان کی دیگر کتابوں کی طرح قبول عام کی سند حاصل کرے گا اور وطن کی خوشبو اور مٹی سے محبت کرنے والوں کے دلوں کو روشن کرے گا۔

مونوگراف

قاضی عبدالستار

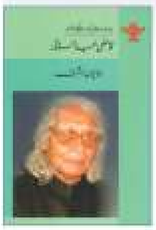

مصنف: ہمایوں اشرف
صفحات: 104، قیمت: 100 روپے، سنہ اشاعت: 2024
ناشر: ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی-110001
مبصر: ڈاکٹر سرور حسین
307، شاہد ادریس انکلیو، پٹنہ- 800014 (بہار)

ہمایوں اشرف اردو کے تنقید نگار ہیں۔ ان کی تنقید کی عمارت حقیقت پسندی پر قائم ہے۔ وہ نہ تو لسان کی بھول بھلیوں میں گم ہو کر فن پارے کی قدر و قیمت کی تلاش کرتے ہیں نہ ہی فنی جمالیات کی کھوج میں مثال پسندی اور ماورائیت کی دنیا کی سیر کرتے ہیں۔ انھوں نے موضوع اور متن کو ہی اپنی تنقید کا معیار بنایا ہے۔ انھوں نے فکشن یا غیر فکشن ہر طرح کے موضوعات کو اپنی تنقید کی کسوٹی پر رکھا ہے۔ ان کی تمیں سے زیادہ کتابیں منظر عام پر آ کر اپنی اہمیت ثابت کر چکی ہیں۔

'قاضی عبدالستار' ان کا حال ہی میں شائع ہونے والا مونوگراف ہے جو ساہتیہ اکادمی کی طرف سے منظر عام پر لایا گیا ہے۔ یہ کتاب 104 صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں انھوں نے قاضی صاحب کی تاریخ پیدائش سے لے کر ان کی تعلیم و تربیت، ملازمت، وضع قطع، شادی، خاندان، ان کی شخصیت اور ان کی تصنیفات کے گونا گوں پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ قاضی صاحب کی تعریف میں انھوں نے کتاب کے 'حرف آغاز' میں لکھا ہے کہ:

''قاضی عبدالستار اردو فکشن کا ایک مستند، معتبر اور باوقار نام ہے۔ انھوں نے ادبی دنیا میں اپنی کہانیوں اور ناولوں کے ذریعہ بے پناہ شہرت و مقبولیت حاصل کی۔ ان کے ناول اور افسانوں کی تہذیبی دنیا بہت وسیع ہے۔ تاریخ، تہذیب، ماحول، سماج اور مختلف طبقات پر ان کا مطالعہ و مشاہدہ بہت گہرا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے جس طبقے اور جس ماحول کی تہذیب اور زبان کا نقشہ کھینچا ہے، ایک حقیقی دنیا آباد کی ہے۔''

وہ آگے لکھتے ہیں کہ:

’’قاضی عبدالستار کے بیشتر افسانوں، ناولوں اور ناولٹوں کا موضوع مشرقی اتر پردیش میں زمینداری اور جاگیرداری کے خاتمے سے پیدا ہونے والے سماجی اور اقتصادی مسائل ہیں۔ تاہم قاضی صاحب نے اس نظام کے ماتحت ایک پوری تہذیبی زندگی اور اس سے وابستہ اقدار و روایت کی پامالی پر اپنے روحانی درد و کرب کو جس فنکارانہ چابکدستی اور زبان و بیان پر محاکمانہ قدرت کے ساتھ حرف و صوت کا جامہ پہنایا ہے، وہ ان کا غیر معمولی کارنامہ ہے۔‘‘

قاضی صاحب کا تعلق ایک زمیندار گھرانے سے تھا۔ چنانچہ ان کی پرورش و پرداخت جس ماحول میں ہوئی اس میں جاگیردارانہ نظام کے گہرے نقوش تھے۔ ان کی زندگی زمیندارانہ عیش و عشرت اور جاہ و جلال کے درمیان گزری۔ یہی وجہ ہے کہ شاہانہ ٹھاٹ باٹ، اکھڑ پن اور جلال انگیزی ان کے مزاج کا حصہ بن گئی۔ لیکن قاضی صاحب محض سخت مزاج، اکھڑ، انا پرست، مغرور اور جاہ و جلال کے حامل نہیں تھے بلکہ ان کے مزاج میں تلخی کے ساتھ ساتھ منکسر المزاجی، نرمی، ہمدردی، غریب پروری، ایمانداری، بے باکی، احسان مندی، نیک نیتی اور خدا ترسی بھی موجود تھی۔ خود انھوں نے لکھا ہے کہ ’’پورا مچھریٹہ گواہ ہے، میں نے آج تک کسی کو ہاتھ نہیں لگایا، کسی غریب کو گالی نہیں دی۔ ہمارے چچا ہمرے مربّی کسی کو بندھوا دیتے تو میں اپنے ہاتھ سے اسے کھولا کرتا تھا اور ان کی طرف سے معافی مانگا کرتا تھا۔‘‘

قاضی صاحب کی بے باکی اور صاف گوئی کا زمانہ معترف ہے۔ ان کی بے باکی ان کی تحریر، تقریر، معاملات، خلوت اور جلوت ہر جگہ نظر آتی ہے۔ ہمایوں اشرف لکھتے ہیں کہ ’’قاضی صاحب کے متعلق یہ بات مشہور ہے کہ وہ کسی کی تعریف مشکل سے ہی کرتے ہیں۔ انھوں نے زندگی بھر اپنی باتوں اور جملوں سے لوگوں کو خفا زیادہ کیا ہے، خوش تو نہیں کے برابر کیا ہے۔ بہت کم ایسے مصنفین ہیں جو ان کی تعریف کے مستحق ٹھہرے۔‘‘

قاضی صاحب کی ادبی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے ہمایوں اشرف نے لکھا ہے کہ قاضی صاحب نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شعر و شاعری سے کیا تھا۔ انھوں نے اسکول کی طالب علمی کے دوران جب وہ آٹھویں کلاس میں تھے تو شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ صہبا تخلص کرتے تھے۔ وہ بابو گرچرن لال شیدا نبی نگری جو اچھے شاعر اور آر ایم پی کالج سیتا پور کے پرنسپل بھی تھے ان سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ لیکن قاضی صاحب اپنی شاعری سے بہت زیادہ خوش نہیں تھے۔ انھیں شاعری سے کوئی خاص رغبت نہیں تھی اس لیے وہ شعر و شاعری سے جلد دست کش ہو گئے اور فکشن کو اپنے نظریات و افکار کی ترجمانی کا وسیلہ بنایا۔

قاضی صاحب نے گزشتہ پانچ دہائیوں کے دوران کئی افسانے لکھے ہیں۔ ان کے معروف و مقبول افسانوں میں پیتل کا گھنٹہ، ٹھاکر دوارہ، رضو باجی، ایک دن، گرم لہو میں غلطاں، نومی، نیا قانون، دھندلے آئینے، لالہ امام بخش، دیوالی، کتابیں، مالکن، نازو، پرچھائیاں، ماڈل ٹاؤن، تحریک، سایہ، سوچ، بلا عنوان، جنگل، مجری، ایک کہانی، سالگی، کھاکھا، روپا، آنکھیں، بھولے بسرے، میراث، آخری چراغ، دو گاؤں، واپسی، قد آدم، مشعل، گیسو، پہلی موت، آڑے ترچھے، آئینے، جشن، داغ دھو لیے گئے، کچھ ایسے، نادرہ، سات سلام، آخری نظر، ملکھا سنگھ، وارث، اور جوتے کا خطبہ کا ذکر آتا ہے۔ تاہم ان میں بھی پیتل کا گھنٹہ، ٹھاکر دوارہ، رضو باجی، ایک دن، ماڈل ٹاؤن، تحریک، سوچ، آنکھیں اور مجری کو امتیاز حاصل ہے۔

قاضی عبدالستار نے تہذیبی اعتبار سے تین طرح کے افسانے لکھے ہیں۔ دیہاتی، شہری اور تاریخی۔ ان افسانوں میں وہ جن موضوعات کو اپنی کہانی کی بنیاد بناتے ہیں اُن کے تہذیبی و تاریخی پس منظر کی کامیاب عکاسی کی ہے۔ خصوصاً تاریخی افسانوں میں وہ جس تاریخ و تہذیب کو پیش کرتے ہیں اس کی ایسی جاندار اور جیتی جاگتی تصویر پیش کرتے ہیں کہ افسانے اور حقیقت کا فرق مٹ جاتا ہے۔

ہمایوں اشرف بنیادی طور پر فکشن کے نقاد مانے جاتے ہیں۔ فکشن پر اُن کی نظر کافی گہری ہے۔ ان کا خیال ہے کہ قاضی عبدالستار قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین کے بعد ابھرنے والے فکشن نگاروں کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کا محبوب موضوع اودھ کے جاگیرداروں کا معاشی اور سیاسی زوال ہے۔ ان کے ناولوں میں مشترکہ تہذیب، ماضی سے جذباتی وابستگی اور زوال پذیر جاگیردارانہ نظام کی تصویر کشی اہمیت رکھتی ہے۔

قاضی صاحب کے ناولوں کو موضوعاتی سطح پر معاشرتی اور تاریخی دو خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ مختصر ناول ہیں جن کا پس منظر جاگیردارانہ تہذیبی فضا ہے جن میں قاضی صاحب نے اودھ کے جاگیرداروں کی بگڑی ہوئی معیشت اور اس صورت میں ان کے حالات کی عکاسی کی ہے اور دوسرے وہ جن میں دارا شکوہ، خالد بن ولید، صلاح الدین ایوبی اور غالب جیسے تاریخی کرداروں کو پیش کیا گیا ہے۔ ہمایوں اشرف کا خیال ہے کہ:

’’ان کے کردار عبرتناک، باوقار، ذہین اور دانشور ہیں۔ ان کے کرداروں میں عمل اور تفکر کا عنصر زیادہ ہے۔ قاضی عبدالستار کے ناولوں میں فضا کی بڑی موثر تشکیل ہوئی ہے۔ انھوں نے منظر نگاری کو کسی علاحدہ عنصر کی طرح استعمال نہیں کیا ہے۔ وہ ماحول کو پیش کرتے ہوئے اسے زندہ اور تابناک بنا دیتے ہیں۔ جس فضا کی بھی عکاسی قاضی صاحب کرتے ہیں وہ زندگی سے بھرپور ہوتی ہے۔ فضا آفرینی میں ان کو مہارت حاصل ہے۔ اس کی مثال ان کے معاشرتی اور تاریخی ناول دونوں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔‘‘

مونوگراف ایک انتہائی مختصر تاریخ ہوتی ہے جو کم سے کم الفاظ میں لکھی جاتی ہے۔ مختصر صفحات میں قاضی صاحب کی پوری زندگی اور خدمات کو سمیٹ دینا ایک معجزہ سے کم نہیں۔ ہمایوں اشرف اتنے کم الفاظ میں قاضی صاحب کی پوری زندگی اور خدمات کو پیش کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں اس کے لیے تعریف کے مستحق ہیں۔

مضامین

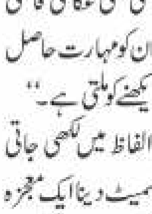

فکر تازہ (مضامین)

مصنف: اشتیاق سعید

صفحات: 200، قیمت: 260 روپے، سنہ اشاعت: 2025

ناشر۔ اشتیاق سعید (مالک، نیوز ٹاؤن پبلشرز)

مبصر: صدر عالم گوہر، 1155، نیو اسلام آباد،

نالا پار بھیونڈی، تھانہ، مہاراشٹر 421302

اشتیاق سعید بنیادی طور پر ایک افسانہ نگار ہیں لیکن گاہے گاہے مضامین پر بھی طبع آزمائی کرتے رہے ہیں۔ زیر نظر کتاب ’فکر تازہ‘ ان کے تازہ مضامین کا مجموعہ ہے۔

جیسا کہ 'اپنی بات اور شکوہ شکایات' میں وہ خود لکھتے ہیں۔ ''بنیادی طور پر تو میں افسانہ نگار ہوں میرے افسانوں کے دو مجموعے 'ٹل جوتا' اور 'حاضر غائب' منظر عام پر آچکے ہیں۔''

جہاں تک مضامین کا سوال ہے تو انھوں نے مضامین منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے لکھنا شروع کیا تھا جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں۔ ''مضامین لکھنے کا آغاز میں نے منہ کا ذائقہ بدلنے کے چکر میں کیا تھا مگر یہ ذائقہ منہ کو لگ ہی گیا اور میں بجائے افسانوں کے مضامین کی دنیا میں الجھتا چلا گیا... بہرکیف اب دوسرا مجموعہ 'فکر تازہ' آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس مجموعے کی اشاعت اتر پردیش اردو اکیڈمی کی مرہون منت ہے مجموعہ میں زیادہ تر مضامین وہ ہیں جنھیں میں نے دوستوں کی وفات پر تحریر کیے ہیں۔''

اشتیاق سعید نے ڈرامے بھی لکھے اور رسائل کے مدیر بھی رہے۔ انھوں نے ادبی ڈائری کا چلن بھی شروع کیا۔ جس کا نام تھا 'خبر مشن ادبی ڈائری'۔ گویا کہ ہمیشہ اپنے آپ کو سرگرم رکھتے ہیں۔

اشتیاق سعید کی تصنیف 'فکر تازہ' متنوع مضامین کا مجموعہ ہے جو قاری کو ادب، فن، فلم، اور شخصیات کی گہری دنیا میں لے جاتا ہے۔ اس کتاب کے صفحات پر پھیلے ہوئے یہ مضامین محض تاثرات یا سرسری تبصرے نہیں بلکہ بصیرت، تحقیق اور فکری گہرائی کا حسین امتزاج ہیں۔

کتاب میں شامل ہر مضمون اپنے موضوع کی پوری روح کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ 'اپنی بات اور شکوہ شکایات' سے آغاز کرتے ہوئے مصنف قاری کو اپنی فکری دنیا میں خوش آمدید کہتا ہے۔ پھر 'فلمی دنیا کی چکاچوند میں سات برس' میں شوکت پردیسی کی یادیں اور فلمی دنیا کی حقیقتیں کھلتی ہیں، جہاں روشنی کے پیچھے چھپی تلخیاں بھی نظر آتی ہیں۔

'ہارون بی اے' اور 'ظفر گورکھپوری' جیسے شخصی خاکے اور ادبی تجزیے نہ صرف شخصیات کے تخلیقی پہلو کو اجاگر کرتے ہیں بلکہ ان کے عہد، مزاج اور فکر کا آئینہ بھی پیش کرتے ہیں۔ کمال جائسی کا مضمون 'زندگی رات ہے، ڈھل جائے گی' اور افتخار امام صدیقی پر لکھا گیا 'زندگی ہے یا موت کی علامت' زندگی کے فلسفے اور فنکارانہ مزاج کے خوبصورت امتزاج کو ظاہر کرتا ہے۔ سلام بن رزاق کے بارے میں 'بیانیہ افسانوں کا بازی گر' مصنف کی افسانوی دنیا کی باریک فہم کو ظاہر کرتا ہے، جب کہ عیش کنول کی علمی و فلمی شخصیت پر لکھا گیا مضمون قاری کو ایک اور جہان میں لے جاتا ہے۔ ایم نسیم اعظمی، احسان سیوانی، کبیر اجمل، خالد جمال جیسے تخلیق کاروں پر مضامین میں ذاتی تاثرات اور تحقیقی بصیرت کی دلکش آمیزش ہے۔ اسی طرح ظفر گورکھپوری کی شاعری اور شخصیت کا تجزیہ ظفر گورکھ پوری کی ادبی روایت کا ایک روشن باب کھول دیتا ہے۔ اسرار گاندھی، حمید ادیبی، وکیل نجیب اور ہنر رسولپوری پر تحریریں اس بات کی گواہ ہیں کہ اشتیاق سعید شخصیات کے فن اور زندگی دونوں پہلوؤں کو یکساں اہمیت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

فکر تازہ کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ یہ قاری کو محض مطالعے کا لطف نہیں دیتا بلکہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ ہر مضمون میں زبان کی شستگی، بیان کی روانی، اور تجزیے کی گہرائی نظر آتی ہے۔ اشتیاق سعید کی یہ کتاب نہ صرف ادب کے طالب علم کے لیے بلکہ فلم، صحافت اور شخصی خاکہ نگاری کے شائقین کے لیے بھی قیمتی تحفہ ہے۔ مختصراً، 'فکر تازہ' ایک فکری و تخلیقی سفر ہے جس میں قاری کو متنوع موضوعات کے سنگم پر لے جا کر اس کی فکری وسعت کو جلا بخشی گئی ہے۔

کتاب شناسی

کھرے کھوٹے (احسن مفتاحی کے تبصرے)

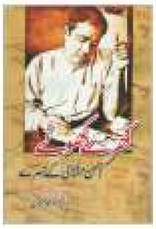

مرتب: ڈاکٹر نوشاد مومن

صفحات: 188، قیمت: 250 روپے

ناشر: مژگاں پبلی کیشنز، احمد ولا، 85 بے، کولکاتا۔ 39

مبصر: عبدالمالک بلندشہری، A-126/5، نزد اشرف مسجد بلاک نمبر 6، شاہین باغ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ 110025

اردو زبان میں تبصرہ نگاری اب باقاعدہ ایک صنف کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ اردو دنیا کے متعدد سرکردہ ادیبوں نے اس صنف کو اپنی جولان گاہ بنایا ہے ان میں ماہر القادری، عبدالماجد دریابادی، عامر عثمانی، شمس الرحمٰن فاروقی کے تبصرے زبان و بیان اور تحقیق و تنقید کے اعتبار سے زیادہ اہمیت کے حامل ہیں پیش نظر کتاب 'کھرے کھوٹے' بھی اسی سلسلہ کی اہم کڑی ہے، ڈاکٹر نوشاد مومن نے اس کتاب میں بڑے حسن و خوبی کے ساتھ احسن مفتاحی کے جاندار اور پرمغز تبصروں کو جمع کر دیا ہے۔

احسن مفتاحی اردو کے معروف صحافی و ادیب اور مدرسہ مفتاح العلوم سے فارغ التحصیل اردو، عربی، فارسی اور دینیات کے معتبر عالم تھے، اردو زبان و ادب سے آپ کا گہرا تعلق تھا آپ نے درس و تدریس کے ساتھ صحافی کی حیثیت سے طویل ترین خدمت انجام دی، اسی طرح سہ ماہی دانش (ہگلی) ہفت روزہ نئی صدی اور روزنامہ اخبار مشرق کے ادارتی امور بھی آپ سے ایک عرصہ وابستہ رہے، آپ کا ادبی مطالعہ اور قلمی خدمات بہت متنوع ہیں البتہ آپ کی ادبی کائنات میں تبصرہ نویسی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

یہ کتاب ایک سو نوے صفحات پر مشتمل ہے، فہرست مشمولات کے بعد ڈاکٹر نوشاد مومن کا انتہائی جاندار مقدمہ ہے اس میں انھوں نے تبصرہ کی روایت کا دلچسپ انداز میں محاکمہ کیا ہے اور اس سلسلہ میں تبصرہ کے معنی و مفہوم، اس کی قسمیں، اس کے اصول و ضوابط، مبصر کی ذمہ داریاں بڑے عالمانہ انداز میں بیان کی ہیں ان کے مقدمہ کی قرات سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اس کی تخلیق و ترتیب میں انتہائی جانفشانی، ژرف نگاہی اور دقت نظر سے کام لیا ہے۔ مقدمہ میں ہی آپ احسن مفتاحی کی تبصرہ نویسی کی خصوصیات و امتیازات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ان کی تبصرہ نگاری کی سب سے نمایاں خصوصیات زبان و بیان کی گرفت اور ان کا برجستہ و بے تکلف انداز ہے ان کے اس انداز تحریر نے صاحبان کتب کو مسرور کم اور خفا زیادہ کیا ہے وہ ادب پاروں کا تجزیہ کرتے ہوئے فن کار کی زبان، اسلوب، مواد کا گہرائی سے جائزہ لیتے ہیں اور اس پر اپنی بے لاگ رائے پیش کرتے ہیں۔''

احسن مفتاحی کے تبصرہ بے باکی اور دیانت داری سے عبارت ہیں، وہ فن پاروں کا انتہائی ایمانداری سے جائزہ لیتے ہیں اور اس سلسلہ میں بے دریغ اور بغیر کسی لاگ لپیٹ کے اپنی رائے پیش کرتے ہیں، ان کے تبصروں سے ان کی تنقیدی بصیرت اور لسانی شعور کا پتہ چلتا ہے۔

ان کے تبصرے زیادہ تر اختصار نویسی کا اعلیٰ نمونہ ہیں اور معیاری زبان، ادبی

اسلوب اور ہر قسم کے ابہام و ژولیدگی سے محفوظ دریا بہ کوزہ کے مصداق ہیں جس سے صاحب کتاب کے فکر و شعور اور اس کی تصنیف کی ایک واضح تصویر قارئین کے سامنے آجاتی ہے۔ زیادہ تر تبصرے شعری کتابوں سے تعلق رکھتے ہیں البتہ نثری کتابوں کی بھی اچھی خاصی تعداد ہے۔

احسن مفتاحی کا اسلوب سلیس، طرز شگفتہ اور زبان معیاری ہے ساتھ ہی اس میں جا بہ جا کاٹ دار اور بے باک انداز بیان کی جھلک بھی نظر آتی ہے چونکہ وہ لسانیات کا بھی گہرا علم رکھتے ہیں اسی وجہ سے اپنے تبصروں میں زبان و بیان کی خامیوں کو بڑی بے باکی سے ضرور اجاگر کرتے ہیں۔''

نمونے کے طور پر چند مثالیں پیش خدمت ہیں:

معصوم مرادآبادی کی کتاب کیا ہوئے وہ لوگ پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ دو جگہ مبتدا خبر کی غلطیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح رنگ شناسائی پر تبصرہ کرتے ہوئے مرتب کتاب احمد زین الدین کی یوں اصلاح کرتے ہیں۔

صفحہ 75 پر لکھتے ہیں: ''کسب نور حاصل کر کے لاحول ولا قوۃ یہ تو وہی بات ہوئی استفادہ حاصل کرکے۔'' اسی طرح سرخ بر سبز کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: ''شکیل احمد خان نے اپنے تحقیقی مقالے میں کیفیات اور یلغار کو مذکر لکھا ہے جو کہ غلط ہے اسی طرح کہیں کہیں کی کے بجائے کیں لکھا ہے۔''

احسان مفتاحی کے تبصرے یوں تو اعتدال و میانہ روی کی عمدہ مثال ہیں لیکن پھر بھی وہ کہیں کہیں مبالغہ آمیز رنگ اختیار کر لیتے ہیں جو کہ ادبی و علمی دنیا میں عیب ہے۔ مثلاً مولانا حکیم زماں حسینی کی سوانح پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جس نے اس کتاب کا مطالعہ نہیں کیا اس نے کچھ نہیں پڑھا۔ ظاہر ہے یہ مبالغہ آمیزی اور مداحی کی بدترین تصویر ہے۔

بلاشبہ ان کے تبصرے محاسن و معائب کا مدلل بیانیہ ہوتے ہیں اور آج کے دور میں جب کہ ہر ادیب و مصنف اپنی تصنیفات کے محض محاسن اجاگر کرنے اور معائب چھپانے کی خواہش رکھتا ہے ایسے میں اس طرح کے غیر جانبدارانہ، معروضی اور مدلل تبصرے نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہیں۔

کتاب کی طباعت دیدہ زیب اور کاغذ عمدہ ہے، سرورق پر احسن مفتاحی کی تصویر بھی ہے جو ان کے نادیدہ قارئین کے لیے کسی خوبصورت سوغات سے کم نہیں۔

مجموعی اعتبار سے احسن مفتاحی کے تبصرے اردو ادب میں ممتاز مقام کے حامل ہیں، کتابی دنیا سے وابستہ لوگوں کو اس سے ضرور فائدہ اٹھانا چاہیے اس سے انھیں زبان و ادب کا علم بھی حاصل ہوگا اور تبصرہ نویسی و تنقید کا شعور بھی ملے گا۔

ہمارے تبصرے

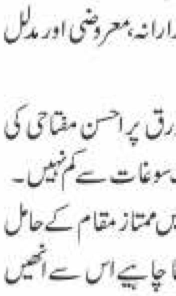

مصنف: ڈاکٹر محمد مظاہر الحق

صفحات: 224، قیمت: 500 روپے، سنہ اشاعت: 2025

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: سعدیہ پروین، استاذ اردو
دکھی رام انٹر کالج، کدوا، ضلع کٹیہار-855154

ڈاکٹر محمد مظاہر الحق کا نام علم و ادب کی دنیا میں درخشاں ستارے کی مانند ہے جس کی تابناکی سے نہ صرف عہد حاضر روشن ہے بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے بھی چراغ منور ہوتا ہے۔

یہ 57 تبصروں کا حسین گلدستہ ہے۔ جیسا کہ انھوں نے 'اور میں مبصر بن گیا' میں لکھا ہے:

''راقم الحروف کا پہلا تبصرہ مریخ جولائی تا اکتوبر 1987 کے شمارے میں شائع ہوا'' اس طرح دیکھا جائے تو تقریباً 38 برسوں کا وقفہ ہوتا ہے۔ اس کتاب میں شامل تبصرے اسی لمبے عرصے میں لکھے گئے ہیں۔ مریخ سے شروع ہوا یہ سلسلہ دراز ہوتا گیا اور موصوف کے متعدد تبصرے قومی سطح کے رسالوں کی زینت بنے۔

کسی بھی ادبی یا غیر ادبی نیز فنون لطیفہ پر مختصر لیکن بصیرت افروز رائے پیش کرنے کے فن کو تبصرہ نگاری کہتے ہیں۔ تبصرہ نگار کا کام تعارفی معلومات فراہم کرنا ہوتا ہے کہ متعلقہ تخلیق یا اشاعت کی علمی، فکری، فنی اور علمی وقعت کیا ہے۔ ایک مستند تبصرہ نگار کی تحریر مختصر، جامع، مدلل اور غیر جانبدار ہونا چاہیے۔

تبصرہ نگاری میں تنقیدی عناصر بھی موجود ہوتے ہیں لیکن اس کا انداز، اسلوب اور مقصد مختلف ہوتا ہے۔ ڈاکٹر محمد مظاہر الحق نے اپنے تبصروں میں مذکورہ بالا تمام باتوں کا خیال رکھا ہے۔ ان کے بیشتر تبصرے مختصر ہیں لیکن انھوں نے جامعیت کا دامن نہیں چھوڑا ہے۔ ان کی تحریر شگفتہ اور دلچسپ ہے جس سے قاری محظوظ ہوئے بنا نہیں رہ سکتا۔ ڈاکٹر ارشاد احمد کی کتاب 'موسیٰ کلیم: شخص اور شاعری' پر تبصرہ کرتے ہوئے موصوف لکھتے ہیں:

''موسیٰ کلیم ایک کثیر الجہات فنکار تھے۔ وہ اردو، ہندی اور بھوجپوری زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ نے ڈرامے، فلمی مکالمے، اسکرین پلے اور گانے بھی لکھے ہیں۔ موسیٰ کلیم کے قومی گیتوں کے دو مجموعے ہندی زبان میں شائع ہوئے مگر اردو زبان میں ان کے کلام کا کوئی مجموعہ ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکا۔ موصوف کو اپنی زندگی میں کلام کی اشاعت کی خواہش ضرور تھی مگر بقول غالب 'ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے'۔ موسیٰ کلیم کی مذکورہ خواہش تو پوری نہ ہو سکی مگر ان کا دم ضرور نکل گیا۔'' (ص 129)

ڈاکٹر محمد مظاہر الحق نے جہاں ایک طرف تحسین آمیز جملوں کا استعمال کیا ہے وہیں کتاب کی فنی، فکری، اور طباعتی تسامحات کی نشاندہی بھی کی ہے۔ لیکن انداز گفتگو میں شدت نہیں بلکہ ہمدردی، اپنائیت اور اصلاح کا جذبہ کارفرما ہے۔ انھوں نے مبتدی قلم کاروں کی بھی خاطر خواہ حوصلہ افزائی کی ہے تاکہ ان کا تعلق قلم و قرطاس سے مضبوط ہو۔ ڈاکٹر محمد مظاہر الحق کی زبان شائستہ، مہذب اور دل کش ہے۔ انھوں نے تنقید برائے تنقید سے گریز کیا ہے۔ پروفیسر محمد علی امام سرہندی کی رباعیوں کا مجموعہ 'رباعیات آہنگ سرہندی' پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد مظاہر الحق شاعر کو نیک مشورے دیتے ہیں:

''مزاح کا معاملہ دو دھاری تلوار پر چلنے کے مترادف ہے۔ ذرا سی چوک سے مزاح رکاکت میں تبدیل ہو سکتا ہے۔ طنز کا معاملہ بھی بڑا نازک ہے۔ ذرا سی چوک سے جسے، طنز کا ہدف بنایا گیا ہے وہ چراغ پا ہو سکتا ہے نوبت ہاتھا پائی کی بھی آ سکتی ہے لیکن پروفیسر محمد علی امام سرہندی، طنز میں مزاح کا پہلو نکال لیتے ہیں۔'' (ص 66)

مجموعی طور پر ڈاکٹر محمد مظاہر الحق کی کتاب 'ہمارے تبصرے' ادبی دنیا میں ایک

قابل قدر اضافہ ہے۔جس میں نہ صرف فنی خوبیوں کا خیال رکھا گیا ہے بلکہ تبصرہ جاتی کتب کی معنویت، افادیت اور پیش کش سے بھی آگاہ کیا گیا ہے۔ مبصر کی زبان، اسلوب نگارش اور فکری وفنی گہرائی وگیرائی متوازن اور پر اثر ہے۔ اگر چہ بعض تبصروں میں تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ وہاں مبصر کو طوالت کا خوف دامن گیر ہو گیا ہو۔ تاہم مجموعی طور پر یہ کتاب مطالعے کے لائق ہے۔

ترتیب

ضیائے تسنیم

مرتب: تنویر رضا برکاتی

صفحات: 196، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: جولائی 2024

ناشر: دارالسرور ایجوکیشن اینڈ ویلفیئر سوسائٹی، برہان پور

مبصر: حارث انصاری

غازی سالار میدان، مومن پورہ برہان پور (ایم پی)

برہان پور جسے گہوارۂ علم وفن کہا جاتا ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں علما، ادبا، فضلا یہاں کی مٹی سے پیدا ہوئے، اسی سرزمین میں پروان چڑھے اور اپنے علم کے جوہر دکھائے۔ کچھ درخشاں ستارے برہان پور کے افق پر نمودار تو ہوئے مگر گردشِ وقت نے ان کا راستہ بدل دیا، پھر بھی وہ علم و ادب کی کہکشاں کے نجم الثاقب ثابت ہوئے، جہاں گئے وہاں اپنی تابانی سے پہچانے گئے۔

اسی سلسلے کی اہم کڑی فرزندِ برہان پور جناب امانت حسین انصاری ہیں جنھیں دنیائے ادب میں تسنیم انصاری کے نام سے جانا جاتا ہے۔ چند سال قبل موصوف ہم سے جدا ہو کر راہی ملک عدم ہوئے۔ کیونکہ آپ کے شاگردوں کا حلقہ کافی وسیع ہے، سب نے اپنے اپنے طریقے سے آپ کو خراجِ عقیدت پیش کیا مگر میرے بچپن کے ساتھی عزیزی تنویر رضا برکاتی کا انداز مجھے کافی پسند آیا۔ موصوف نے شہر و بیرونِ شہر بلکہ بیرونِ ممالک کے ادب نواز افراد سے جناب تسنیم انصاری مرحوم سے متعلق تعزیت کہلوا کر اپنی عقیدت کا اظہار پیش کرنے کی گزارش کی۔ نثر و نظم میں کہے گئے ان ہی تعزیتی کلام اور مضامین کو کتابی شکل میں مرتب کر کے منظر عام پر لایا گیا جو بنام 'ضیائے تسنیم' اس وقت میرے سامنے موجود ہے۔

استاذ الاساتذہ محترم جمیل اصغر صاحب نے ابتدا میں 'ضیائے تسنیم' پر غائرانہ نظر ڈالی ہے۔ آپ نے موصوف کے ادبی کارناموں کو بڑے ہی احسن انداز میں پیش کیا ہے استاد جمیل اصغر کے مضمون کا یہ پیراگراف سند کی حیثیت رکھتا ہے جس میں استاد نے تسنیم انصاری کی زندگی کا احاطہ چند سطور میں کیا ہے آپ اس طرح رقمطراز ہیں:

"تسنیم انصاری کا ابتدائی شعر گوئی کا تعلق برہان پور سے رہا اور درس و تدریس کے سلسلے سے راجے واڑی کوکن منتقل ہونے پر انھوں نے صحافتی میدان میں قدم رکھا اور کوکن کی آواز سے وابستہ ہوئے۔ دیگر وہاں پر اردو اداروں اور انجمنوں کے قیام میں بھی بھرپور عملی حصہ داری کی جس کے مثبت نتائج سامنے آئے، مزید سوشل میڈیا پر واٹس ایپ گروپ پاسبانِ شعر و ادب برہان پور قائم کر کے ایک بڑا حلقہ منظم کیا۔ علمی درسی اور تدریسی حوالے سے اور وابستہ شعرا کی تربیت و اصلاح کے ذریعہ صدہا طلبا فیضیاب ہوئے ان کا یہ علمی سفر شعری و فکری سفر اور صحافتی ذمہ داریوں کی انجام دہی ان کے زندگی کے روشن خطوط ہیں۔"

پیش لفظ میں کتاب کے مرتب جناب تنویر رضا برکاتی نے اس اشاعتی سفر میں پیش آنے والے وہ مسائل ہمارے سامنے رکھے ہیں جو نوکِ قلم سے نکلنے سے پرنٹنگ کے کٹھن مراحل تک انھیں درپیش ہوئے۔ تنویر رضا برکاتی نے ضیائے تسنیم کی اشاعت کے لیے واقعی کئی شاگردان و محبان تسنیم سے گفتگو کی اور انھیں اپنے استاد کی بارگاہ میں خراج پیش کرنے کے لیے آمادہ کیا مگر خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہو سکا اور آخر 'ضیائے تسنیم' کی اشاعت کا بار اکیلا ہی برکاتی نے اپنے مضبوط کاندھوں پر اٹھایا اور اُس کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ دانش غنی صاحب نے اپنے اور تسنیم انصاری کے رشتے کو بہت ہی اچھے انداز میں پیش کیا ہے۔ جناب محمد حسین ضدی نے جس طرح اپنے دوست تسنیم انصاری کی دوستی کا واقعہ بیان کیا ہے، وہ واقعی ایسے شخص تھے جو اپنے دوستوں کے لیے جان دے دے، اسی میں انھوں نے جناب تسنیم انصاری کی غربت کا ذکر بھی کیا ہے۔ اس تعلق سے برہان پور کا ہر چھوٹا بڑا واقف ہے۔ ڈاکٹر اسرار انصاری اور ڈاکٹر وسیم افتخار انصاری نے تسنیم انصاری کی شاعری پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر جلیل الرحمٰن انصاری صاحب نے اپنے استاد کی جدائی کا ماتم کرتے ہوئے بہترین مضمون قلمبند کیا ہے۔ اس کتاب کا دوسرا حصہ جو کہ منظومات پر مشتمل ہے اس میں نو آموز شعرا کے ساتھ ساتھ ہمیں استاد الشعرا کے تعزیتی کلام بھی نظر آتے ہیں۔ جس نے کتاب کے حسن میں چار چاند لگا دیے ہیں۔ چند شعرا جن کے کلام سند کی حیثیت رکھتے ہیں ان میں استاد نعیم اختر خادمی صاحب، استاد شوکت انصاری، استاد ہارون ایاز قادری، استاد فیض خلیقی، استاد نادم اشرفی، پروانہ برہان پوری صاحبان کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ چند اشعار جو یہاں پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

برہان پور کے معروف شاعر شاہد اختر نے آپ کی استادی کو تسلیم کرتے ہوئے کہا ہے۔

کس کو تسلیم کریں علم کا سورج تسنیم
اہلِ دل کس کو کہیں اہلِ زباں تیرے بعد

آپ کی رحلت پر جاوید رانا نے کہا۔

رانا جہاں سے لوٹ کے آتا نہیں کوئی
تسنیم باوفا وہاں پر چلا گیا

یوسف فراز کہتے ہیں۔

نیک خو نیک صفت تھی تری سیرت تسنیم
میری آنکھوں میں بسی ہے تری صورت تسنیم
عدم آباد میں ڈھونڈیں گے تجھے کیسے بتا
فن کے متوالوں کو ہے تیری ضرورت تسنیم

'ضیائے تسنیم' کے مطالعے کے بعد ہمیں تنویر برکاتی اور ان کی ٹیم کی کاوشوں کا اعتراف کرنا پڑے گا موصوف کو اس نمایاں کارنامے پر خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں۔ ■

ماہنامہ 'اردو دنیا' کے خبر نامہ میں پوری اردو دنیا بالخصوص ہندوستان کی ادبی، علمی، ثقافتی سرگرمیوں کی خبریں شائع کی جاتی ہیں۔ یہ محض خبریں نہیں ہیں بلکہ ان کی حیثیت دستاویزی اور حوالہ جاتی ہے۔ ان خبروں سے ہمارے ادبی و ثقافتی تحرک اور تنوع کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور اردو زبان و ادب کی سمت و رفتار کا بھی۔
یہ خبر نامہ ہندوستان بھر سے شائع ہونے والے مختلف اردو اخبارات کے تراشوں سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود بہت ساری ریاستوں اور اضلاع سے خبریں ہمیں نہیں مل پاتی ہیں، اس لیے ادبی ثقافتی تقریبات کے منتظمین سے گزارش ہے کہ اہم ادبی ثقافتی تقریبات اور علمی ادبی شخصیات کی وفات کے تعلق سے خبریں براہِ راست درج ذیل ای میل urduduniyancpul@yahoo.co.in, editor@ncpul.in پر بھجوانے کی زحمت فرمائیں۔

قومی اردو کونسل میں 'ملک کی تعمیر و ترقی میں اساتذہ کا کردار' کے عنوان سے خصوصی لیکچر

نئی دہلی: یوم اساتذہ کی مناسبت سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے صدر دفتر میں 'ملک کی تعمیر و ترقی میں اساتذہ کا کردار' کے موضوع پر خصوصی لیکچر کا اہتمام کیا گیا۔ اس پروگرام کی صدارت پروفیسر اختر الواسع (پروفیسر ایمریٹس، جامعہ ملیہ اسلامیہ) نے کی، جبکہ خصوصی لیکچر پروفیسر جسیم احمد (اعزازی ڈائرکٹر، اے پی ڈی یو ایم ٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ) نے دیا۔

افتتاحی کلمات پیش کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے کہا کہ تعلیم ہی وہ واحد ذریعہ ہے جس سے سماج میں مثبت تبدیلی لائی جاسکتی ہے اور ملک کی تعمیر و ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے یومِ اساتذہ کے پس منظر اور سابق صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر رادھا کرشنن کی زندگی کے ایک اہم واقعے پر روشنی ڈالتے ہوئے اساتذہ کی تعظیم و تکریم پر زور دیا اور کہا کہ اساتذہ کی اصل قدر یہ ہے کہ ان کی تعلیمات اور پیغام کو عملی زندگی میں اتارا جائے۔ یہی اساتذہ کے تئیں حقیقی خراجِ تحسین ہے۔

صدارتی خطاب میں پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ مدرسی ایک ذمے داریوں بھرا پیشہ ہے، کیونکہ طلبہ کی صورت میں پوری قوم کا مستقبل ان کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ وہی اساتذہ ملک کی ترقی میں حقیقی کردار ادا کر سکتے ہیں جو محنت و محبت سے پڑھاتے ہیں اور بھرپور تیاری کے ساتھ تدریسی سرگرمیاں انجام دیتے ہیں۔ انھوں نے طلبہ کی خیر خواہی اور شفقت پر زور دیتے ہوئے ڈاکٹر ذاکر حسین کا قول نقل کیا کہ 'اچھے استاد کی پیشانی پر علم نہیں، محبت کا عنوان ہوتا ہے۔' ساتھ ہی انھوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ اساتذہ کے ساتھ ساتھ سماج کے دیگر دانشوران کو بھی ملک کی ترقی میں حصہ لینا ہوگا، تبھی ہندوستان ترقی یافتہ ممالک کی صف میں شامل ہوسکتا ہے۔

پروفیسر جسیم احمد نے اپنے لیکچر میں کہا کہ اساتذہ ملک کی تعمیر و ترقی میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ ان کے مطابق تعلیم ترقی کی سیڑھی ہے اور جو قوم تعلیم سے غافل ہوجاتی ہے وہ کبھی ترقی نہیں کرسکتی۔ انھوں نے زور دیا کہ اساتذہ بچوں کو تہذیب و تمدن سے آراستہ کریں اور ان کی شخصیت کو تخریبی عناصر سے پاک کریں، تاکہ وہ اپنی توجہ تعلیم اور بہتر مستقبل پر مرکوز رکھ سکیں۔ پروفیسر جسیم احمد نے نئی تعلیمی پالیسی (NEP 2020) کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ موجودہ وقت میں اساتذہ کے لیے لازمی ہے کہ وہ ملٹی ڈسپلنری مہارت رکھتے ہوں تاکہ طلبہ کی بہتر رہنمائی کرسکیں۔

ڈاکٹر کلیم اللہ (آر او، این سی پی یو ایل) کے اظہارِ تشکر کے ساتھ یہ پروگرام اختتام پذیر ہوا۔ اس موقعے پر پروفیسر قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی، پروفیسر شہناز انجم، پروفیسر فاروق بخشی، جناب خورشید عالم، پروفیسر مشتاق عالم قادری، پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی، جناب سراج عظیم اور کونسل کا تمام عملہ موجود رہا۔ پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 4 ستمبر 2025

قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں عربی پینل کی میٹنگ

نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے صدر دفتر میں عربی پینل کی میٹنگ ہوئی جس کی صدارت پروفیسر سید علیم اشرف جائسی (شعبہ عربی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد) نے کی۔ میٹنگ کے آغاز میں کونسل کی اسسٹنٹ ڈائرکٹر (اکیڈمک) ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی نے تمام مہمانوں کا استقبال کیا۔ صدارتی خطاب میں پروفیسر علیم اشرف جائسی نے کہا کہ ہندوستان کی متعدد نامور شخصیات کا ذکر عربی کتابوں میں ملتا ہے، اگر ان کا اردو ترجمہ کیا جائے تو یہ نہایت مفید ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ کونسل کی جانب سے شائع ہونے والی عربی زبان و ادب سے متعلق کتابیں انتہائی اہمیت کی حامل ہیں اور اس نوعیت کی مزید کتابیں شائع کی جانی چاہئیں تاکہ اردو کے ساتھ ساتھ عربی کے طلبہ و اساتذہ بھی استفادہ کرسکیں۔ اس سے قبل قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد شمس اقبال نے افتتاحی کلمات ادا کرتے ہوئے کہا کہ عرب دنیا کے معروف فکشن نگاروں کے منتخب افسانوں کا اردو ترجمہ شائع ہونا چاہیے تاکہ اردو قارئین بھی عربی فکشن اور اس کے امتیازات سے واقف ہوسکیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ عربی زبان کی تاریخ قدیم ہے اور اس پر سنجیدگی سے کام کرنے کی ضرورت ہے تاکہ اس کی مکمل تاریخ ہمارے سامنے آسکے۔ اس موقعے پر پروفیسر نعمان خان نے عربی زبان کی افادیت اور اس کی آفاقی حیثیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ عربی زبان کے اندر دنیا کی علمی، تہذیبی اور ادبی روایت کا قیمتی سرمایہ موجود ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اس علمی سرمائے سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کریں تاکہ آنے والی نسلیں اس ورثے سے فیضیاب ہوں۔ ان کے علاوہ پروفیسر مشیر حسین صدیقی (آن لائن)، پروفیسر مسعود انور علوی (شعبہ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ) پروفیسر محمد قطب الدین (سینٹر آف عربک اینڈ افریقن اسٹڈیز اسکول آف لینگویج، لٹریچر اینڈ کلچر اسٹڈیز، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی)، ڈاکٹر علی نوفل کے (شعبہ عربی، کالیکٹ یونیورسٹی، کالیکٹ، کیرالہ)، ڈاکٹر شمس کمال انجم (آن لائن، صدر شعبہ عربی، بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی، راجوری، جموں اینڈ کشمیر)، ڈاکٹر سرور عالم (صدر شعبہ عربی، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ) اور ڈاکٹر ہیفاء شاکری (شعبہ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ) نے بھی میٹنگ میں اظہار خیال کیا اور مفید مشورے دیے۔ میٹنگ کے دوران ممبران نے اس پینل کے تحت جاری اور مکمل شدہ مختلف پروجیکٹس کی صورت حال کا جائزہ لیا اور ان کے تعلق سے اہم فیصلے لیے گئے۔ اس موقعے پر کونسل سے ڈاکٹر مسرت (ریسرچ آفیسر، اکیڈمک)، نایاب حسن (ریسرچ اسسٹنٹ) اور ڈاکٹر شاداب شمیم (پروجیکٹ اسسٹنٹ) وغیرہ بھی موجود رہے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 15 ستمبر 2025

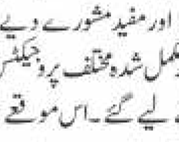

جن کتابوں نے متاثر کیا

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا نیا سلسلہ

ہزاروں کتابوں میں چند ہی کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو آپ کے ذہن و دل کی دنیا بدل دیتی ہیں۔ ایسی کتابوں کی قوت، اہمیت و معنویت کو قارئین سے شیئر کرنے کے لیے 'اردو دنیا' میں ایک نیا سلسلہ شروع کیا گیا ہے جس میں مختلف اصناف پر مشتمل نئی اور پرانی کتابوں کے بارے میں صاحبانِ علم و ہنر یہ بتائیں گے کہ کن کتابوں نے انھیں متاثر کیا ہے۔

صاحبانِ ذوق کتاب کے اسلوب، موضوع اور دیگر تلازمات کے علاوہ یہ بھی بتائیں گے کہ یہ کتابیں کیوں پڑھنی چاہئیں۔ آپ نے ابھی تک جتنی کتابیں پڑھی ہیں ان میں سے چند کا انتخاب کیجیے اور اپنے مطالعاتی سفر میں ان افراد کو بھی شامل کیجیے جن تک شاید ان کتابوں کی رسائی نہیں ہو پاتی ہے۔ منتخب کتابوں کے تعلق سے اپنے منطقی و معروضی خیالات اور تاثرات ہمیں لکھ بھیجیے۔

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

دھلی

جشن آزادی اور اردو زبان: ماضی، حال اور مستقبل

لکھنؤ: اتر پردیش اردو اکادمی کے اشتراک سے مسعودیہ غریب نواز سوسائٹی کے زیر اہتمام یک روزہ سمینار کا انعقاد جشن آزادی اور اردو زبان: ماضی، حال اور مستقبل عنوان کے تحت ہندی سنستھان حضرت گنج میں کیا گیا، سمینار میں بحیثیت مہمان خصوصی الہ آباد ہائی کورٹ لکھنؤ بنچ کے جج جسٹس سید قمر حسن رضوی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ملک کی آزادی میں اردو نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ اردو ہندستان میں پیدا ہوئی اور یہیں پلی بڑھی اور پروان چڑھی اور بعد میں پوری دنیا میں مقبول ہوئی، انھوں نے کہا کہ جنگ آزادی میں اردو کے شعرا اور ادبا نے بڑی قربانیاں پیش کی ہیں، ایرا میڈیکل یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر عباس علی مہدی نے سمینار کی صدارت کرتے ہوئے کہا کہ میری والدہ مجھے بچپن میں اردو کے پڑھنے اور لکھنے پر بہت زور دیتی تھیں۔ نظامت کے فرائض مانو لکھنؤ کیمپس کے ڈاکٹر مسیح الدین خان نے انجام دیے۔ مہمانان اعزازی کی حیثیت سے انٹگرل یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر عقیل احمد نے کہا کہ اردو کی قربانیوں کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے پروفیسر عباس رضا نیر نے کہا کہ جنگ آزادی میں جن ادبا و شعرا نے اپنی قربانیوں کو پیش کیا ہے آج وہ تاریخ کے سنہرے اوراق میں محفوظ ہیں، سمینار میں ڈاکٹر راج کمل گپتا، ڈاکٹر حنا افشاں، ڈاکٹر سیما صدیقی، ڈاکٹر نزہت فاطمہ، اور دہلی یونیورسٹی کے کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر عارف اشتیاق نے اپنے مقالات پیش کیے۔

روزنامہ 'صحافت' 11 اگست 2025

ریسرچ اسکالرز سمینار

نئی دھلی: غالب اکیڈمی نئی دہلی میں ایک ریسرچ اسکالر سمینار کا انعقاد کیا گیا جس میں روہیل کھنڈ کی شمع فاطمہ نے 'پروفیسر قمر رئیس کی شاعری کا تجزیہ' کے عنوان سے مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ قمر رئیس بنیادی طور پر ترقی پسند نقاد تھے لیکن ان کا ایک شعری مجموعہ 'شام نو روز' کے نام سے شائع ہوا اور اس میں ان کی نظمیں اور

غزل شائع ہوئی ہیں جو بہت اہمیت کی حامل ہیں۔ دہلی یونیورسٹی کی انارا بیگم نے 'صادقہ نواب سحر کے فکشن میں تانیثیت'، بریلی سے تشریف لائے محمد اسد نے 'شمیم حنفی کی تنقید اور سوانح'، دہلی یونیورسٹی کے محمد سعود رضا نے 'خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف میں مرثیہ گوئی کی روایت' اور روہیل کھنڈ یونیورسٹی کی شاہین بی نے 'پروفیسر ظفر احمد صدیقی کا تحقیق و تنقید میں مرتبہ' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ اس موقعے پر ثروت عثمانی نے طلبا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ تلفظ کے ساتھ ساتھ پیش کش پر بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے، جبھی آپ کا مقالہ پر کشش ہوگا اور سامعین اسے بغیر سنیں گے۔ پروفیسر شاہینہ تبسم نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ جن شخصیات کو موضوع بنایا گیا ہے وہ بہت اہم ہیں۔ پروفیسر قمر رئیس، پروفیسر شمیم حنفی اور پروفیسر ظفر احمد صدیقی یہ اردو ادب کی قدآور شخصیات ہیں۔ ان پر کام کرنے کے لیے ان کی تحریر کردہ ساری کتابوں کا مطالعہ ضروری ہے اور ان پر لکھے گئے مواد تک رسائی حاصل کرکے تحقیق کے کام کو آسان بنایا جاسکتا ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 31 اگست 2025

اترپردیش

افسانہ ہوئی شام

نئی دھلی: دیش بندھو چترنجن میموریل سوسائٹی اور ونگز کلچرل سوسائٹی کے اشتراک سے 10 اگست، اتوار کی شام چترنجن بھون، چترنجن پارک، نئی دہلی میں ایک یادگار ادبی تقریب بعنوان 'افسانہ ہوئی شام' کا انعقاد ہوا۔ اس تقریب کا مقصد مسرور جہاں کے افسانوی سرمائے کو ڈرامائی قرات کے ذریعے ناظرین تک پہنچانا اور ان کے فن وفکر کو خراج عقیدت پیش کرنا تھا۔ تقریب کا آغاز سائرہ مجتبی کے ایک پُر اثر تعارفی گفتگو سے ہوا، جس میں سامعین کو مسرور جہاں کی زندگی، فن اور ادبی خدمات کا مختصر جائزہ پیش کیا گیا۔ پروگرام میں مختلف اہل قلم، اساتذہ، محققین اور ادب دوست حضرات نے شرکت کی۔

معروف ادیبہ رخشندہ روحی مہدی نے مسرور جہاں کے افسانوی اسلوب اور ان کی تخلیقی انفرادیت پر گفتگو کی۔ انھوں نے کہا کہ مسرور جہاں کے افسانے محض بیانیہ نہیں بلکہ سماجی حقیقت کا ایک آئینہ ہیں، جن میں عورت کے جذبات، اس کی محرومیاں اور اس کے خواب نہایت سچائی کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔ معروف کہانی کار محترمہ سنیتا سنگھ نے مسرور جہاں کا مشہور افسانہ 'لٹیرا' پیش کیا، جو میریٹل ریپ یعنی ازدواجی عصمت دری جیسے حساس اور کم بحث ہونے والے موضوع پر مبنی ہے۔ افسانے کی پیشکش میں جذبات کی شدت، مکالموں کی روانی اور اداکاری کا حسن قابلِ ذکر تھا، جس نے موضوع کی سنگینی کو دوچند کردیا۔ اس کے بعد سائرہ مجتبی نے مسرور جہاں کا افسانہ 'کنجی' پیش کیا۔ مدھومیتا برک نے افسانہ 'کھوئے ہوئے لمحے' پیش کیا۔ یہ افسانہ ایک پردہ نشیں خاتون قلمکار کے جد وجہد کی کہانی بیان کرتا ہے۔ آخر میں معروف تھیٹر آرٹسٹ جناب طارق حمید نے مسرور جہاں کا افسانہ 'جلا وطن' ڈرامائی قرات میں میں پیش کرکے سماں باندھ دیا۔ ان

تمام افسانوں کی قرات میں فنکاروں نے اپنی ادائیگی سے کرداروں کو گویا زندہ کر دیا۔ سامعین نے ہر پیش کش کے بعد پُر جوش تالیوں سے فنکاروں کی حوصلہ افزائی کی۔ تقریب کے اختتام سے قبل ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا اور ڈاکٹر شاہد حبیب نے مسرور جہاں کی شخصیت اور فکر پر مختصر مگر جامع گفتگو کی۔ ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا نے کہا کہ مسرور جہاں محض ایک افسانہ نگار نہیں بلکہ عورت کے دکھ درد اور اس کی جدوجہد کی ترجمان تھیں۔ ڈاکٹر شاہد حبیب نے کہا کہ مسرور جہاں کے افسانے اپنے عہد کے عکاس ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے فن سے سماج کو جھنجھوڑنے کی صلاحیت رکھتی تھیں۔ اس طرح یہ تقریب نہ صرف مسرور جہاں کے فن کو خراج تحسین تھی بلکہ اردو افسانے کے سنجیدہ قارئین کے لیے ایک یادگار اور بامعنی تجربہ بھی ثابت ہوئی۔ سائرہ مجتبیٰ کے کلمات تشکر کے ساتھ مجلس کے اختتام کا اعلان کیا گیا۔

پریس ریلیز: شاہد حبیب فلاحی، نئی دہلی، 11 اگست 2025

احمد شناس: فکر وفن کے روشن چراغ

میرٹھ: جموں و کشمیر کے معتبر شعرا میں احمد شناس کا مقام بڑا اہم ہے۔ ان کے کلام کی خصوصیات کو دو چار جملوں میں ادا نہیں کیا جاسکتا ہے۔ یہ الفاظ تھے معروف ناقد پروفیسر قدوس جاوید کے جو آیوسا اور شعبۂ اردو کے زیر اہتمام منعقد 'احمد شناس' فکر وفن کے روشن چراغ' موضوع پر اپنی تقریر کے دوران ادا کر رہے تھے۔ پروگرام کی سرپرستی معروف ناقد و افسانہ نگار اور صدر شعبۂ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری نے فرمائی اور صدارت کے فرائض معروف ادیب و ناقد پروفیسر صغیر افراہیم نے انجام دیے۔ مہمان خصوصی کے بطور معروف شاعر احمد شناس اور مہمان ذی وقار کے بطور معروف فکشن ناقد پروفیسر قدوس جاوید شریک ہوئے۔ مقالہ نگار کے بطور تحریک ادب کے مدیر ڈاکٹر جاوید انور نے شرکت کی۔ استقبالیہ کلمات ڈاکٹر ارشاد سیانوی اور نظامت کے فرائض عرفان عارف (جموں) نے انجام دیے۔ اس موقعے پر پروفیسر اسلم جمشید پوری نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں خوشی ہے کہ ہم نے ادب نما کا ایک طویل سفر طے کر لیا ہے۔ اس پلیٹ فارم کا مقصد ان نوجوانوں کی مدد ہے جو ادب میں تحقیق وتنقید کے میدان میں کام کر رہے ہیں۔ ان کے راستے میں آنے والی دشواریوں کا حل تلاش کرنا ہی ایوسا کا مقصد ہے۔ مہمان خصوصی احمد شناس نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ شعر وادب کا سفر آسانی سے شروع نہیں ہوتا۔ ظفر اقبال، شہریار، محمد علوی، منیر نیازی وغیرہ میرے پسندیدہ شاعر ہیں۔ اس موقعے پر ڈاکٹر جاوید انور نے احمد شناس کے فکر وفن کے تعلق سے اپنا خوبصورت مقالہ پیش کیا۔ اپنے صدارتی خطبے میں پروفیسر صغیر افراہیم نے کہا کہ احمد شناس جیسے شاعر پر ہم فخر کرتے ہیں جو لفظوں پر قدرت رکھتے ہیں اور ان کا کلام بھی دل پر اثر کرتا ہے۔

روز نامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 29 اگست 2025

اردو شعر وادب میں بنارس

وارانسی: شعبہ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی میں ساہتیہ اکادمی،

نئی دہلی کے اشتراک سے دو روزہ ادبی وشعری پروگرام کے تحت قومی سمپوزیم کا انعقاد کیا گیا؛ جس کی صدارت شعبہ کے صدر پروفیسر آفتاب احمد آفاقی نے کی۔ نظامت کے فرائض شعبہ کے استاد ڈاکٹر مشرف علی نے انجام دیے۔ افتتاحی پروگرام میں کلیدی خطبہ جانکی پرشاد شرما نے پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ بنارس کو کئی حوالوں سے سمجھا جاسکتا ہے۔ مجھے اس بنارس کی تلاش ہے؛ جس کا تذکرہ ادب میں ہے۔ انھوں نے اپنے خطبے میں بنارس کی پوری تاریخ پر تفصیل سے بحث کی۔ ممتاز قلم کار شمیم طارق نے اردو ادب میں کاشی کے تذکرے پر اختصار کے ساتھ گفتگو کی۔ انھوں نے کہا کہ غالب نے 'چراغ دیر' میں بنارس کا ذکر کیا ہے۔ ان کے علاوہ ہدایت اللہ ہدایت، فراق، میراجی، شیر علی افسوس وغیرہ کے یہاں بھی بنارس کا ذکر ملتا ہے۔

ساہتیہ اکادمی کے ہندی ایڈیٹر ڈاکٹر انوپم تیواری نے اس موقعے پر کہا کہ 'اردو شعر وادب میں بنارس' یہ بہت ہی اہم موضوع ہے۔ کاشی کا ادب میں بہت تذکرہ ملتا ہے۔ یہاں ادب کی پوری تاریخ رہی ہے۔ تلسی، کبیر، کالی داس، امیر خسرو، ولی دکنی، غالب، کیدار ناتھ وغیرہ کا اس ضمن میں خاص طور پر ذکر کیا جاسکتا ہے۔ اس موقع پر تعارفی گفتگو کرتے ہوئے چندر بھان خیال نے کہا کہ اس موضوع پر پروگرام کرنے کی دلی خواہش تھی۔ ہم پروفیسر آفتاب احمد آفاقی اور ڈاکٹر مشرف علی کے شکر گزار ہیں کہ انھوں نے ہماری مدد کی۔ انھوں نے کہا کہ بنارس گنگا جمنی تہذیب کا چہرہ ہے۔

صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر آفتاب احمد آفاقی نے کہا کہ سرزمین بنارس کا ذکر اردو شعر وادب میں بکثرت ملتا ہے۔ اردو کے بڑے بڑے شعرا و ادبا نے بنارس کی عظمت کو اپنی تخلیقات میں پیش کیا ہے۔ بنارس کی قدیم روایات کو ہم منظر عام پر لانا چاہتے ہیں۔ تلاش کبیر کتاب ہم لائیں گے۔ تاکہ بنارس کے بارے میں لوگ سمجھ سکیں۔ اظہار تشکر کی رسم ڈاکٹر احسان حسن نے ادا کی۔

پریس ریلیز: افضل حسین مصباحی، شعبۂ اردو، بی ایچ یو، وارانسی، 20 جولائی 2025

مغربی بنگال

اردو صحافت کی موجودہ صورت حال

ہگلی: پوسٹ گریجویٹ اور ریسرچ شعبۂ اردو، ہگلی محسن کالج، بردوان یونیورسٹی نے پچھلے کئی برسوں سے تحقیقات وتنقیدات میں اپنی پیش رفت جاری رکھی ہے اور کئی اہم موضوعات پر بین الاقوامی، قومی اور ریاستی سمینار منعقد کیے ہیں۔ اسی روایت کو جاری رکھتے ہوئے گزشتہ دنوں کالج کے اردو ہال میں 'اردو صحافت کی موجودہ صورت حال' پر ایک روزہ سمینار کا انعقاد ہوا۔ پروگرام کا افتتاح ڈاکٹر پورش اتم پرمانک، پرنسپل، ہگلی محسن کالج کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس موقعے پر انھوں نے شعبۂ اردو کی سرگرمیوں کو سراہتے ہوئے

قومی سمینار کے موضوع کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالی۔ کالج میں شعبۂ اردو کے صدر ڈاکٹر عمر غزالی نے مہمان اعزازی مشہور و معروف صحافی و شاعر ایم جے خالد کی حیات و خدمات پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ پرنسپل ہگلی محسن کالج ڈاکر پورش اتم پر مانک کے ہاتھوں ایم جے خالد کو 'محسن اردو صحافت ایوارڈ 2025' سے نوازا گیا۔ کالج کی طرف سے ایوارڈ دیے جانے پر ایم جے خالد نے شعبۂ اردو کا دل سے شکریہ ادا کیا اور اردو صحافت کی موجودہ صورت حال پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ سمینار کا کلیدی خطبہ ابوذر ہاشمی نے پیش کیا اور اردو صحافت کی موجودہ صورت حال کا تفصیلی جائزہ لیا۔ افتتاحی تقریب کے صدر ڈاکٹر عمر غزالی نے سمینار کے غرض و غایت پر خیالات کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر ارشاد احمد نے نظامت کے فرائض انجام دیے اور آفاق حیدر نے شکریہ ادا کیا۔ پہلے اجلاس کی صدارت ابوذر ہاشمی نے کی۔ اجلاس میں کل چھ مقالہ نگاروں نے اپنے مقالات پیش کیے جن میں چاندنی رحمان نے اپنا مقالہ 'اکیسویں صدی میں زرد اردو صحافت'، نیہا پروین نے 'اردو صحافت اور نئے رجحانات'، شبنم پروین نے 'اردو صحافت پر سوشل میڈیا کے اثرات'، آفاق حیدر نے 'اردو صحافت کی آبیاری میں غیر مسلموں کا کردار'، نور اللہ جاوید نے 'موجودہ دور میں اردو صحافت کے مسائل اور اس کا سد باب' اور ڈاکٹر عمر غزالی نے 'دورِ حاضر میں اردو صحافت کی موجودگی، ایک جائزہ' جیسے اہم عنوانات پر مقالات پیش کیے۔ صدر اجلاس ابوذر ہاشمی نے تمام مقالات کو سراہا اور مقالہ نگاروں کو مفید مشورے سے دیے۔ اجلاس کی نظامت محمد خورشید عالم نے کی اور بشریٰ نشاط نے اظہار تشکر کیا۔ دوسرے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر عمر غزالی نے کی۔ اس اجلاس میں کل سات مقالہ نگاروں نے اپنے مقالات پیش کیے۔ بشریٰ نشاط نے 'الہلال کی روشنی میں عہد حاضر کے حالات'، نغمہ پروین نے 'ڈیجیٹل دور میں اردو صحافت'، 'درخشاں شمیم نے 'موجودہ دور میں اردو صحافت (بنگال کے خصوصی حوالے سے)'، گلشن آرا کا تحریر کردہ مقالہ سید آصف عباس میرزا نے 'کرناٹک میں اردو صحافت'، محمد اظہر الدین نے 'اردو صحافت، عہد حاضر کے مسائل اور مستقبل کے امکانات'، محمد خورشید عالم نے 'اردو صحافت پر جدید ٹکنالوجی کے اثرات' اور ڈاکٹر ارشاد احمد نے 'کلکتے میں اردو صحافت کی موجودہ صورت حال' جیسے اہم موضوعات پر مقالات پیش کیے، جنھیں سامعین نے کافی پسند کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر عمر غزالی نے تمام مقالہ نگاروں کو مبارکباد دی اور ان کی حوصلہ افزائی بھی کی۔ نظامت کے فرائض شبنم پروین نے انجام دیے جب کہ چاندنی رحمان نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 4 ستمبر 2025

اعزاز و اکرام

عالمی یوم اردو ایوارڈز 2025 کا اعلان

نئی دھلی: 15 جولائی 2025 کو عالمی یوم اردو ایوارڈز کمیٹی (زیر اہتمام عالمی یوم اردو منتظمہ کمیٹی) کی ایک اہم میٹنگ زیر صدارت سینئر صحافی جلال الدین،

دریا گنج، نئی دہلی میں منعقد ہوئی۔ ایوارڈز کمیٹی میں ڈاکٹر سیّد احمد خاں کے علاوہ اشرف علی بستوی (چیف ایڈیٹر، ایشیا ٹائمز، نئی دہلی)، سہیل انجم (سابق نامہ نگار وائس آف امریکہ)، جاوید اختر (ایڈیٹر D.W. اردو جرمنی دہلی بیورو) بطور جیوری شامل ہوئے۔ حسب روایت 9 نومبر 2025 کو عالمی یوم اردو کے موقع پر تفویض کیے جانے والے ایوارڈز کا انتخاب عمل میں آیا۔ پروفیسر بلقیس بانو (شعبہ بایوکیمسٹری، فیکلٹی آف لائف سائنسز، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) کو لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ اور ڈاکٹر رؤف خیر (حیدرآباد) کو علامہ محمد اقبال ایوارڈ برائے ادب کے علاوہ پروفیسر کوثر مظہری (جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی) کو مرزا غالب ایوارڈ برائے شاعری، پروفیسر زہرا خاتون (جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی) کو مولانا علی میاں ایوارڈ برائے اردو فارسی زبان، ڈاکٹر عقیل احمد (سکریٹری، غالب اکیڈمی، نئی دہلی) کو مولانا عبدالماجد دریابادی ایوارڈ برائے زبان و ادب، کے ایل نارنگ ساقی (نئی دہلی) کو کنور مہندر سنگھ بیدی ایوارڈ برائے ادب، یاسین مومن (ممبئی) کو قاضی محمد عدیل عباسی ایوارڈ برائے ترویج زبان اردو، سیدہ طلعت نسرین (ٹی این بھارتی، نئی دہلی) کو نور جہاں ثروت ایوارڈ برائے صحافت، سیّد زبیر (مسلم میرر، نئی دہلی) کو مولانا عثمان فارقلیط ایوارڈ برائے صحافت، مولانا عبدالحمید نعمانی (نئی دہلی) کو مولانا ثناء اللہ امرتسری ایوارڈ برائے کالم نویسی، عبدالمنان (ایڈیٹر یوجنا اردو، نئی دہلی) کو مولانا محمد مسلم ایوارڈ برائے صحافت، جمشید خان (آج تک، نئی دہلی) کو امین سیانی ایوارڈ برائے الکٹرانک میڈیا، سوربھ شکلا (ریڈ مائک، نئی دہلی) کو پنڈت دیونرائن پانڈے ایوارڈ برائے صحافت، عابد انور (یو این آئی اردو، نئی دہلی) کو محفوظ الرحمٰن ایوارڈ برائے صحافت، شہرت انصاری (خلیل آباد، یوپی) کو امداد صابری ایوارڈ برائے صحافت، حفیظ الرحمٰن (شارق عدیل، مارہرہ، ضلع ایٹہ، یوپی) کو اسماعیل میرٹھی ایوارڈ برائے شاعری، محمد یامین ذکی (ایڈیٹر ہلال، رامپور) کو ڈاکٹر ذاکر حسین ایوارڈ برائے ادب اطفال، فاروق احمد (دور درشن، دہلی) کو علمت لیسین ایوارڈ برائے فروغ اردو، پروفیسر ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صدیقی (علی گڑھ) کو مظہر الدین خاں ایوارڈ برائے درس و تدریس، ماسٹر اقبال احمد (سابق ہیڈ ماسٹر جامعہ مڈل اسکول، نئی دہلی) کو مقبول احمد صدیقی ایوارڈ برائے بہترین معلم، پروفیسر عبدالمجید محمد صدیق صدیقی (مالیگاؤں) کو مولانا آزاد ایوارڈ برائے قومی یکجہتی، پروفیسر خالد مبشر (جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی) کو حفیظ میرٹھی ایوارڈ برائے نعتیہ شاعری، ڈاکٹر ابراہیم افسر (میرٹھ) کو نصیر الدین ہاشمی ایوارڈ برائے اردو تحقیق، ڈاکٹر عزیر احمد (اسلام پور، مغربی بنگال) کو مولوی عبدالحق ایوارڈ برائے ادب، ڈاکٹر نہال ناظم (مرادآباد) کو ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی ایوارڈ برائے فروغ ادب، ڈاکٹر ابوسعد اثری (جھنڈا نگر، نیپال) کو انڈو نیپال فرینڈشپ ایوارڈ اور ہدایت پبلی کیشنز، نئی دہلی (سیّد ابوالاعلیٰ سبحانی) کو منشی نول کشور ایوارڈ برائے نشر و اشاعت کے لیے منتخب کیا گیا۔ عالمی یوم اردو منتظمہ کمیٹی کے کنوینر ڈاکٹر سیّد احمد خاں نے عالمی یوم اردو ایوارڈز کے لیے منتخب حضرات سے فروغ اردو میں نمایاں کردار نبھانے کی امید ظاہر کی ہے۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر حکیم سید احمد خان، دہلی، 15 جولائی 2025

مسیح الدین خان

لکھنؤ: 14 جولائی لائبریری سائنس کے موجد ڈاکٹر ایس آر رنگناتھن کے نام سے منسوب 'لائبریری اعزاز'

شہرنا گپور سے شائع ہونے والے ماہنامہ قرطاس کے نئے شمارے کا اجرا

افروز تاج کے شعری مجموعہ 'شیش محل' کا اجرا

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی لکھنؤ کیمپس لائبریری سے وابستہ ڈاکٹر مسیح الدین خان کو گذشتہ دنوں اتر پردیش اردو اکادمی کے آڈیٹوریم میں ایک مشاعرے کے پروگرام کے دوران نوازا گیا، جو پروگرام مسعودیہ غریب نواز سوسائٹی کے زیر اہتمام فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی، حکومت اتر پردیش کے اشتراک سے کیا گیا تھا، ویسے اردو کے فروغ میں کتب خانوں کا بہت بڑا کردار رہا ہے، اور کتب خانوں کے ذریعے لوگ مستفید ہوتے رہے ہیں، ان کے پندرہ سال سے کتب خانے کی خدمات کو سراہتے ہوئے ان کو ڈاکٹر رنگا ناتھن لائبریری ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ یہ اعزاز انفارمیشن کے کمشنر محمد ندیم، سکریٹری شوکت علی، کنور باسط علی، ڈاکٹر شاداب عالم کے بدست پیش کیا گیا۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر مسیح الدین خان، لکھنؤ، 14 جولائی 2025

رسم اجرا

تجھے کیا پتہ

آسنسول میونسپل کارپوریشن کی اردو اکیڈمی کے زیر اہتمام معروف شاعر اور ماہر علم وعروض مرحوم تسلیم نیازی کے مجموعہ کلام تجھے کیا پتہ کا اجرا میئر آسنسول میونسپل کارپوریشن واور چیئرمین اردو اکیڈمی بدھان اپادھیائے

کے ہاتھوں کیا گیا۔ اس موقعے پر خطاب کرتے ہوئے بدھان اپادھیائے نے کہا کہ آسنسول ملی جلی تہذیب اور ثقافت کا شہر ہے۔ ہم لوگ یہاں مذہب، رنگ، نسل اور زبان کی تفریق نہیں کرتے۔ ہم لوگ یہاں مل جل کر رہتے ہیں اور ہمارے شہر میں جو جوہر ہیں ان کو منظر عام پر لانا ہماری ذمے داری ہے اور آج تسلیم نیازی کے ادھورے کاموں کو ان کی لخت جگر شاذیہ نیازی نے مکمل کیا ہے یہ قابل مبارک باد ہے۔ ڈپٹی میر و سیکرٹری اردو اکیڈمی وسیم الحق نے کہا کہ تسلیم نیازی جیسے باکمال اور صاحب فن شاعر کی کتاب مرتب کر کے ان کی لخت جگر شاذیہ نیازی نے تاریخ رقم کیا ہے، یہ ایک بڑا کارنامہ ہے۔

اس موقعے پر ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی، ڈاکٹر مشکور عالم معینی، مبارک علی مبارکی، ڈاکٹر صابرہ خاتون حنا، احمد نثار، سید انجم رومان، انجینئر خورشید غنی وغیرہ نے شاذیہ نیازی کی مرتب کردہ کتاب پر اپنے خیالات کا اظہار کیا اور تسلیم نیازی کو ایک بڑا شاعر قرار دیا۔ جلسے کی صدارت بزرگ افسانہ نگار نذیر احمد یوسفی نے انجام دیا نظامت کی ذمے داری امتیاز احمد انصاری نے نبھائی۔ شاذیہ نیازی نے تمام معاونین اور سرپرستوں کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز: وجیہ جمال، آسنسول، 20 جولائی 2025

ماہنامہ قرطاس

ناگپور: مہاراشٹر کے شہر ناگپور سے شائع ہونے والے معروف ادبی رسالے ماہنامہ قرطاس کے نئے شمارے کی رسم اجرا کے موقعے پر گلستان کالونی، جعفر نگر ناگپور میں 18 اگست 25 ایک تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ سابق ڈائرکٹر محکمۂ آثار قدیمہ ڈاکٹر غلام السیدین ربانی کی صدارت میں منعقدہ اس تقریب میں اردو کی ادیبہ اور سابق رکن مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی محترمہ ڈاکٹر کرن دھوڑ صاحبہ کے ہاتھوں اس شمارے کا اجرا عمل میں آیا۔ اس موقعے پر ماہنامہ قرطاس کی مجلس ادارت میں شامل انشائیہ نگار ڈاکٹر محمد اسد اللہ نے اس رسالے کے سابق مدیر محمد امین الدین صاحب کی حیات اور رسالے کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ برسوں پر محیط اپنی اشاعت سے اس رسالے نے ادبی دنیا میں اپنی شناخت قائم کی تھی، اس کی اشاعت کو برقرار رکھنے کی کوشش ایک نیک فال ہے۔

معروف ادیب و مترجم اور رسالے کی مجلس ادارت میں شامل رکن، ڈاکٹر اظہر حیات نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ماہنامہ قرطاس 1983 میں جاری ہوا تھا، گزشتہ برسوں کے دوران اس کے کئی اہم نمبر شائع ہوئے اور متعدد نئے اور پرانے قلم کاروں کو اپنی تخلیقات شائع کرنے کے مواقع دستیاب ہوئے۔

اس موقعے پر شہر ناگپور اور کامٹی کی کئی اہم شخصیات موجود تھیں۔ عبدالوحید نے رسم شکریہ ادا کیا۔

مرسلہ: کلیم احمد، رکن، مجلس ادارت، ماہنامہ قرطاس، ناگپور، 18 اگست 2025

شیش محل

لکھنؤ: ڈاکٹر افروز تاج کا شعری مجموعہ 'افروز تاج کا شیش محل' ایک ایسی کتاب ہے جس سے ان کی بے پناہ صلاحیتوں کے بارے میں معلوم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر افروز تاج گذشتہ چالیس سالوں سے امریکہ میں مقیم ہیں اور یونیورسٹی آف نارتھ کیرولائنا چیپل ہل میں پروفیسر ہیں۔ میری نیک خواہشات اس کتاب اور مصنف دونوں کے لیے پیش ہیں۔ مذکورہ خیالات کا اظہار شعری مجموعہ 'افروز تاج کا شیش محل' کی رسم اجرا کے موقعے پر اپنے صدارتی خطاب میں سبکدوش جج بی ڈی نقوی نے امریکن انسٹی ٹیوٹ آف انڈین اسٹڈیز، وزیر حسن روڈ میں کیا۔ کتاب کے مصنف ڈاکٹر افروز نقوی تاج نے کہا کہ میں گذشتہ چالیس سالوں سے امریکہ میں مقیم ہوں، مگر جو بات اپنے ملک کی مٹی میں ہے وہ کہیں اور نظر نہیں آتی، اپنی تازہ کتاب 'افروز تاج کا شیش محل' کا حوالہ دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ہم نے اس کتاب میں اپنے سارے تجربات اور مادر علمی اور اپنے گھر خاندان سے جو کچھ بھی اخذ کیا ہے

اس کو اس کتاب میں نچوڑنے کی کوشش کی ہے۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر احتشام خان نے کہا کہ ڈاکٹر افروز تاج کا زیادہ تر وقت ملک کے باہر گزرا، مگر یہ غریب الوطنی میں بھی اپنے ملک کی یادوں، روایتوں اور رسموں سے ذرا بھی دور نہیں ہوئے۔ نظامت معروف ادیب عاطف حنیف نے کی، اس موقعے پر مہمانِ ذی وقار ڈاکٹر ہما خواجہ پرنسپل کرامت حسین گرلس کالج نے کہا کہ ہمیں پورا یقین ہے کہ پڑھنے والوں کے لیے وہ ایک قیمتی اور مفید کتاب ثابت ہوگی اور طلبا و طالبات اچھا ادب پڑھ کر اچھا ادب تخلیق کرنے کی جستجو کریں گے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 13 اگست 2025

عصمت چغتائی کا افسانوی فن

رتناگری : ڈاکٹر محمد دانش غنی کی تصنیف 'عصمت چغتائی کا افسانوی فن' کی تقریب رونمائی گوگٹے جوگلےکر کالج کے زیرِ اہتمام ڈاکٹر جے ایس کیلکر سمینار ہال

میں انجام پذیر ہوئی۔ اس پرشکوہ تقریب کی صدارت کالج کے پرنسپل ڈاکٹر ایم آر ساکھلکر نے فرمائی اور کتاب کا اجرا بزمِ امدادیہ کھیڈ کے صدر جناب اے آر ڈی خطیب کے دستِ مبارک سے عمل میں آیا۔ مہمانان کی حیثیت سے جناب پرویز احمد (پی آر او، گرو نانک گروپس آف انسٹی ٹیوشن، ناگپور) اور پروفیسر بابر شریف (شعبۂ پینٹنگ، گورنمنٹ کالج آف آرٹس اینڈ ڈیزائن، ناگپور) نے رونق بخشی۔

کتاب کا اجرا کرتے ہوئے جناب اے آر ڈی خطیب نے کہا کہ محمد دانش غنی ایک نوجوان محقق اور نقاد ہیں جن کا مطالعہ اردو نظم ونثر میں عہد بہ عہد کی تبدیلیوں اور بدلتے ہوئے رجحانات پر بہت گہرا ہے۔

جناب پرویز احمد نے اپنے خطاب میں کہا کہ ڈاکٹر محمد دانش غنی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور حلقۂ اردو ادب میں ایک شناسا کردار ہیں۔ انھوں نے جس موضوع پر بھی خامہ فرسائی کی، اپنی بھرپور توجہ اور انہماک کا مظاہرہ کیا۔ 'عصمت چغتائی کا افسانوی فن' بھی دانش غنی کے فن پاروں میں سے ایک ہے جس میں انھوں نے عصمت چغتائی کے فن کا جائزہ عرق ریزی سے لیا ہے۔ گوگٹے جوگلےکر کالج کے پرنسپل ڈاکٹر پی پی کلکرنی نے صدارتی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں خوشی ہے کہ ڈاکٹر محمد دانش غنی کی نویں کتاب 'عصمت چغتائی کا افسانوی فن' کی رونمائی ہورہی ہے۔ اس کتاب کی اشاعت پر میں انھیں مبارکباد پیش کرتا ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ وہ یہیں رہ کر علمی و ادبی کام پورے انہماک سے کرتے رہیں۔ علاوہ ازیں پروفیسر محمد اسرار (شعبۂ اردو، پوروال کالج، کامٹی ضلع ناگپور) اور محترمہ سید نکہت جبیں (صدر شعبۂ اردو، معین الدین برہان حارث کالج آف آرٹس، نالاسوپارہ، ضلع پالگھر) نے بھی کتاب اور صاحبِ کتاب پر اظہارِ خیال کیا۔ اس موقعے پر کالج کے مختلف شعبے کے اساتذہ اور طلبا و طالبات کے علاوہ کوکن اور بیرونِ کوکن سے آئے ہوئے ادب نواز حضرات شریک تھے۔

پریس ریلیز: دانش غنی، رتناگری، 30 اگست 2025

ڈاکٹر محمد پرویز کے نام پچاس خطوط

بھاگلپور: 17 اگست 2025 انجمن باغ و بہار، برہ پورہ،

بھاگلپور کے زیر اہتمام محمد شاداب عالم کی رہائش گاہ پر شاعر جوشؔ ایاغ کی صدارت میں اردو کے نامور ادیب وشاعر بال ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ نذیر فتح پوری کی کتاب ڈاکٹر محمد پرویز کے نام پچاس خطوط کا رسم اجرا انجمن کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر محمد پرویز، جوشؔ ایاغ، محمد شاداب عالم، ڈاکٹر نیر حسن، ڈاکٹر حبیب مرشد خان مہمان خصوصی صدر شعبہ اردو مونگیر یونیورسٹی کے پروفیسر شاہد جمال رزمی، سید شبیر احمد جعفری، فیض رحمٰن، مظہر مجاہدی، ڈاکٹر ارشد رضا، محمد تاج الدین، قمر تاباں، محمد سہیم الدین، انیس نظمی وغیرہ کے ہاتھوں ہوا۔ اس موقعے پر انجمن کے جوائنٹ سکریٹری محمد شاداب عالم نے کہا کہ ڈاکٹر محمد پرویز انجمن باغ و بہار کے جنرل سکریٹری کے ساتھ ساتھ ایک اچھے ادیب بھی ہیں۔ ان کی اب تک گیارہ کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ نذیر فتح پوری دور جدید کے بڑے فنکار ہیں۔ انھوں نے ڈاکٹر محمد پرویز کے نام پچاس خطوط تحریر کیے ہیں جو آج کے دور میں بڑی بات ہے۔ اس پروگرام کے مہمان خصوصی پروفیسر شاہد جمال رزمی نے اردو خطوط کی اہمیت وافادیت پر گفتگو کی۔ انھوں نے مرزا غالب کے خطوط کا مجموعہ عودِ ہندی، اردوئے معلی، ابوالکلام آزاد کی غبارِ خاطر، علامہ اقبال کی مکاتیب اقبال، فراق گورکھپوری کی من آنم، فیض احمد فیض، سجاد ظہیر وغیرہ کے خطوط کا ذکر کر کے خطوط کی ادبی حیثیت بتائی۔ ڈاکٹر حبیب مرشد خاں نے کہا کہ کتاب کا انتساب دیکھ کر دل بہت خوش ہوا کہ انھوں نے پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی مرحوم اور پروفیسر قمر جہاں کے نام سے کیا ہے۔ جوشؔ ایاغ نے کہا کہ نذیر فتح پوری کو میں جانتا ہوں، پہچانتا ہوں۔ ڈاکٹر محمد پرویز کے نام پچاس خطوط لکھ کر انھوں نے ایک اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ مظہر مجاہدی، انیس نظمی، قمر تاباں، سید نیر حسن، محمد سہیم الدین، محمد تاج الدین نے کتاب کے حوالے سے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پروگرام کی نظامت فیض رحمٰن نے کی۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر محمد پرویز، بھاگلپور، 3 ستمبر 2025

نوائے فخر

شمالی آسنسول کی معروف تنظیم بزم نسا کی جانب سے خاتون فکشن نگار و شاعرہ طلعت انجم فخر کا اولین شعری مجموعہ نوائے فخر کا اجرا عمل میں آیا۔ تقریب کی

صدارت کولکاتہ سے تشریف لائے صاحب دیوان شاعر حلیم صابر نے کی، جب کہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر شمشیر عالم، اسسٹنٹ پروفیسر نے انجام دیا۔ افتتاحی کلمات رانی گنج گرلس کالج کے شعبۂ اردو کے سربراہ ڈاکٹر فاروق اعظم نے ادا کرتے ہوئے طلعت انجم فخر کو مطالعہ کرتے رہنے کی تلقین کی۔ بزرگ شاعر اور صحافی احسان ثاقب نے اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے آسنسول میں نسائی ادب کا مستقبل تابناک قرار دیا۔

مولانا آزاد کالج کلکتہ کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر عاصم شاہنواز شبلی نے اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے طلعت انجم فخر کو مبارکباد پیش کی اور معراج احمد معراج اور ڈاکٹر عشرت بیتاب کے ذریعے نئی نسل کی آبیاری کرنے پر انھیں بھی مبارکباد پیش کیا اور کہا کہ اس کے ذریعے اردو ادب کا مستقبل آسنسول میں نہایت ہی امید افزا دکھائی دیتا ہے۔ بزم نثار کلکتہ کے نمائندہ اشرف احمد جعفری نے بھی اپنی نیک خواہشات پیش کیں۔ صدر جلسہ حلیم صابر نے طلعت انجم فخر کی اولین کوشش کی ستائش کی اور کہا کہ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے تاکہ ان کے اندر کچھ کر گزرنے کا جذبہ پیدا ہو۔ انھوں نے مزید کہا کہ موجودہ دور میں طباعت اور کتابت کی سہولت سے آسانی سے کتابیں عالم وجود میں آرہی ہیں، پہلے زمانے میں یہ سہولت میسر نہیں تھیں، اس لیے بڑے بڑے شعرا و ادبا کی کتابیں اس وقت نہیں آسکیں۔ ڈاکٹر عشرت بیتاب نے شکریے کی رسم ادا کی۔

پریس ریلیز: وجیہ جمال، آسنسول، 13 جولائی 2025

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا رکی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

240 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر.................................... بتاریخ.................................... بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرتعاون سالانہ -/240 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

دستخط

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.: magazines@ncpul.in

سہ روزہ قومی سمینار، پٹنہ کی تصویری جھلکیاں

उर्दू दुनिया, मासिक, अक्तूबर–2025, वर्ष:27, अंक:10
URDU DUNIYA Monthly, October-2025, Vol.27, Issue:10
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2023-25
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:**24/09/2025**
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month
Total Pages:100

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326 A/C: ، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail : sales@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

Printed and Published by Dr. Md Shams Equbal, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at Salasar Imaging Systems, A-97, Sector-58 Noida-201301(UP)
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025
LPC DELHI,DELHI PSO,DELHI RMS,DELHI-6